تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی: اردو میں چینی ادبی تراجم کا تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

اعجاز رازق

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۵ء

تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی: اردو میں چینی ادبی تراجم کا تنقیدی جائزہ

مقالہ نگار:

اعجاز رازق

یہ مقالہ

پی ایچ ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز،

شعبہ اردو زبان و ادب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۵ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو ئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی: اردو میں چینی ادبی تراجم کا تنقیدی جائزہ**

پیش کار: اعجاز رازق

رجسٹریشن نمبر: 27/Phd/Urd/F21

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر صائمہ نذیر: ________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: ________________

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی ہلالِ امتیاز ملٹری (ر): ________________

ریکٹر

تاریخ: ________________

اقرار نامہ

میں، اعجاز رازق حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

اعجاز رازق

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

۲۰۲۵ء

فہرستِ ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہارِ تشکر	x
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
۱۔ موضوع کا تعارف	۱
۲۔ بیانِ مسئلہ	۲
۳۔ مقاصدِ تحقیق	۳
۴۔ تحقیقی سوالات	۴
۵۔ نظری دائرہ کار	۴
۶۔ تحقیقی طریقہء کار	۵
۷۔ موضوع پر ما قبل تحقیق	۶
۸۔ تحدید	۷
۹۔ پس منظری مطالعہ	۸
۱۰۔ تحقیق کی اہمیت	۹
ب۔ اردو زبان میں چینی ادبی تراجم کی روایت	۱۰
ج۔ ترجمہ نگاری اور تہذیبی و ثقافتی اشتراک	۴۴

حوالہ جات ۵۶
باب دوم: پاک چین باہمی تعلقات: پس منظر اور پیش منظر ۶۰
الف۔ عہدِ قدیم میں چین اور پاک و ہند کے باہمی تعلقات ۶۰
(بدھ مت افکار کی پذیرائی اور شاہراہ ریشم)
ب۔ اردو اور چینی زبان میں باہمی اشتراک کی صورت حال ۷۵
ج۔ جدید چین اور پاکستان کے مابین وسیع الابنیاد سفارتی، سیاسی اور دفاعی تعلقات ۸۱
د۔ پاک چین اقتصادی راہ داری منصوبہ اور باہمی تجارتی شراکت داری ۹۰
حوالہ جات ۹۵
باب سوم: چینی نثری تراجم میں تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی ۹۷
الف۔ ناول ۹۹
ب۔ لوک ادب ۱۱۵
ج۔ افسانہ ۱۴۱
د۔ سفر نامہ ۱۵۱
ح۔ آپ بیتی ۱۵۵
و۔ ادبِ اطفال ۱۵۹
ز۔ ڈرامہ ۱۶۳
ہ۔ سائنس فکشن ۱۶۶
حوالہ جات ۱۷۲
باب چہارم: چینی شعری تراجم میں تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی ۱۷۶
الف۔ "چینی نظمیں" از ابنِ انشاء ۱۸۲
ب۔ "گلبانگِ وفا" از انتخاب عالم ۲۰۲

ج۔ "غم کے محاذ پر" از ڈاکٹر عابد سیال ۲۱۰
د۔ "نظمیں، خطاطی اور محبت، پاکستان کے لیے" از یوان وے شوئے ۲۲۶
ہ۔ "۱۰۱ چینی نظمیں" از ڈاکٹر صفدر علی شاہ ۲۳۸
حوالہ جات ۲۵۹
باب پنجم: ماحصل ۲۶۴
الف۔ مجموعی جائزہ ۲۶۴
ب۔ تحقیقی نتائج ۲۷۶
ج۔ سفارشات ۲۷۸
کتابیات ۲۷۹

ABSTRACT

Title: A critical analysis of Chinese literary translations in Urdu: In light of Intercultural Harmony and Dialogue among Civilizations

The topic of this Ph. D Research thesis is critical analysis of Chinese literary translations. The main theory for understanding of this topic is Dialogue among civilizations and intercultural harmony. In the first chapter, the introduction of theory and tradition of Chinese literary translations are discussed. Civilizations interact with each other, in many ways. Translation is considered as a brigde between the two languages and as well as two different civilizations. There are reasonable Chinese literary translations in Urdu, which include almost all types of literary writings, like, novel, drama, fiction, short stories, travellage, autobiography, portery and folk literature, as well. The Urdu translations of Chinese literature highlight the history, culture, society and traditions of Chinese civilazztion.

In the second chapter, Pak-China relations are discussed. In 1951, the two nations tie their diplomatic relations with each other. Soon, these relations turns into friendship. China is cooperating with Pakistan in energy, agriculture, finance, defence, science and technology, infrastructure development and war against terrorism. China Pakistan Economic Corridor (CPEC) is the most significant and unique project, which will bring economic development and stabitity in both countries.

There is a great demand of learning Urdu and Chinese languages in CPEC context. Teaching of Urdu in Chinese Universities and teaching of Chinese in Pakistani universities, bring closer the people of two countries. The literary thanslations are creating the better understandings of each others culture.

Chines literary translations of prose included novel, drama, fiction, travelogue, folk, children literature and science fiction, which provide an opportunity of dialogue between two civilizations and promote intercultural harmony. The translations of Chinese prose are providing the source of understanding the unique taste of feelings and word outlook of Chinses writers.

The translations of Chinese poetry are the best craftsmanship of poetic compositions and use of imagery. It included Chang Si Shuan (Intikhab Alam) and Yuan Ya Shuay, the two Chinese poets, who translated their Chinese poetry into Urdu, themselves. The translation of historic Chinese poet Qu Yuan's famous poem "Li Sao" by Dr. Abid Sail, depicts the unconditional love of a person, for his homeland. Dr. Safdar Ali Shah's translation of "101 Chinese Poems" highlight the simplicity and purity of emotions, in historic Tang Dynasty period's poetry. Infact, Urdu translations of Chinese literature are providing an opportunity of understanding the literal and knowledge capital of a upcoming super power. This colud be helpful for our country to move ahead in literarure.

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل پر میں سب سے پہلے تہہ دل سے اللہ تعالی کے حضور کلمہ ءشکر ادا کرتا ہوں کہ جس کی توفیق و عنایت کے بغیر پی ایچ ڈی کے کٹھن سفر کو منزل تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔لاریب ھذا من فضل ربی۔ میں اسے پروردگارِ عالم کا بے انتہا کرم اور عنایت سمجھتا ہوں کہ میرے اساتذہ اور احباب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کی جانب متوجہ کیا اور پی ایچ ڈی کی تکمیل میں معاونت کی۔ خداوند قدوس کا کروڑہا احسان ہے کہ فقیر کو اپنے خانوادے کی علمی روایت کو آگے بڑھانے کی توفیق ودیعت ہوئی۔

ماخذات کی تلاش کے دوران بہت سے مواقع پر مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، مگر نگرانِ مقالہ ڈاکٹر صائمہ نذیر کی مسلسل رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے ہمت کو جواں رکھا۔پروردگارِ عالم ان کے علم و فضل میں مزید برکتیں عطا فرما کر اقبال بلند تر فرمائے! آمین سال ہا سال سے چینی و پاکستانی سماج، تہذیب اور ادب پر تنقیدی نگاہ رکھنے والی شخصیات میں شعبہ اردو، بیجنگ یونیورسٹی، عوامی جمہوریہ چین سے وابستہ Dr. Zhou Yuan نے بر خط اور نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (نسٹ) میں قائم چائنا کلچر اینڈ کمیونیکیشن سنٹر کی ڈائریکٹر Dr. Xiang Yang (Scarlet) نے بالمشافہ موضوع کے حوالے سے میری رہنمائی فرما کر ممنون کیا۔خانہ فرہنگ ہائے ایران، راولپنڈی اور ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد کی جانب سے سابقہ ایرانی صدر سید محمد خاتمی کی تہذیبی مکالمے پر لکھی کتاب "دنیائے شہر تا شہر دنیا" کے اردو نسخے سمیت مجلہ "پیغام آشنا"،اسلام آباد کے اہم شمارے عنایت کیے گئے، جس پر میں دونوں اداروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد کے شعبہ پاکستانی زبانیں سے وابستہ ڈاکٹر عابد حسین سیال کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے مجھے نا صرف اہم کتب فراہم کیں بلکہ موضوع کے بارے میں مفید مشوروں سے بھی نوازا۔فاضل اساتذہ میں صدرِ شعبہ ڈاکٹر عنبرین شاکر جان تبسم،ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر صنوبر الطاف، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفق انجم اور ڈاکٹر محمود الحسن رانا سمیت جملہ اساتذہ کرام نے دورانِ تحقیق درپیش مشکلات سے نمٹنے کا ہنر سکھایا۔ڈاکٹر صفدر علی شاہ اور ڈاکٹر عبد الواحد تونسوی نے بالترتیب چینی شاعری اور سماج پر لکھی گئی اپنی کتب تحفتاً" عطا فرما کر ماخذات تک رسائی میں مدد فرمائی۔ مخدومہ امیر جان لائبریری، نڑالی، گوجر خان کے بانی اور علمی و ادبی شخصیت حسن نواز شاہ صاحب کا بھی میں دلی طور پر مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے میرے موضوع سے متعلق اہم ماخذات کی نشان دہی فرمائی۔ پی ایچ ڈی اسکالرز میں محترمہ مبین عنایت، محمد ادریس چیمہ ، محمد

رضا ربانی، محمد توصیف، محمد مدثر، کاشف نواز سہرانی اور محمد ارشد کے مفید مشوروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بالخصوص ڈاکٹر محمد اعظم کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے تکنیکی امور پر میری بھرپور معاونت کی۔

اس اہم موقع پر میں اپنے دیرینہ اور عزیز دوست ڈاکٹر عاطف افتخار کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہوں گا کہ جن کی دور اندیش اور باریک بین نگاہ نے میری اردو زبان میں دلچسپی کو دیکھ کر مجھے اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ اپنے رفقاء کار میں محمد انعام الحق جنجوعہ، قمر فاروق مصطفائی، عبدالنعیم منہاس، راجا عبدالشکور، محمد احمد، محمد اویس جنجوعہ اور قابلِ صد احترام خواتین اساتذہ نے پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی میں بھرپور تعاون کیا۔ واہ کینٹ کی علمی و ادبی شخصیت ڈاکٹر شاہد ایم شاہد کی پُر خلوص دعائیں اور نیک خواہشات ہمہ وقت میرے ہمراہ رہیں۔

تحقیقی عمل بلاشبہ ایک طویل اور کٹھن سفر تھا تاہم میری شریکِ حیات کا پر خلوص تعاون میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ اپنی پیشہ وارانہ تدریسی مصروفیات اور ہماری معصوم بیٹیوں کی دیکھ بھال کے باوجود انہوں نے ہر ممکن حد تک میری ضروریات کا خیال رکھا، جس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ مرحوم قبلہ والد گرامی ملک رازق داد کی شفقت اور دعائیں اس موقع پر رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور قبلہ والدہ محترمہ کو لمبی عمر بالخیر عطا فرمائے! آمین۔ اہلِ خانہ میں برادرِ اکبر حاجی شاہد محمود ملک اور ان کی اہلیہ محترمہ کی بے لوث مدد میرے لیے سرمایہء حیات ہے۔ خواہرِ نسبتی اور بھتیجیوں امیرہ، عبیرہ، عیشل اور دعا نور کی نیک تمنائیں میری اس کامیابی میں ہمراہ ہیں۔ دختران سمعیہ اعجاز، مریم اعجاز، بشریٰ اعوان اور میمونہ بتول کا ساتھ میرے لیے ذہنی طور پر پُر سکون رہنے کا ذریعہ بنا۔ کورس ورک کے دوران برادر ملک کامران رازق کی ناگہانی وفات کے بعد پیدا ہونے والے نامساعد حالات نے بارہا تحقیقی عمل کو موقوف کرنے پر مجبور کیا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آگے بڑھنے کا راستہ صاف ہونے لگا۔ یوں اس امر پر ایمان حد درجہ پختہ ہوا کہ مالک الملک کسی نفس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

آخر میں ایک بار پھر میں شعبہء اردو زبان و ادب، نمل کے تمام اساتذہ کرام اور بالخصوص صدرِ شعبہ ڈاکٹر عنبرین شاکر جان تبسم، اپنی نگرانِ مقالہ ڈاکٹر صائمہ نذیر کا دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں میری بھرپور سرپرستی فرما کر بے پناہ شفقت فرمائی۔

خاکسار اعجاز رازق اعوان

موہڑہ روشن علی، کلیام اعوان، گوجر خان

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

(الف) تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف (INTRODUCTION)

ترجمہ بنیادی طور پر دو تہذیبوں کے مابین ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیبوں کے مابین باہم رابطے کے لیے سب سے بنیادی چیز ترجمہ ہی ہے۔ اردو ادب میں تراجم کی روایت بہت معتبر اور توانا ہے۔ عالمی زبانوں سے علمی، ادبی، سائنسی اور فنون پر مبنی مواد کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں انفرادی اور ادارہ جاتی، ہر دو سطح پر تواتر سے کام کیا جاتا رہا ہے۔ اس عمل سے ایک جانب جہاں ترجمہ شدہ زبان میں موجود علم و دانش، اردو دان طبقے تک پہنچ رہی ہے، وہیں متعلقہ زبان کی حامل تہذیب اور ثقافت کو جاننے کا سنہری موقع بھی میسر آرہا ہے۔ چناں چہ اسی پس منظر میں چینی زبان کے ادبی شاہکاروں کو بھی اردو زبان میں منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ چینی تراجم کی روایت نہ صرف چینی ادب کی فنی و اسلوبیاتی سطح سے آگاہی دیتی ہے بلکہ اِن کی بدولت چینی سماج میں موجود مختلف تہذیبی عناصر بھی واضح ہوتے ہیں۔ اس طرح دو مختلف زبانیں بولنے والوں کو ایک دوسرے کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو سمجھنے کا موقع مل رہا ہے۔ بین الثقافتی ہم آہنگی کے تناظر میں تہذیبوں کے مابین تصادم کی بحث کے مقابلے پر تہذیبوں کے مابین مکالمے کی فضا اسی پس منظر میں پروان چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں عالمی سطح پر سیاسی افق پر ایسی دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں جو نا صرف ترقی یافتہ اقوام پر اثر انداز ہوئیں، وہیں ترقی پذیر اور پس ماندہ اقوام بھی ان کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ قومی و بین الاقوامی سطح پر جہاں متحارب اقوام اور ریاستوں کے مابین شدید تناؤ کی کیفیات پیدا ہوئیں، وہیں ٹکراؤ کی یہ شدت تہذیبوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے آئی۔ کرّہِ ارض طاقت کے دو مراکز کے مابین جاری سرد جنگ کے اختتام کے بعد "یونی پولر" سیاسی شیرازہ بندی سے دوچار ہو چکی تھی۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن Samuel Phillips Huntington کی جانب سے پیش کردہ "تہذیبوں کے مابین تصادم" پر مبنی مفروضے

نے، ایسے ماحول میں طاقت کے ایوانوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہر نیویارک میں ۹/۱۱ کے واقعے نے اس مفروضے کو کسی قدر مہمیز دی۔ یوں پوری دنیا میں تہذیبی تصادم کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا محاذ گرم کر دیا گیا۔ دو دہائیوں سے زائد عرصے تک جاری رہنے والی اس جنگ نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ ادبیات پر بھی اس کا بہت گہرا اثر مرتب ہوا اور تخلیق کاروں نے اپنے ادب پاروں میں عہدِ رواں کی مجموعی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی کی۔ اس پس منظر میں متبادل بیانیئے کے طور پر "تہذیبی مکالمے" کا تصور سنجیدہ علمی و تحقیقی حلقوں میں زیرِ بحث رہا۔ یوں باہمی مسائل کے پائیدار حل کے لئے، بین الثقافتی ہم آہنگی کو بنیاد بناتے ہوئے مناظرے و مجادلے کے بجائے مکالمے کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا رہا۔

زیرِ نظر موضوعِ تحقیق میں بین الثقافتی ہم آہنگی اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھ کر، منتخب چینی ادبی تراجم کا اس تناظر میں تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے ان سے دو مختلف زبانوں کو بولنے والے افراد اور تہذیبوں کے مابین کس طرح مکالمے کی فضا قائم ہو رہی ہے۔ مزید یہ کہ ترجمہ شدہ مواد سے بین الثقافتی ہم آہنگی کو کیوں کر ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ (Statement of Problem/THESIS STATEMENT)

چینی تہذیب اپنی زبان کی مانند دنیا کی چند قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ چینی ادب اپنی تہذیب اور اس میں موجود اہم تہذیبی عناصر کو واضح کرنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ دورِ حاضر میں عوامی جمہوریہ چین کی بڑھتی ہوئی معاشی و اقتصادی ترقی اس اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ دہائیوں پر محیط دونوں ممالک کے لازوال دوستانہ تعلقات اور حالیہ پیش رفت پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ ہر دو ممالک کی عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو زبان میں چینی ادب کے تراجم اپنے مخصوص ثقافتی تنوع کے اظہار کے ساتھ ساتھ تہذیبی مکالمے کے ماحول کو پیدا کرنے میں مدد و معاون ہیں۔ اس پس منظر میں یہ جاننا ضروری ہے کہ کس انداز میں چینی ادب کے تراجم بین الثقافتی ہم آہنگی کی فضاء کو قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ "تہذیبوں کے مابین تصادم"

کے تباہ کن نظریے کے بجائے "تہذیبوں کے مابین مکالمے" کا انسان دوست نظریہ، چینی ترجمہ شدہ مواد میں کن صورتوں میں جلوہ گر ہے۔

معاصر سماج ذرائع ابلاغ کی نت نئی ایجادات کے باعث ایک عالمی گاؤں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ایسے میں ہر قوم اپنی تہذیبی شناخت کے فروغ اور نئی نسل کو اس ورثے کی منتقلی کے حوالے سے ایک سنگین چیلنج سے دوچار ہے۔ آج کا عوامی جمہوریہ چین ایک قدیم اور شان دار تہذیب کا امین ہے۔ شاہراہِ ریشم کی بدولت دو خطوں کے مابین صدیوں پرانے تجارتی تعلقات کا احیاء موجودہ پاک چین اقتصادی راہداری منصوبے سے بطریق احسن ہو رہا ہے۔ تاجر برادری کو باہم سہولت فراہم کرنے اور معیشت کو استحکام دینے کی غرض سے باہمی تجارت کو مقامی کرنسی میں ممکن بنانے میں دونوں ممالک کی حکومتیں متفق ہیں۔ سفارتی سطح پر بھی پاکستان اور چین کا بین الاقوامی امور پر یکساں موقف دونوں اقوام کے مابین گہرے، دوستانہ اور بہترین تعلقات کا آئینہ دار ہے۔ مختلف اوقات میں وطنِ عزیز کو درپیش قدرتی آفات کے ساتھ ساتھ اقتصادی مشکلات میں چینی عوام اور حکومت کا بے غرض تعاون اظہر من الشمس ہے۔ دونوں ممالک میں چینی اور اردو زبان کی معیاری تدریس دونوں حکومتوں کی اہم ترجیحات میں شامل ہے۔

چینی ادب اور زبان اپنی قدیم اور دیرینہ روایت کے باعث کسی بھی طور عظیم ادب سے کم تر نہیں ہے۔ اردو زبان میں چینی ادب کا ایک نمایاں حصہ ترجمہ ہو چکا ہے۔ تاہم اس پر ہنوز تحقیقی نقطۂ نگاہ سے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین ہم آہنگی اور مکالمے کے نظریئے کے پیشِ نظر ان ادبی تراجم کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

۳۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

زیرِ نظر تحقیق میں مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

1. چینی ادب کے اردو میں تراجم کی روایت کا جائزہ۔
2. چینی ادب کے نثری اور منظوم تراجم کی نوعیت کا مطالعہ۔
3. چینی ادبی تراجم میں تہذیبوں کے مابین مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کا تجزیہ۔

۴۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں درج ذیل سوالات کو پیش نظر رکھ کر تحقیق کی گئی ہے۔

۱۔ اردو میں چینی ادب کے تراجم کی کیا روایت ہے؟

۲۔ چینی ادب کے نثری اور منظوم تراجم کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ پاک چین دوستانہ تعلقات کے تناظر میں ادبی تراجم کی کیا اہمیت ہے؟

۴۔ چینی ادب کے اردو تراجم کیسے تہذیبی مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کی فضا کو قائم کر رہے ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

زیرِ نظر تحقیقی موضوع چینی ادب کے اردو تراجم کو تہذیبی مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے پس منظر میں سمجھنے کے لیے جس نظری دائرہ کار کو پیشِ نظر رکھا گیا، اس میں بنیادی تصور "تہذیبوں کے مابین مکالمہ" اور "بین الثقافتی ہم آہنگی" ہے۔ رواں صدی عیسوی کی ابتدائی دو دہائیوں میں تیزی سے بدلتے ہوئے قومی اور عالمی منظر نامے میں برق رفتار تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سب سے اہم ترین واقعہ ۹/۱۱ کا ہے۔ جس نے دہشت گردی کے نام پر دنیا کے بیشتر حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس صورتِ حال میں سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel Phillips Huntington) کا پیش کردہ تہذیبوں کے مابین تصادم کا نظریہ سفارتی و سیاسی حلقوں میں موضوعِ بحث بنا رہا۔ جس میں آئندہ عالمی سیاسی و سماجی تشکیل کے ضمن میں مفاداتی ٹکراؤ کے لئے کسی اور بنیاد کے بجائے تہذیبوں کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ تاہم اس کے برخلاف تہذیبی مکالمے اور ثقافتوں کے مابین ہم آہنگی کے انسان دوست نظریئے نے مختلف تہذیبوں کے حاملین کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ اسی تصور کی روشنی میں اس بات کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے گا کہ اردو زبان میں چینی زبان کا ترجمہ شدہ ادب کس طرح دونوں اقوام کے درمیان دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کو تقویت فراہم کر سکتا ہے۔

تہذیبی مکالمے کا نظریہ اپنی اصل کے اعتبار سے کسی ردِ عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بین الثقافتی ہم آہنگی پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے پیش گزاروں میں جن شخصیات کا نام لیا جاتا ہے، اُن میں اسلامی جمہوریہ ایران کے سابق صدرِ مملکت سیّد محمد خاتمی سرِ فہرست ہیں۔ تاہم تہذیبوں کے مابین مکالمے کے لفظ کو سب سے پہلے

آسٹریا کے ایک مفکر ہینس کوچرو (Hans Kochler) نے ۱۹۷۲ء میں استعمال کیا۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو کو ایک خط لکھ کر مختلف تہذیبوں کے مابین مذاکرے کی ضرورت پر زور دیا۔ جسے جمہوریہ سینیگال کے صدرِ مملکت لیوپولڈ سیڈر (Leopold Sedar Segnhor) نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کروا کر ممکن بنایا۔ ۴ نومبر ۱۹۹۸ء کو اقوامِ متحدہ نے سال ۲۰۰۱ء کو عالمی سطح پر تہذیبوں کے مابین مکالمے کے سال کے طور پر منانے کا باضابطہ اعلان کیا۔ تاہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دہشت گردی کے واقعے کے بعد دنیا میں ہر طرف خوف وہراس کی فضا پیدا ہو گئی۔ اسی ماحول میں تہذیبوں کے مابین تصادم کے نظریئے نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ مغربی دنیا میں امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے پیش کردہ بیانئے کو بنیاد بنا کر ایک ایسا ماحول قائم کر دیا گیا جس میں جنگ اور طاقت کے استعمال کو ہر مسئلے کا حل قرار دیا گیا۔ ایسے میں سفارتی اور سیاسی حلقوں سے تہذیبوں کے مابین مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

تہذیبوں کے مابین مکالمہ دراصل ہر تہذیب کے وجود کے احترام اور برابری کی بنیاد پر ان کے مابین اشتراکِ عمل پر زور دیتا ہے۔ کسی خاص تہذیب کی اجارہ داری یا برتری کے برخلاف اس میں ہر تہذیب کو یکساں طور پر اپنی بقاء کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ادبیات میں ترجمہ نگاری بنیادی طور پر دو تہذیبوں کے مابین، مکالمے اور ہم آہنگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ اردو زبان میں چینی ادبی تراجم کی روایت اس اعتبار سے بہت موثر اور بھرپور ہے۔ نظم و نثر میں جو تراجم اب تک سامنے آئے ہیں ان سے چینی تہذیب کے پوشیدہ گوشوں اور پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔ سو اس ضمن میں ان تراجم کا تہذیبوں کے مابین مکالمے اور ہم آہنگی کے تناظر میں تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

زیرِ نظر موضوعِ تحقیق بنیادی طور پر ایک ہمہ جہت موضوع ہے۔ اس میں جہاں چینی زبان کے اردو تراجم کو پیشِ نظر رکھا جائے گا وہیں تہذیبی مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے حوالے سے بھی دستیاب کتب اور مضامین کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس پس منظر میں زیرِ نظر موضوع کو دستاویزی طریقہ تحقیق کی روشنی میں ہی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ جس میں بنیادی اور ثانوی مآخذات سے استفادہ کیا گیا۔ جن میں چینی ادب کی

اردو میں ترجمہ کتب اور اس سے متعلق چھپنے والے مضامین اور مختلف رسائل کا مطالعہ شامل ہے۔ جن تک رسائی کے لیے کتب خانوں سے رجوع کرنے کے علاوہ چینی سفارت خانے میں قائم کلچرل سٹڈی سنٹر، انٹرنیٹ اور دیگر مآخذات سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا۔

۷۔زیرِ نظر موضوع پر ما قبل تحقیق (WORKS ALLREADY DONE)

اردو ادب کے بیشتر ادباء کی تخلیقات کے ضمن میں تہذیبی عناصر کی پیش کش کے حوالے سے مختلف مقالے لکھے جا چکے ہیں تاہم ان میں چینی معاشرت ، تہذیبی مکالے و ثقافتی ہم آہنگی کے حوالے سے ہنوز تحقیق طلب ہے۔۲۰۱۷ء میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور سے "اردو سفر ناموں میں چینی تہذیب و ثقافت کے عناصر" کے عنوان سے حافظ محمد نصیر نے ایم فل کی سطح کا مقالہ تحریر کیا۔ کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے زیرِ انتظام ڈاکٹر عبد الواحد تونسوی اور پروفیسر ڈاکٹر چانگ وے کی ترتیب کردہ کتاب "چین شناسی" میں چینی معاشرت کو سمجھنے کے لیے اہم معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ "چین: از چیر مین ماؤ تا غربت مکاؤ" بھی اس اعتبار سے اہم ترین کتاب ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین سیال کے ریسرچ آرٹیکل بعنوان: چینی ادب کے اردو تراجم: تہذیبی مکالے کی ایک صورت" اس اعتبار سے اہم دستاویز ہے جس میں زیرِ تحقیق موضوع کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی آف بیدجی، الجیریا کے شعبہ انگریزی ادب کے پروفیسر موہنا میلم کے تحقیقی مقالے

1- The role of translation in the dialogue of Civilization: West/Islamic worldcontexts-and-perspectives

2-Dialogue Among Civilizations: Contexts and Perspectives

Seyed Mohammad Khatami

(https://www.un.org/en/chronicle/article/dialogue-among-civilizations)

3-Parliament of Malaysia |Research Unit/HA: Dialogue of Civilizations

https://www.parlimen.gov.my/images/webuser/artikel/ro/halisah/Dialogue%20of%20civilizations%20Halisah%20Ashari.pdf

کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

۸۔ تحدید (DELIMITATION)

زیرِ نظر تحقیق میں چینی ادب کے جن اردو تراجم کا تحلیل و تجزیہ کیا گیا ان کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ ۱۰۱ چینی نظمیں، صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۴ء

۲۔ پاگل آدمی کی ڈائری (چینی کہانیاں)، لوشون،، مترجم خالد فتح محمد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء

۳۔ چینی نظمیں، ابن انشاء، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۰ء

۴۔ چینی لوک کہانیاں، شفیع عقیل، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۷۵ء

۵۔ داور قبیلے کے قصے، (چینی لوک کہانیاں) شمیم اکرام الحق، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۹ء

۶۔ سورج نکل رہا ہے، (ڈرامہ) از چھاؤیونی، مترجم احفاظ الرحمن، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء

۷۔ معاصر چینی افسانے، منیر فیاض، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

۸۔ فاہیان کا سفر نامہ ہند، یاسر جواد، تخلیقات لاہور، ۲۰۲۲ء

۹۔ ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند، یاسر جواد، تخلیقات، لاہور، ۲۰۲۲ء

۱۰۔ شہنشاہ سے شہری تک، چین کے آخری شہنشاہ کی آپ بیتی، مترجم حامد ہاشمی، مطبوعہ عوامی جمہوریہ چین، ۱۹۸۰ء

۱۱۔ چین میں سائنس فکشن (تعارف اور تراجم) ڈاکٹر عابد سیال، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۲۰۱۸ء

۱۲۔ غم کے محاذ پر، چھویو آن، ترجمہ ڈاکٹر عابد سیال، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء

۱۳۔ نظمیں، خطاطی اور محبت -پاکستان کے لیے، یوان وئے شوئے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

۱۴۔ ایہہ کیو کی سچی کہانیاں، لوشیون، مترجم رشید بٹ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

۱۵۔ تین سلطنتوں کی داستان، لوگوان چھونگ، مترجم ظہور احمد، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء

۱۶-گلبانگِ وفا، انتخاب عالم، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

اس کے علاوہ موضوع سے متعلقہ دیگر مضامین اور کتب پس منظری مطالعہ کے طور پر تو پیشِ نظر رہیں، تاہم اس مقالے کا حصہ نہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

پس منظری مطالعہ کے طور پر تہذیبی مکالمے اور چینی تہذیب و ادب کے موضوع پر لکھی گئی انگریزی وار دو کتب، مقالات، تبصروں اور تجزیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب "چین شناسی" کو معاصر صورتِ حال جاننے کے حوالے سے پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے شائع کردہ کتب چین کا ادب (قدیم و جدید فکشن سے انتخاب) اور چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب) کو دیکھا گیا ہے۔ عوامی جمہوریہ چین کے صدر شی چن پنگ کی کتاب "چین کی طرزِ حکمرانی" اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں ان کی ایک تقریر میں تہذیبی مکالمے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم کی رپورتاژ پر مبنی تصنیف "سنکیانگ نامہ" اس اعتبار سے ایک اہم ترین دستاویز ہے کہ جس میں چین کو درپیش داخلی چیلنجز کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۷ء میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور سے "اردو سفر ناموں میں چینی تہذیب و ثقافت کے عناصر" کے عنوان سے حافظ محمد نصیر نے ایم فل کی سطح کا مقالہ تحریر کیا۔ اس مقالے کی بدولت بھی چینی تہذیب اور سماج کے بارے میں مفید معلومات میسر آئیں ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند بھی ایک اہم تاریخی دستاویز ہے، جس میں برعظیم پاک و ہند کے مختلف علاقوں کے بارے میں ایک چینی شخص کے تاثرات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ چینی نژاد اردو شاعر چانگ شی شوان المعروف انتخاب عالم کے اردو شعری مجموعے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ پنجابی زبان میں مترجمہ قیصرہ علوی کی کتاب "جادو داچاقو" میں چینی لوک کہاوتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ پنجابی زبان میں محمد آصف خان کی کتاب "پیار داپندھ" بھی اس اعتبار سے مفید ہے کہ اس میں چینی لکھاریوں کی نظر میں پاکستان سے متعلق تاثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ ایس ایم حالی کی کتاب "چینی کیمونسٹ پارٹی کے سو سال" چین کی حکمراں جماعت کے بارے میں مفید معلومات کی حامل ہے۔ سید جاوید اختر کا سفر نامہ "دوستی کی

شاہراہ پر" کا مطالعہ گیا گیا ہے۔ محمد اسلم جنجوعہ کی کتاب "چین: پر امن تعمیر و ترقی کی نئی شاہراہیں بھی زیرِ مطالعہ رہی ہے۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel Phillips Huntington) کی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام جاری ہونے والے ماہنامے "اخبارِ اردو" کے بھی ان شماروں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جن میں موضوع سے متعلقہ مواد کر پیش کیا گیا ہے۔ عالمی ادارے اقوامِ متحدہ (United Nations Organization) کی ویب گاہ پر موجود تہذیبی مکالمے کے حوالے سے ہونے والی کارگزاری میں سابقہ سیکرٹری جنرل کوفی عنان، سابقہ ایرانی صدر سید محمد خاتمی کی تقاریر اور دستاویزات کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF RESEARCH)

دیگر زبانوں کی تحریروں نے اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ترجمہ جہاں دو اقوام کے مابین ادبی اشتراک کا باعث بنتا ہے وہیں اس کی بدولت فرد کا فرد سے رابطہ، مضبوط تر ہوتا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں سے عوامی جمہوریہ چین کی علاقائی اور عالمی سطح پر بڑھنے والی غیر معمولی اہمیت نہ صرف اقتصادی اور سیاسی میدان میں ایک قابلِ تقلید مثال ہے وہیں علمی و عملی سطح پر بھی چین ایک قابلِ قدر قوت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ دنیا بھر سے بالعموم اور وطنِ عزیز سے بالخصوص، چین میں علم و فن سیکھنے کے حوالے سے ایک حوصلہ افزا رجحان دکھائی دے رہا ہے۔ ایسے میں ادبیات کے طالب علم کے لئے یہ جاننا یقینا" دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس عظیم مملکت کے ادبی ورثے کو اپنے مطالعے میں بالضرور شامل کرے۔

زیرِ نظر موضوعِ تحقیق کی اہمیت اس اعتبار سے بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ اس میں نہ صرف اب تک اردو زبان میں منتقل ہونے والے نمایاں تراجم کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، وہیں تہذیبی مکالمے کے نظریئے کو بھی پیشِ نظر رکھ کر اس میں موجود ان عناصر کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی، جن کی بدولت دو عظیم ادبی ورثے کی حامل اقوام کے مابین اشتراکِ عمل کی فضا کو مزید بہتر بنانے میں مدد میسر آئے گی۔ یوں دو بہترین دوست ممالک کے مابین ریاستی سطح پر قائم شاندار تجارتی اور اقتصادی تعلقات کے ساتھ ہی ساتھ علمی و ادبی سطح پر موجود روابط میں گرم جوشی اور مزید بہتری لانے کی مقدور بھر کوشش ہو گی۔

ب۔ اردو زبان میں چینی ادبی تراجم کی روایت

چینی ادب کا شمار دنیا کے قدیم ترین ادبی اثاثے میں ہوتا ہے۔ چینی زبان کی قدامت یقینی طور پر ادبی فن پاروں سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اس ناقابلِ تردید حقیقت کے باوجود چینی ادب کو عمومی طور پر ادبِ عالیہ کی فہرست میں نمایاں طور پر جگہ نہیں دی گئی۔ اس امر کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔ تاہم چین اور برعظیم پاک وہند کے مابین صدیوں پر محیط دوطرفہ تعلقات کے باوجود مترجمین اور ناشران کی توجہ چینی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کی جانب کوئی خاطر خواہ توجہ نہ مل سکی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عابد حسین سیال بھی اسی خیال سے متفق نظر آتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔

> "چینی ادب کے اردو تراجم کا سلسلہ زیادہ قدیم نہیں اور مقدار کے اعتبار سے بھی اس سرمائے کو خاطر خواہ نہیں کہا جا سکتا۔"[۱]

تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے ساتھ ہی حکومتِ پاکستان نے سفارتی تعلقات کا آغاز کر دیا تھا۔ تاہم ادبی میدان میں چینی دانش سے استفادہ کرنے کی غرض سے کوئی اہم پیش رفت نہ ہو سکی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمدِ خاص جناب جمیل الدین عالی اسی تناظر میں لکھتے ہیں:۔

> "حیرت ہے کہ پاک چین دوستی کے اتنے سالوں میں جن میں کئی شعبوں میں باہمی تعاون روزافزوں ہوتا رہا ہے، پاکستان میں چینی تراجم وہ جگہ نہ پا سکے جس کے وہ مستحق تھے۔۔۔ پاکستانی ناشروں نے اتنے بڑے ہمسائے، اتنے مضبوط دوست اور اتنی بڑی زبان کے اتنے پھیلے ہوئے ادب پر اس کے حق کے مطابق کیوں توجہ نہیں دی جبکہ وہ مغرب کی بعض پست ترین تخلیقات کو مسلسل اہمیت دیے جاتے ہیں؟۔۔۔ افسوس کہ ہم پاکستانیوں نے پہلے بھی چینی ادب کا حق ادا نہیں کیا اور اب بھی نہیں کر رہے۔"[۲]

دستیاب مواد کی روشنی میں اردو زبان میں چین شناسی کی جو روایت ہمارے سامنے آتی ہے اس کا مختصر احوال حسبِ حال ہے۔

اس ضمن میں پہلی کاوش ۱۸۴۸ء میں "تاریخ ممالکِ چین" کے نام سے سامنے آئی۔ انگریز مستشرق جیمز فرانسس کارکرن نے اردو زبان میں چین کے بارے میں پہلی کتاب تصنیف کی تھی۔ ۵۱۰ صفحات پر محیط

اس ضخیم کتاب میں بڑی وضاحت سے چین کے مختلف علاقوں اور باسیوں کا احوال پیش کیا گیا ہے۔ سرورق کے مطابق کلکتہ کے مطبع پادری تھامس صاحب سے ۱۸۴۸ء میں چھپنے والی اس کتاب کو بجا طور پر اردو دان طبقے کے لیے چین شناسی کی روایت کا نقشِ اول قرار دیا جا سکتا ہے۔[۳] اسی کتاب کی دوسری جلد ۱۸۵۲ء میں منظر عام پر آئی۔ ۳۷۷ صفحات پر مشتمل اس جلد میں چین کے ساتھ ساتھ اس کے چند ہمسایہ ممالک اور اقوام کا بھی مختصر احوال موجود ہے۔[۴]

چین شناسی کی روایت میں اگلی اہم پیش رفت ۱۸۶۷ء میں سامنے آئی۔ "تاریخ چین و جاپان" کے نام سے لارڈ الیگن کی تصنیف کو اردو ترجمے کی صورت میں پیش کرنے میں اودھ اخبار کے مترجم مسٹر فریدرک نندی کا نمایاں کردار ہے۔ منشی شیو پرشاد نے اس کتاب کو تہذیب زبان اور کتابت کے حسن سے مالا مال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۴۵۰ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کو مطبع منشی نول کشور، کلکتہ سے چھاپا گیا تھا۔[۵]

"چین اور چینی" از محمد شفیع الدین خان کی ۱۸۹۷ء میں چھپنے والی یہ کتاب بنیادی طور پر ان کے ذاتی مطالعے اور اب تک چین شناسی بارے لکھی گئی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ عام قارئین بھی مستفید ہو سکیں۔ ۵۳ صفحات پر مشتمل یہ مختصر کتاب شمس المطابع پریس، مراد آباد سے چھپی تھی۔[۶] یہ کتاب بنیادی طور پر اب تک چھپنے والی کتب کی تلخیص ہے، جس میں عام فہم انداز میں چین اور اہلِ چین کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اپنی طرز کی اس منفرد کتاب کو ڈینس نیشنل لائبریری مراد آباد کی حسبِ فرمائش ہسٹاریکل سیریز کی پہلی جلد کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں انجمن امداد باہمی، مطبع مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے "دنیا کے شاہکار افسانوں کے تراجم" کے سلسلے کے تحت عبد القادر سروری کی مرتب کردہ کتاب "چینی اور جاپانی افسانے" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تین چینی افسانوں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک اخلاقی قصہ ہے اور دوسرا تاریخی ہے، جب کہ تیسرے کی نوعیت نفسیاتی ہے۔[۷] چین شناسی کی روایت کے ضمن میں ایک اور اہم کاوش کچھ مدت کے بعد ۱۹۳۴ء میں "چین کی کہانی" کے نام سے سامنے آئی۔ اس کتاب کے مصنف چودھری فتح الدین تھے۔ انہوں اس کتاب کو ناشر منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا تھا۔ سات مختصر ابواب

پر مشتمل اس کتاب کو بنیادی طور پر سکول و کالج کے طالب علموں کے عمومی استفادے کی غرض سے لکھا گیا تھا۔[8]

۱۹۳۵ء میں "چینی مسلمان" کے نام سے ایک ایسی کتاب سامنے آئی جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت منفرد اور دل چسپ تھی۔ اسے تصنیف کرنے والا کوئی ہندوستانی قلم کار نہ تھا بل کہ اسے ایک چینی مسلمان نے اردو زبان میں تحریر کیا تھا۔ دراصل اس کتاب کو لکھنے کا خیال بدر الدین چینی کو اس وقت آیا جب وہ ہندوستان میں دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مقیم تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ زیرِ نظر کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی چینی شخص کی جانب سے لکھی جانے والی اولین اردو کتاب ہے۔[9] بدر الدین چینی بنیادی طور پر ایک علمی و تحقیقی شخصیت تھے۔ مادری زبان چینی کے علاوہ قیامِ ہندوستان کے دوران انہوں نے اردو، انگریزی اور عربی میں بھی اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے جامعۃ الازہر، مصر میں قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے عربی مصادر سے براہِ راست استفادہ کیا اور چین میں اسلام کی آمد کے حوالے سے تحقیقی انداز میں بہت سی معروف روایات کو مدلل انداز سے رد کیا۔ انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان، کراچی سے ۱۹۴۹ء میں ان کی ایک اور مایہ ناز تصنیف بعنوان "چین و عرب کے تعلقات" شائع ہوئی۔[10] گو کہ اس کا بنیادی موضوع چینی مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے حالات کے بارے میں ہے، مگر اردو دان طبقہ کے لیے اس میں چین شناسی کے حوالے سے بھی مفید معلومات درج ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تحریر کردہ زیرِ نظر کتاب کے مقدمے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ چینی حکومت نے فاضل مصنف کی علمی لیاقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں جمہوریہ ہند میں بطور سفیر تعینات کیا تھا۔

۱۹۳۷ء میں معروف چینی مفکر کنفیوشس کی کتاب شو کنگ کا اردو ترجمہ "صحیفہ چین معہ مختصر تاریخ چین و حالاتِ کنفیوشس" کے نام سے سید اسد علی انوری نے پیش کیا۔ اس کتاب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں:-

> "یہ مختصر سی کتاب اس مقصد سے پیش کی جاتی ہے کہ اردو دان طبقے کو ان زبردست
> اور تاریخ ساز ہستیوں سے روشنائی حاصل ہو جائے، جنہوں نے چین کی تاریخ اور

خاقانِ چین کو چار دانگ عالم میں منوایا تھا۔۔۔ کنفیوشس کی اصل کتاب جس کا یہ ترجمہ ہے، دنیا میں تاریخ کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ اس کا زمانہ ۲۳۵۵ ق م سے ۷۶۸ ق م ہے۔ اس عرصے میں دراصل مملکتِ وسطیٰ پر چار خاندانوں اور ۵۰ بادشاہوں نے حکومت کی لیکن کنفیوشس نے اپنی کتاب میں صرف سترہ بادشاہوں کا جستہ جستہ حال لکھا ہے۔۔۔ اردو ترجمہ اس انگریزی ترجمہ کا ترجمہ ہے جو مسٹر ڈبلیو گورن نے بک آف ہسٹری کے نام سے ۱۹۱۸ء میں شائع کیا۔"(۱۱)

۱۹۴۱ء میں "زندہ چین: جدید چینی کہانیاں" کے عنوان سے ایک اہم ادبی کاوش سامنے آئی۔ اس کتاب کو ترتیب دینے اور چند کہانیوں کو ترجمہ کرنے کا اہتمام تمنائی صاحب کے حصے میں آیا۔ نیا سنسار، کتاب گھر، بانکی پور، پٹنہ سے شائع ہونے والی کتاب میں بارہ عنوانات کے تحت اہم ادبی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔(۱۲)

۱۹۴۳ء اور اس کے ایک سال بعد چین شناسی کے حوالے سے دو اہم ترین کتب سامنے آئیں۔ یہ دونوں کتب میر عابد علی خان نے لکھیں تھیں۔ پہلی کتاب کا نام "جمہوریہ چین" تھا۔ اسے سید عبدالرزاق بک سیلرز اینڈ پبلشرز، حیدرآباد دکن سے شائع کیا گیا۔ اس میں بیسویں صدی عیسوی کے چینی سیاسی منظر نامے کو بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب "مشاہیر چین" کے عنوان سے تالیف ہوئی۔ جس میں مؤلف میر عابد علی خان نے چین کے انقلابی رہنماؤں کی داستانیں رقم کیں ہیں۔ کتاب میں فاضل مصنف اردو زبان میں چین کے حوالے سے محدود مواد میسر ہونے کے بارے میں جو رائے پیش کی ہے، وہ حسبِ ذیل ہے :-

"ہمارے ممتاز ہمسایہ ملک چین کے بارے میں اردو ادب میں اتنا کم مواد موجود ہے کہ ہمیں چین کی تاریخ، سیاست، تمدن اور ادب کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ چین کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہے جو علم و تہذیب کا گہوارہ اور بڑے مرکز رہے ہیں، جن سے ساری دنیا نے فیضان حاصل کیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس سرچشمہ تمدن کا اتنا مختصر اور موہوم تذکرہ ہمیں ملتا ہے کہ ہم اس کی صحیح عظمت کا کوئی تصور نہیں کر سکتے۔"(۱۳)

چینی ادب پاروں کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے کام کی ابتدا تقسیمِ ہند سے قبل ہی ہو گئی تھی، تاہم اس رجحان میں ابھی تک شخصی کاوشوں کو ہی دخل تھا۔ عمومی طور پر ایسے مترجمین کا کام سامنے آیا جو اپنی سفارتی، پیشہ وارانہ ضرورت یا ادبی ذوق کے تحت چینی ادب کی جانب متوجہ ہوئے۔ ادارہ جاتی سطح پر چینی ادبی کتب کو اردو قالب میں ڈھالنے کو طرف فی الوقت توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ اسی روایت کے تحت ۱۹۴۴ء میں اسرار احمد آزاد نے معروف چینی رہنما ماؤزے تنگ کی شخصیت اور سوانح کے حوالے سے ایک سیر حاصل کتاب بعنوان "سرخ چین کا رہنما" تحریر کی۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے چیئرمین ماؤ کی ابتدائی زندگی، خاندانی پس منظر، تعلیمی مصروفیات، سیاسی جدوجہد اور چینی قوم کی انقلابی تحریک کے قائد کی حیثیت سے سیر حاصل گفت گو کی ہے۔ چیئرمین ماؤ کی شعر و ادب سے دلچسپی کو بھی زیرِ نظر کتاب میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ سرخ فوج کے طویل سفر کے دوران میں انہوں نے جو نظم لکھی اس کے مندرجہ ذیل ترجمہ سے ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"سرخ فوج طویل سفر کی زحمتوں سے نہیں گھبراتی بلکہ وہ
پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں اور چوڑے تیز رفتار دریاؤں کو عبور کرنا کھیل تصور کرتی ہے۔
کوہستان لیانگ کا ناہموار سلسلہ اور
کوہستان مینگ کے ارد گرد پھیلا ہوا سبزہ زار
دریائے گولڈ سینڈ کی چٹانوں سے ٹکرانے والی بے قرار لہریں اور
دریائے تاؤ کی خون کو منجمد کر دینے والی سردی
پھر کہ من شان پر میلوں تک پڑا ہوا دلکش برف
جب یہ سب چیزیں گزر گئیں تو تینوں فوجیں مسکرانے لگیں"(۱۴)

۱۹۵۰ء میں سید ظلِ حسنین، جنہیں ادبی دنیا میں ظ انصاری کے نام سے جانا جاتا ہے، کی کاوش "چینی گاؤں" کے نام سے سامنے آئی۔ ظ انصاری کو اس اعتبار سے خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے ادب سے تراجم کر کے اردو زبان کو ثروت مند بنایا ہے۔ زیرِ نظر ناول مقبول چینی ادیب تیئن چن نے ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ لکھا تھا۔ ظ انصاری نے چینی ناول کے انگریزی ترجمے "VILLAGE IN AUGUST"

سے اسے اردو زبان میں منتقل کیا۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۰ء میں، اس ناول کو اردو دان قارئین کے استفادے کی غرض سے پیش کیا گیا۔ اس ناول کا بنیادی موضوع چین پر جاپان کے سیاسی اثر ورسوخ کے خلاف مقامی باشندوں میں پایا جانے والا اضطراب تھا۔ معروف امریکی ادیب، صحافی ایڈ گر سنو کے بقول اس ناول کی تاریخی اہمیت اس امر سے بھی واضح ہے کہ یہ وہ اولین چینی ناول ہے جسے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔(۱۵)

قیامِ پاکستان سے قبل ہی متحدہ ہندوستان میں ظ انصاری کا چینی ترجمہ شدہ ناولٹ "زلفوں کے سائے میں" اس روایت میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بھی انگریزی ترجمے کی مدد سے اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ چینی ناول نگار شہیہ ین نے اسے دوسری عالمی جنگ کے آس پاس لکھا تھا۔(۱۶) اس زمانے میں جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ جنگی ماحول میں ایک دور افتادہ گاؤں میں رہ کر فوجی ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ شہیہ ین نے رومانوی ناول لکھ کر چینی ادب کو ایک نئی جہت سے واقف کروایا۔ اس ناول کی کہانی بنیادی طور پر ایک ایسے سپاہی کے گرد گھومتی ہے جو دورانِ ملازمت زخمی ہو کر ایک مقامی چینی خاندان میں رہائش پذیر ہو گیا۔ جہاں وہ اپنے میزبان کی جواں سالہ بیٹی کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ تاہم پیشہ وارانہ اصول وضوابط اور پابندیوں کے باعث ہجر کی سختیوں سے ہی نبرد آزما رہا۔ اس ناول کا انگریزی ترجمہ "IT HAPPENED AT WILLOW CASTLE" کے عنوان سے پیکنگ سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ جلد ہی اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ظ انصاری نے اس ناول کا ترجمہ "زلفوں کے سائے میں" کے عنوان سے کر کے ۱۹۵۳ء میں مکتبہ شاہراہ، دہلی سے شائع کروایا۔ اٹھاسی صفحات پر مشتمل یہ مختصر ناولٹ ایک خوب صورت چینی ادب پارہ ہے۔

۱۹۵۴ء میں ظ انصاری کا ایک اور ترجمہ "چین کی بہترین کہانیاں" کے عنوان سے سامنے آیا۔ اس ترجمے کے مقدمے میں "چینی ادب کی نئی منزل" کے نام سے فاضل مترجم کا تبصرہ بہت شان دار ہے۔ چینی ادب کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی روایت پر بھی سیر حاصل گفت گو کی گئی ہے۔ چین میں سیاسی سطح پر ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ کے باعث ادب سے وابستہ افراد پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں ظ انصاری اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:-

"نقطہ نظر اور عمل کی اس تبدیلی نے ادب میں گلہائے نو بہار کھلائے ہیں۔ جن کے وقت میں کل تک رائفلیں اور کدالیں تھیں، وہ فرصت کے اوقات میں قلم سنبھالنا سیکھ رہے تھے۔"(۱۷)

چینی ادبی تراجم کی اردو زبان میں منتقلی کا سلسلہ تواتر سے جاری رہا۔ اس ضمن میں ادبِ اطفال کی ذیل میں کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی سے عادل رشید نے "چین کی شہزادی" کے نام سے مختصر کتاب ترجمہ کی۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں انڈین پرنٹنگ ورکس، نئی دہلی سے چھپ کر سامنے آئی۔(۱۸) ابن انشاء کا سفر نامہ چین بعنوان "چلتے ہو تو چین کو چلیئے" سفر نامہ نگاری میں بہت مقبول ہے، جو ۱۹۷۹ میں شائع ہوا تھا۔ تاہم اس سے قبل ۱۹۶۰ء میں انہوں نے نے چینی نظموں کے بہترین تراجم کیے اور کتابی صورت میں پیش کیا۔ چونسٹھ نظموں کے ترجمے پر مشتمل کتاب کے بارے میں ابنِ انشاء لکھتے ہیں:۔

"میری کوشش یہ رہی ہے کہ ترجمے اصل کے پابند رہیں لیکن شاعری کی رنگ و بو، تاثیر اور رچاؤ سے عاری نہ ہونے پائیں۔ ان میں آپ کو اظہار کے انوکھے پیرایے اور تکنیک کی کچھ بدعتیں بھی ملیں گی۔ خدا کرئے اہلِ ذوق کے نزدیک پسندیدہ ٹھہریں۔"(۱۹)

۱۹۵۸ء میں ابراہیم جلیس نے ایک صحافتی وفد کے ہمراہ چین کا دورہ کیا تھا۔ اپنے قیام کے دوران چین کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے "نئی دیوارِ چین" کے نام سے ایک سفر نامہ تحریر کر کے چین شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔(۲۰) اسی روایت کو بعد میں سابق وفاقی وزیرِ اطلاعات مولانا کوثر نیازی نے "چین میں ایک ہفتہ" کے عنوان سے اپنے سفر نامے کو قلم بند کر کے آگے بڑھایا۔ سفر نامے کو کتابی صورت میں ڈھالتے ہوئے اس میں سرکاری سرگرمیوں اور سیر حاصل ابتدائیے سے مزین کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اسے شائع کیا۔ فاضل مصنف ایک مقام پر چینی ادب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"چین کو بجا طور فخر ہے کہ وہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا حامل ہے۔ حکمت و دانائی کی چھاپ رکھنے والا چینی ادب دنیا کے ہر خطے میں اپنے قاری کے لیے وجہء فیضان ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح چین کا جدید ادب بھی ان تمام "ریڈرز اور لیڈرز" کے لیے

یکساں موجبِ کشش ہے جو انقلابی جدوجہد کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔۔۔ چینی اور پاکستانی عوام کے حق میں یہ بہت بہتر ہو گا کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے بنیادی عناصر کو پہچانیں اور ان میں اشتراکِ عمل کی راہیں تلاش کریں۔ اسی باہمی اشتراک ہی سے ہم اپنی انفرادیت اور اپنے کردار کو بچانے کی امید کر سکتے ہیں۔"(۲۱)

۱۹۶۶ء میں چینی معاشرے اور اس کے جملہ پہلوؤں سے واقفیت فراہم کرنے والی ایک اہم ترین کتاب شائع ہوئی۔ اس کا نام "چین کا بدلتا سماج" تھا۔ اس کے مصنفین میں چو چائیاور ون برگ چائی شامل تھے۔ تاہم اسے اردو زبان مین ترجمہ کرنے والوں میں محمد سلیم خان، گوپال متل اور محمد سلیمان صابر کے نام شامل ہیں۔ نیشنل اکاڈمی، دہلی سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ اب تک اردو قارئین کے لیے چین شناسی کی روایت میں سب سے بھرپور اور بہترین کتاب کے طور پر اس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بیس ابواب میں سیر حاصل بحث کے ذریعے چینی سماج کے قدیم وجدید پہلوؤں کو بہت عمدہ طریقے سے مذکور کیا گیا ہے۔(۲۲) اسی سال اسی ادارے کے زیرِ اہتمام ایک اور ترجمہ شدہ کتاب "چین میں اسلام کا ماضی اور حال" کے نام سے سامنے آئی۔ اس کتاب کے مصنف ڈیوڈ لو تھے جب کہ اسے ترجمہ کرنے کا کام گوپال متل نے سر انجام دیا۔ کتاب کا ابتدائیہ "حرفِ چند" کے عنوان سے لکھتے ہوئے فاضل مترجم لکھتے ہیں:۔

"چین میں اسلام کا ماضی اور حال" کے مصنف ڈیوڈ لو نے، جو شنگھائی کے ایک مسلمان خاندان کا چشم و چراغ ہے، چین میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر اِس وقت کے حالات بیان کیے ہیں۔۔۔ڈیوڈ لو نے مذہبِ اسلام اور اسلامی ثقافت پر برسوں ریسرچ کی ہے۔ ان کی معلومات کا دائرہ صرف چین تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے بلادِ اسلامی بالخصوص مصر، شام اور عراق کے متعدد دورے کیے ہیں اور ان ملکوں کے ثقافتی حالات کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے۔"(۲۳)

شفیع عقیل کا شمار ان ادباء اور صحافیوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے چین میں رہ کر چینی تہذیب و ثقافت کو بغور دیکھ کر چینی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۵ء میں آپ نے "چینی لوک کہانیاں" کے عنوان سے پہلی کتاب ترتیب دی۔ بعد ازاں ۱۹۹۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں فاضل ترجمہ نگار نے مزید پانچ کہانیوں کو اضافہ بھی کیا۔ چینی لوک ادب کو جاننے اور اس کے

مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنی بے پناہ مقبولیت کے باعث اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آیا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے زیرِ نظر کتاب کا ابتدائیہ لکھا اور اس کتاب کی اہمیت ان الفاظ میں واضح کی:-

> "پاکستان اور چین ایک دوسرے کے قریب تو آچکے ہیں مگر گہری مفاہمت کے لیے ایک دوسرے کی زندہ روایات کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ کام صرف حکومتوں کا ہی نہیں، دونوں ملکوں کے عام آدمیوں کا بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چین میں پاکستانی مزاج کو سمجھنے کے لئے بہت کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں چینی عوام کا مزاج جاننے کے لئے ان کے جدید انقلابی خیالات و عمل کو جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی لوک کہانیوں سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے میں خاصا مواد فراہم کرتی ہے۔"[۲۴]

"چینی لوک کہانیاں" چین کے لوک ادب سے اردو دان طبقے کو متعارف کروانے والی اولین کتاب کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اسے محض کہانیوں کا رواں ترجمہ ہی نہیں سمجھنا چاہیے بل کہ اسے ترجمے سے کچھ بڑھ کر ہی سمجھنا چاہیے۔ فاضل ترجمہ نگار نے کہانیوں کے پلاٹ، کرداروں اور واقعات کو متاثر کیے بغیر اس میں فنی اعتبار سے کچھ ترامیم یا اضافے بھی کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے چینی کہانیوں کا ترجمہ اور تہذیب کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اپنے سیر حاصل دیباچے میں بھی تہذیبی مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے جامع تصور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شفیع عقیل یوں رقم طراز ہیں:-

> "یہ تمام کہانیاں چین میں صدیوں سے کہی سنی جا رہی ہیں اور ان کا سفر سینہ بہ سینہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے جو ہر دور میں زندہ رہتا ہے۔ لوک کہانیاں ہوں یا لوک گیت، وقت ان میں تبدیلیاں تو لا سکتا ہے مگر ختم نہیں کر سکتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوک ادب کسی ایک شخص کی تخلیق نہیں ہوتا۔ اس میں نسلوں کے جذبات اور احساسات اور صدیوں کے تجربات سموئے ہوتے ہیں۔ یہ تمام انسانوں کی مشترکہ تخلیق ہوتی ہے اور اسے تمام انسان مل کے اپنے ذہنوں اور دلوں میں زندہ رکھتے ہیں۔۔۔ ان کہانیوں میں وہ تمام انسانی دکھ سکھ ملتے ہیں جن سے زندگی عبارت ہے۔ مگر ایک چیز ان تمام کہانیوں میں مشترک ملے گی۔ اور وہ ہے اپنے مقدر کے

حصول کے لیے جدوجہد اور ظلم و جبر کے خلاف نفرت۔ صرف نفرت ہی نہیں بلکہ ان کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کی ترغیب اور اسے شکست دینے کا حوصلہ۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی روپ میں، کسی نہ کسی کنائے اشارے میں، اور کسی نہ کسی ڈھنگ سے ہر کہانی میں موجود ہیں۔"(۲۵)

معروف چینی ادیب شو شی یوی جن کا قلمی نام لاو شہہ تھا، بنیادی طور پر چینی زبان کے ایک ماہر استاد تھے۔ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں بطور لیکچرار اپنے فرائض دیتے رہے۔ تاہم ۱۹۴۸ء میں چین کی آزادی کے بعد وطن واپس لوٹ آئے۔ چینی زبان کے فنی اور ادبی امور سے آگاہی کے سبب انہیں ملک میں اہم ادبی اداروں کی انتظامیہ میں بھی شریک کیا گیا تھا۔ ناول نگاری ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا۔ انقلابِ چین سے قبل کی نصف دہائی میں سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کی عکاسی انہوں نے اپنے مشہور تاریخی ناول "قہوہ خانہ میں" پیش کی۔ چین میں انہیں عوامی فنکار اور عظیم زبان دان کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے ناول کا اردو ترجمہ ۱۹۸۳ میں بیجنگ کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر سے شائع ہوا۔ اس ناول کا اردو ترجمہ رشید بٹ نے کیا۔ فلیپ پر درج اس ناول کے بارے میں درج تفصیل کا اقتباس یوں ہے:۔

"پرانے پیچنگ کے ایک روائتی قہوہ خانے کے پس منظر میں لاو شہہ کا یہ کھیل قہوہ خانے کے مالک اور اس کے گاہکوں کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں جدید چین کی تاریخ کے تین ادوار پیش کئے گئے ہیں۔ لگ بھگ پچاس سال کے عرصے پر محیط اس کھیل میں ۶۰ سے زائد کردار ہیں جو معاشرے کے ہر طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یوی تھائی قہوہ خانے کے یہ کردار، اپنی اپنی زندگی میں تغیرات کے ذریعے ان تبدیلیوں کی نشاندھی کرتے ہیں جن سے چینی معاشرہ گزر رہا تھا۔"(۲۶)

عوامی جمہوریہ چین کے انقلابی رہنما اور دنیا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے سربراہ چیئرمین ماؤ زے تنگ نہ صرف ایک مدبر سیاست دان تھے بل کہ ایک منفرد شاعر اور ادیب بھی تھے۔ چینی ادبی منظر نامے پر گہری نظر ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کرنا ان کا معمول تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ان کی منتخب نظموں کا اردو ترجمہ، نام ور ادیب، مترجم اور تاریخ دان یحییٰ امجد نے بیجنگ کے غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر سے شائع کروایا۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے چین شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا اہم ترین

کام "چینی شاعری" کے عنوان سے پیش کیا۔ اس ترجمے میں انہوں نے تین ہزار سالہ چینی شعری سرمائے کو پیش نظر رکھ کر منتخب کلام کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ تہذیبی مکالمے کے پس منظر میں ان کا یہ مذکورہ اقتباس حسبِ ذیل ہے:-

> "چینی شاعری میں مجھے ہمیشہ ایک جذباتی سی قوت نظر آئی ہے جو سماج کی باطنی وارداتوں کو تصویروں کی مانند کھولتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایک فرد کی روداد سے زیادہ سماجی عمل اور انسانی رد عمل کی روداد ہے۔ اس کی تاثیر گہری اور معنویت گراں قدر ہے۔ عہد بہ عہد تہذیبوں کے باطن میں سانس لیتی ہوئی انسانی صورت حال کا سفر اس شاعری کا سفر ہے۔ اس کی اسی دلآویزی نے مجھے تحریک دی ہے یہ انتخاب و ترجمہ کیا جائے۔"(۲۷)

معروف چینی ادیب چاؤ شورین جنہیں لوشون کے نام سے جانا جاتا ہے، کے فکر و فن سے متعارف کروانے والی پہلی اردو کتاب "آج چاند روشن ہے، لوشون کی کہانیاں" ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب نصری فاطمہ نے ترجمہ کی اور لوشون کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت و فن سے بھی روشناس کروانے کے لیے دو تفصیلی مضامین بھی شامل کیے ہیں جب کہ لوشون کی تحریروں میں سے آٹھ نمائندہ ادب پاروں کا ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جن کی بدولت چینی ادب کے عظیم ادیب کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں آزاد کوثری نے بھی چند نثری نظمیں "جنگلی گھاس" کے نام سے نگارشات سے شائع کروا کے لوشون شناسی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

اصناف ادب میں آپ بیتی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عمومی طور پر اس صنفِ سخن کے تحت مشاہیر اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ادبیاتِ عالم کی طرح چینی ادبیات میں اس صنفِ سخن پر بھی کام کیا گیا ہے۔ چین کے آخری شہنشاہ کی آپ بیتی "پھو ای شہنشاہ سے شہری تک" کے نام سے ۱۹۸۵ء میں اردو ترجمے کو ساتھ بیجنگ کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس آپ بیتی میں چین کے آخری شہنشاہ کی پیدائش سے لے کر تخت نشین ہونے، انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں تخت الٹنے سے لے کر ریاست مانچو کا کٹھ پتلی بادشاہ بننے تک اور پھر انقلابی حکومت

کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے لے کر معافی تک کے تمام حالات بڑی تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔اس آپ بیتی کے مترجم حامد ہاشمی تھے، جب کہ اس ترجمے پر نظر ثانی کا کام رشید بٹ نے سرانجام دیا۔

"مصنف نے چھینگ دربار کے آخری ایام کی بڑی واضح تصویر کشی کی ہے۔ وہ انکشاف کرتا ہے کہ شاہی خاندان کا تختہ الٹ جانے کے بعد اس نے اور دیگر جاگیردارانہ قوتوں نے کس طرح بیرونی طاقتوں کے ساتھ مل کر شہنشاہیت کہ بحالی کی سازش کی اور خود جاپانی سامراجیوں کے ہاتھوں میں کیسے کٹھ پتلی بنا۔ پھوای "شہنشاہِ مانچوکو" کی حیثیت سے اپنے احوالِ زندگی بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ چین کی عوامی حکومت کے ہاتھوں کس طرح لگا۔ وہ چینی جیلوں میں جسمانی محنت اور مطالعے کے ذریعے جنگی مجرموں کی اصلاح کا حال بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کا اپنا اندازِ فکر کیونکر تبدیل ہوا۔"[۲۸]

۱۹۸۶ء میں ہی سید اشتیاق الحسن کی ترجمہ کردہ تھانگ عہد کی دس کہانیوں کو "ناگ راج کی بیٹی" کے عنوان سے بیجنگ کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر نے عوامی جمہوریہ چین سے شائع کیا۔ ان کہانیوں کا تعلق چینی ادبی تاریخ کے اُس سنہرے دور سے تھا، جس میں چینی ادب نے بے پناہ ترقی کی۔

۱۹۸۶ء میں آنسہ جمال کوثر کی کتاب "چین میں اردو" کے نام سے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ ایک مختصر کتابچہ ہے لیکن مختصر ہونے کے باوجود انتہائی اہم اور مفید معلومات سے بھرپور ہے۔ چین میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مصروفِ عمل اداروں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ چین میں تدریسی اور ادبی حوالے سے جو ادارے اردو زبان کی خدمت میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں ان میں جامعہ بیجنگ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۸۹۸ء میں قائم ہونے والی چین کی سب سے قدیم درس گاہ میں اردو زبان کی تدریس کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ اس درس گاہ کے شعبہ اردو سے سینکڑوں طالب علم فارغ التحصیل ہو کر اہم ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر ۱۹۵۲ء میں قائم کیا گیا تھا، جس کا بنیادی مقصد چین کی تاریخ، ادب، ثقافت موجودہ نظام اور اس کی سماجی، سیاسی و معاشی فتوحات سے متعلق کتابوں کو غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کرنا ہے۔ اس ادارے کے زیر انتظام، اس کتاب کی

اشاعت تک ۳۷ چینی کتب کو اردو میں ترجمہ کیا جا چکا تھا۔ ان تراجم میں دستاویزات اور نظری تصنیفات، ادبیات، تاریخ، معلوماتی کتب اور بچوں کے لیے باتصویر کتابیں شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو بیجنگ کی اردو سروس، چین باتصویر ایڈیشن، چینی اکادمی برائے سماجی علوم اور بیجنگ پاکستانی کالج کی جانب سے ہونے والی اردو زبان کی خدمت قابلِ قدر ہے۔ جامعہ بیجنگ میں شعبہ اردو کے اس وقت کی سربراہ شان ین نے فاضل مصنفہ کو اپنے عزائم سے یوں آگاہ کیا:-

> "گو کہ ہم نے تدریس و تحقیق میں مقدور بھر کوششیں کی ہیں، لیکن ملکی ضروریات کے مقابلے میں یہ کوششیں بہت ناکافی ہیں۔ ہم مستقبل میں اردو زبان و ادب پر باقاعدہ اور سائنٹفک طریقے سے تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ چین میں اس وقت مشرقی زبان و ادب پر تحقیقی کام کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے لیکن ہمارے تحقیقی کام کی راہ میں سب سے بڑی مشکل حوالہ جاتی کتب، رسائل اور دیگر ضروری مواد کی عدم دستیابی ہے۔ منٹو، ندیم اور کرشن چندر وغیرہ کی تحریروں کے مکمل سیٹ ہمارے پاس موجود نہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارا تحقیقی کام ایک مقام پر آکر رک جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری خواہش ہے کہ پاکستان کے علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں کے ساتھ ہمارا رابطہ مزید بڑھے اور دونوں ملکوں کے ادبی سیمیناروں میں دونوں طرف کے ادیب و سکالر شرکت کریں۔"(۲۹)

چینی ادبی تراجم کا سلسلہ مختلف اوقات میں آگے بڑھتا رہا۔ اس روایت میں اگلی پیش رفت ۱۹۸۸ء میں اس وقت پیش آئی جب عوامی جمہوریہ چین کے ادیبوں پر مشتمل وفد نے پاکستان کا دورہ کیا اور اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے چیئرمین کو چینی لوک ادب پر مشتمل کہانیوں کا تحفہ پیش کیا اور اسے اردو میں ترجمہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بدلے میں انہوں نے بھی پاکستانی لوک ادب کو چینی زبان میں ترجمہ کرنے کی پیش کش کی۔ چناں چہ اس پس منظر میں "طلسمی پرندہ" کے عنوان سے بہجت شبیر نے تیرہ چینی لوک کہانیوں کا ترجمہ پیش کیا۔ اس ترجمے میں شامل کہانیوں کے نام یوں ہیں:- ۱۔ لی باؤ اور کوئی کوئی، ۲۔ سنہری بالوں والا لڑکا، ۳۔ مچھیرے کا بیٹا، ۴۔ شکاری ھالی بو، ۵۔ ہوشیار سرخ لومڑی، ۶۔ طلسمی پرندہ، ۷۔ سیپ لڑکی، ۸۔ زھوگو اور کانگ مائی، ۹۔ سنہرا ہرن اور ہنگ مائی، ۱۰۔ عظیم ایکسو اور سلور بیل، ۱۱۔ ہیرو کانڈے بے،

۱۲۔ لمبی زلفوں والی دوشیزہ، اور ۱۳۔ مولا۔ زیر نظر کتاب کی ابتدا میں ناشر کی جانب سے جو تعارفی نوٹ رقم کیا گیا، اس کا ایک اقتباس یوں ہے:۔

> "ان کہانیوں کے کردار اور واقعات ہماری لوک کہانیوں سے کافی مماثلت رکھتے ہیں اگر کوئی فرق ہے تو صرف ناموں کا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے لوگوں کی سوچوں اور جذبوں میں کتنی ہم آہنگی ہے۔ وہ ایک ہی طرح کا خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ ہے "امن، خوشحالی اور بہتر مستقبل کا خواب"[۳۰]

چینی ادبی تراجم کے ساتھ ساتھ متفرق موضوعات پر بھی اردو تراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس ضمن میں ۱۹۸۶ء میں حاجی ابراہیم۔ ٹی۔ وائی۔ ما (جے۔ ایس۔ ایم) کی چین میں مقیم مسلمانوں کی تاریخ اور طرزِ بود باش کے بارے میں انگریزی کتاب کا ترجمہ سامنے آیا۔ اس ترجمے کو پیش کرنے میں تابش صدیقی کا بنیادی کردار ہے۔ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ترجمے میں مسلمانوں کو درپیش حالات کے مدوجزر پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔[۳۱]

۱۹۸۹ء میں چین کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی اور ادبی کردار سے روشناس کروانے کی غرض سے ایک اہم کتاب سامنے آئی۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی چینی شخصیت کی جانب سے اردو زبان میں لکھی جانے والی اب تک کی پہلی ادبی کتاب ہے۔ سو سے زائد معروف چینی شعراء اور ادباء سے متعارف کروانے والی اس کتاب کا نام "چین کے مشہور ادیب اور شاعر" ہے۔ اس کے مصنف کا نام یوان وئے شوئے ہے۔ انہوں نے پاکستان میں رہ کر باقاعدہ اردو زبان سیکھی اور اس میں دسترس حاصل کر کے اسے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ زیر نظر کتاب سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۸۹ء شائع ہوئی۔ اس کتاب کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مصنف یوں لکھتے ہیں:۔

> "جب میں نے اردو سیکھ لی تو پاکستان کے ساتھ گہرا تعلق قائم ہو گیا۔ میں اردو زبان، اردو ادب اور پاکستانی عوام سے بہت محبت کرتا ہوں۔ سچ پوچھئے تو پاکستان میرا دوسرا وطن ہے۔ میں نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ چین اور پاکستان کے عوام کے درمیان باہمی مفاہمت اور دوستی میں اضافہ کرنے کے لیے بھرپور کوشش کروں گا۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء

سے اردو ادب کا ترجمہ کرنے لگا۔۔۔ چینی ادیبوں اور شاعروں کو پاکستانی عوام بہت کم جانتے ہیں۔اس خلا کو پر کرنے کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔"(۳۲)

۱۹۸۹ء میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام چینی اقلیتی قبیلے "داور" کی لوک کہانیوں کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔ چینی دانش وروں کے خیال کے مطابق داور قبیلہ بنیادی طور پر کھیتان قبیلے کے وارث ہیں۔ یہ قبیلہ اپنے منفرد طرزِ زندگی، رسوم و رواج، اعلیٰ ثقافت اور معاشرت کے باعث اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔داور قبیلے کی خواتین تمباکو کی پیداوار کے حوالے مشہور ہیں۔ ان کی داستانوں میں داور قبیلے کی زیرکی اور دانائی کے قصے بھی ہیں اور عیاری کے چٹکلے بھی۔فاضل مترجم شمیم اکرام الحق کا کہنا ہے کہ:۔

"ان کہانیوں میں زیادہ تر کہانیوں کے موضوعات انتقام پر مبنی ہیں۔ اپنے بُرے رشتہ داروں، بیویوں، شوہروں، سوتیلے رشتوں سے انتقام کی کہانیاں ہیں، جنہوں نے یا تو کوئی نقصان پہنچایا ہے یا بچے جدا کر دیئے ہوتے ہیں۔ بیشتر کہانیاں جادو، ٹونے، سحر اور طلسم کے گرد گھومتی ہیں، جن کے کردار اکثر خیالی ہوتے ہیں۔کہانیوں میں بار بار ریچھوں، ابابیلوں، بارہ سنگھوں، ہرنوں اور قسم قسم کے پرندوں کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا ماحول تھا جس نے داور قوم کے تہذیبی نقش و نگار کو تشکیل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا اور شمال مشرقی چین کے داوروں نے اپنے تصورِ سچائی کو کتنی جدوجہد کے بعد، مکمل کیا ہے۔"(۳۳)

۱۹۸۹ء میں ہی اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے تعاون سے چینی لوک کہانیوں کا ایک پنجابی ترجمہ بھی کیا گیا تھا۔ اس ترجمے کا نام "جادو داچاقو-چین دیاں لوک کہاوتاں"" ہے جس میں نو کہاوتوں کے پنجابی تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام پنجابی زبان میں ایک خاص کتاب پیش کی گئی ۔ اس میں پاکستان اور چین کے ان لکھاریوں کو تاثرات کو قلم بند کیا گیا ہے جو دوطرفہ معاہدے کے تحت مختلف اوقات میں چین اور پاکستان کو سرکاری طور پر دورہ کرتے رہے ہیں۔ یہ کتاب بیک وقت پنجابی اور چینی زبانوں میں شائع ہوئی۔اس میں سترہ چینی لکھاریوں کے ان تاثرات کو پیش کیا گیا ہے، جو انہوں نے پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے قلم بند کیے تھے۔

اردو زبان میں اب تک کے دستیاب شواہد کے مطابق سب سے پہلا چینی ناول ۱۹۹۶ء میں ترجمہ ہو کر سامنے آیا۔ ژانگ زیان لیانگ کے لکھے معروف چینی ناول کو اردو میں ترجمہ کرنے کا کام انور غالب نے سرانجام دیا۔ "ادھورے مرد" کے عنوان سے یہ ناول ادارہ مشعل، لاہور کی جانب سے پیش کیا گیا۔ چین کے ثقافتی انقلاب کے پس منظر میں ایک ایسے شخص کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جو شاعری میں باغیانہ روش کا حامل تھا۔ اس عمل کو ریاستی قوانین کے خلاف تصور کرتے ہوئے اسے لیبر کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا، جہاں اس کی زندگی میں ایک عورت نے خوش گوار تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ لیبر کیمپ کی جبری مشقت کا مشکل دور گزارنے کے بعد جب وہ آزاد ہوا تو خاندانی زندگی کی خوشیوں سے یکسر محروم رہا۔ فاضل ترجمہ نگار اپنے سیر حاصل دیباچے میں اس بارے لکھتے ہیں:۔

> "یہاں بہر حال دو بیرونی تاریخی عوامل کا ذکر کرنا ضروری ہو گا۔ ایک تو برصغیر پاک و ہند سے بدھ مت کا تبت اور چین کی طرف ہجرت پذیر ہونا اور دوسرا بیسوی صدی کے اوائل میں جدلیاتی فلسفے اور مارکسی فکر کا چین میں ورود۔ ان دو عوامل نے چین کی تاریخ پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب کیے ہیں۔ زیرِ نظر ناول ادھورے مرد میں بھی آپ کو انہی عوامل کی اثر پذیری جابجا نظر آئے گی۔ جدید چین فکر کے جن اندیشوں میں الجھا ہوا ہے اس کی جھلک اس کتاب میں خوب صورت انداز میں دکھائی گئی ہے۔"(۳۴)

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کا سہ ماہی جریدہ، ادبیات، پاکستان کی تمام زبانوں میں ہونے والی ادبی و تحقیقی کوششوں کا ترجمان ہے۔ یہ ایک خالص ادبی جریدہ ہے۔ اس جریدے کا اختصاص اس کے خصوصی نمبرز ہیں۔ ادبیات کا چار ہزار صفحات سے زائد ضخامت رکھنے والا بین الاقوامی ادب نمبر اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں دنیا کی دیگر اہم زبانوں کے ادب کے ساتھ ساتھ چینی ادب کے تراجم بھی موجود ہیں۔ اس میں مجموعی طور پر دس چینی افسانوں کے ترجمے شامل کیے گئے ہیں۔ مترجمین میں خالد محمود ترمذی، مسعود سلمان، کوثر جمال، مظفر حسن ملک، نصیر احمد چیمہ، اشفاق نقوی، اعجاز احمد فاروقی، طارق شاہد، ستار طاہر اور محبوب عزمی کے نام شامل ہیں۔ اس شمارے کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر کوثر جمال کے دو تنقیدی مضامین بعنوان "پریم چند اور لوشن کے پسندیدہ موضوعات" اور "پریم چند اور لوشن کی روایت" چین

میں افسانہ نگاری کے عمومی مزاج اور روایت سے متعلق مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ پریم چند اور لوشن کا تقابل کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار لکھتی ہیں:۔

> "پریم چند اور لوشن دونوں نے تاریخی کہانیاں لکھیں۔ فرق یہ ہے کہ لوشن نے تاریخی کہانیوں کو نیا روپ دیا اور ان میں ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ وہ تاریخیت کے گہرے شعور اور جدید عصری اہمیت کی حامل ہو گئیں ہیں۔ لوشن نے تاریخی کہانیوں کے ذریعے ماضی کی بازیافت کا ارادہ کبھی بھی ظاہر نہیں کیا۔ البتہ تاریخ کے کچھ اٹل فیصلوں پر سے پردہ اٹھایا ہے اور انسانی تہذیب کی بعض زندہ رہ جانے والی سچائیوں کا ذکر کیا ہے۔"(۳۵)

یوں تو چینی ادبی تراجم کی روایت میں ایک سے ایک مترجم کا نام سامنے آتا ہے۔ مگر چانگ شی شوان المعروف انتخاب عالم کا شمار اس روایت میں بہت ہی منفرد اور انوکھا ہے۔ چانگ شی شوان بنیادی طور پر چین سے تعلق رکھنے والے اردو زبان کے ماہر استاد ہیں۔ ان کی یہ مہارت صرف اردو بولنے اور لکھنے تک ہی محدود نہیں ہے بل کہ انہوں نے اسے شعری اظہار کا ایسا خوب صورت وسیلہ بنایا ہے کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ "گلبانگِ وفا" ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے، جس میں بے حد خوب صورت شاعری کے مرقع جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ترجمہ کاری کے ضمن میں اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے اپنی چند چینی زبان میں لکھی گئی نظموں کو اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان نظموں کی تعداد سترہ ہے۔ جب کہ ان کی طبع زاد نظمیں، غزلیات اور متفرق اشعار اس کے علاوہ ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب اقبال شمیم کا اس مجموعے کے بارے میں کہنا ہے کہ چین معجزوں کی سرزمین ہے۔ شاہراہِ ریشم تعمیر کرنے والوں کی نسل کے ایک فرد نے اب خشتِ لفظ اور خیال و جذبہ کے مواد سے ایک داخلی شاہراہ تعمیر کرنے کا آغاز کیا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ آنے والے مشرق و مغرب کو ملانے والی اس ثقافتی شاہراہ کی تعمیر مکمل کر دیں۔ جب کہ ڈاکٹر توصیف تبسم کا اس مجموعے کے بارے میں کہنا ہے:۔

> "یہ مجموعہ کلام فکر و فن کے لحاظ سے شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند اور چین کے درمیان ثقافتی لین دین کی روایت بہت ہی قدیم ہے۔ پاکستان اور چین کے

درمیان دوستی اور خیر سگالی کی مستحکم روایت جو موجودہ دور میں قائم ہوئی ہے، یہ شعری مجموعہ اس کا ایک تازہ اور منفرد ثبوت ہے۔"(۳۶)

پاکستان کے نامور مترجم احفاظ الرحمن، جنہوں نے چین میں، غیر ملکی زبانوں میں کتابوں کے اشاعت گھر میں رہ کر چینی ادب کا ایک عظیم ذخیرہ اردو زبان میں منتقل کیا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں ان کے چند تراجم اردو میں شائع ہوئے۔ اس ضمن میں ۱۹۹۹ء انجمن ترقی اردو پاکستان کے تعاون سے "سورج نکل رہا ہے" کے عنوان سے ایک شہرہ آفاق چینی ڈرامے کا ترجمہ پیش کیا گیا۔ یہ ڈرامہ چین کے مقبول ادیب چھاؤیوی کا تحریر کردہ ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع آزادی سے قبل چین کے سماج میں افلاس اور ناداری ہے۔ سماجی ابتری اور مقتدر طبقات کی جانب سے زیرِ دست طبقہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو فنکارانہ مہارت اور فنی باریکیوں کے ساتھ عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈارمے کے چودہ اہم ترین کردار آزادیِ چین سے قبل عوامی جذبات کی بھرپور اور بے باک ترجمانی پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فاضل مترجم جناب احفاظ الرحمن کا اس ناول کے بارے میں کہنا ہے:۔

> "سورج نکل رہا ہے" چین کے شہرہ آفاق ادیب چھاؤیوی کی شہرہ آفاق تخلیق ہے، جس کا دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ چار ایکٹ کا ڈرامہ ہے اور اپنے اسلوب، فنی چابک دستی اور پر اثر کہانی کے سبب جدید چینی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں چینی عوام کے ان آلام و مصائب کی عکاسی کی گئی ہے، جن سے وہ آزادی سے قبل دوچار تھے۔۔۔ چھاؤیوی کو عالمی ادب میں ایک محترم اور ممتاز مقام حاصل ہے اور ان کی تخلیقات دنیا بھر کے قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔"(۳۷)

انجمن ترقی اردو پاکستان کے پلیٹ فارم سے ۱۹۹۹ء میں ہی احفاظ الرحمن کا ایک اور ترجمہ بعنوان "ایک وارڈن کی ڈائری" چھپ کر اردو زبان میں چینی ادبی تراجم کی روایت کو مزید معتبر کرنے کا باعث بنا۔ اس ترجمے میں معاصر چینی ادب کی منتخب چھے انعام یافتہ کہانیوں کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ کہانیاں معروف چینی ادیبوں کی نگارشات میں سے منتخب کی گئی ہیں، جن میں لیو شین وو، چھی چھینگ، وانگ یا چھینگ، پاؤ چھوان، وانگ منگ اور موکو چنگ کے نام شامل ہیں۔ فاضل مترجم کے خیال میں زیر نظر مجموعے میں شامل کہانیاں جدید چینی ادب

میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں چین کے ثقافتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والی سماجی صورت حال کی ترجمان ہیں۔

اس ترجمے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کی ابتدا میں انجمن کے معتمدِ اعزازی جناب جمیل الدین عالی کا "حرفِ چند" کے عنوان سے رقم کیا گیا تبصرہ ہے، جس میں اس مجموعے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ چینی ادبی تراجم کی روایت پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جناب جمیل الدین عالی چینی ادبی تراجم کی رفتار کو تیز تر کرنے کی غرض سے انجمن ترقی اردو پاکستان میں "شعبہ چینیات" قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے زیرِ نظر ترجمے کا خیر مقدم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں:۔

> "راقم الحروف ایک رجائی مستقبلیاتی کے طور پر سوچ رہا ہے جسے تمام استعماری مخالفتوں اور شدید مسابقتوں کے باوجود چین ایک عظیم عالمی طاقت کے طور پر ابھرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ عالمی طاقت بن جانا لامحدود ثقافتی پھیلاؤ کے امکانات بھی رکھتا ہے۔"(۳۸)

اکیسویں صدی عیسوی میں پاکستان میں چین شناسی کی روایت میں بہت حوصلہ افزا پیش رفت ہوئیں۔ ۲۰۰۱ء میں معروف چینی ادیب اور اردو زبان کے ماہر یوان وئے شوئے کا ایک شاہکار "نظمیں، خطاطی اور محبت - پاکستان کیلئے" کے عنوان سے سامنے آیا۔ اس سے قبل یوان وئے شوئے کی چینی ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کروانے والی اہم اردو تصنیف ۱۹۸۶ء میں سامنے آچکی تھی۔ زیرِ نظر کتاب بنیادی طور پر چینی زبان میں پاکستان کے اہم ترین مقامات کے بارے میں خوب صورت نظموں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں کو چینی زبان میں لکھتے ہوئے خطاطی کے فن کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ خطاطی کے یہ نمونے مربع، مستطیل اور دائروی شکل میں ہیں جن کے عکس اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ اس میں صاحبِ کتاب نے اپنے چینی نظمیہ کلام کو اردو میں بھی منظوم ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ ۶۰ نظموں پر مشتمل اپنی اس کتاب پر فاضل شاعر اور مترجم یوں رقم طراز ہیں:۔

> "پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو طویل تاریخ اور ثقافتی روایات کا حامل ہے۔ پاکستان کے عوام مخلص اور دوست نواز ہیں، یہاں کے پہاڑ اور دریا خوب صورت ہیں جن میں بے

شمار قابلِ دید اور دل کش مناظر ہیں۔۔۔میں پاکستان کو اپنا دوسرا گھر سمجھتا ہوں اور مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ میں نے پاکستان کے بارے میں ۶۰ نظمیں لکھیں اور چینی طرزِ خطاطی کے ساتھ قاری کے سامنے پیش ہیں۔ میں اس طریقے سے پاکستان سے اپنی محبت کے گہرے جذبے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔"(۳۹)

معروف چینی فلسفی کنفیوشس کے افکار و نظریات کی جھلک ہزاروں برس سے چینی سماج پر موجود ہے۔ چینی تاریخ کے چند اہم ادوار میں کنفیوشس کے فکر وفلسفہ کو سرکاری سرپرستی میں بھی پروان چڑھایا گیا۔ چینی افسر شاہی کے نظام میں شامل ہونے کی چند بنیادی شرائط میں سے ایک شرط کنفیوشس کے افکار سے واقفیت بھی لازمی تھی اور ہر افسر کو خصوصی پرچے میں کامیابی حاصل کرنا لازمی ہوتا تھا۔ کنفیوشس کی تعلیمات کو دنیا کی تقریبا" ہر بڑی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اردو میں "مکالمات کنفیوشش" کے نام سے اکادمی ادبیات پاکستان نے ۲۰۰۶ء میں ایک اہم ترجمہ پیش کیا۔ بنیادی طور پر یہ کاوش اکادمی ادبیات کے ایک اشاعتی منصوبے کا حصہ تھی، جس کے تحت تین چینی کتب کو اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ "مکالماتِ کنفیوشس" جیسی اہم تاریخی دستاویز کو ترجمہ کرنے کی ذمہ داری یاسر جواد کو سونپی گئی۔(۴۰) ۱۱۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اہمیت اپنی مثال آپ ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے مذکورہ بالا پراجیکٹ میں شامل دیگر دو کتب میں "چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب)" اور "چین کا ادب (قدیم وجدید فکشن سے انتخاب)" شامل ہیں۔ اول الذکر ترجمے میں چینی تاریخ کے چئو دور (۱۱۲۲ قبل مسیح) سے ہان دور (۲۲۰عیسوی) تک کے شعری ادب میں سے منتخب اور نمائندہ فن پاروں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کی دل چسپ بات یہ ہے کہ اس میں آفتاب اقبال شمیم کے قلم سے چینی شاعری کے بارے میں بہت مفید اور ااہم معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں:-

"چینی ثقافت کی طرح چین کی شعری روایت بھی دیگر دنیا کی شعری روایات سے مختلف اور الگ تھلگ ہے۔ جس کی ایک وجہ اور شاید سب سے بڑی وجہ وہاں کا لسانی نظام ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانیں حروفِ تہجی کی ترکیب اور صرف و نحو کے قاعدوں سے بنتی ہیں جب کہ چینی زبان تصویری علامتوں (کریکٹرز) سے تشکیل پاتی ہے اور صرف و نحو کے قاعدوں سے کم وبیش مبرا ہے۔ چینی شاعری کے ان گنت موضوعات ہیں لیکن

ان سب کے سب موضوعات کا مرکزہ ارضی زندگی ہے۔ انفس و آفاق، انسانی وجود اور مابعد کے بارے میں فلسفیاتی خیال آرائی چینی شاعری میں شاذ شاذ ہی نظر آتی ہے۔۔۔ علامت پسندی چینی شاعری کا ایک عمومی رویہ ہے۔"(۴۱)

"چین کا ادب (قدیم و جدید فکشن سے انتخاب) بھی اکادمی ادبیات پاکستان کی چینی نثری ادب سے اردو دان طبقے کو متعارف کروانے کی بہترین کوشش ہے۔ جس میں جہاں ایک طرف چین کے قدیم افسانوی ادب کے اہم فن پاروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے وہیں جدید چینی افسانوی ادب سے بھی روشناس کروانے کا خاطر خواہ اہتمام کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کے مترجمین میں ڈاکٹر عابد حسین سیال، سعیدہ ارم، خرم خرام صدیقی، محمد عاصم بٹ اور آفتاب اقبال شمیم، جیسے کہنہ مشق اور سکہ بند مترجمین شامل ہیں۔ ادبی تراجم کی تہذیبی مکالمے کے تناظر میں اہمیت کے پیشِ نظر افتخار عارف یوں رقم طراز ہیں:۔

"پاکستان اور چین دونوں دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں کے وارث ہیں۔ پاکستان کا خواب ایک شاعر نے دیکھا تھا۔ جدید چین کا بانی بھی ایک شاعر تھا۔ اس لیے ہم اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ جدید چین کی تعمیر میں کیسے کیسے تہذیبی اور تخلیقی رویے کام کرتے رہے ہیں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام صاحبانِ دانش و بینش، چاہے وہ کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں، ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ متحد ہو کر ہم قدمی اور ہم دلی کے ساتھ مکالمے کی روایت کو آگے بڑھائیں اور امن، استحکام، آزادی اور بقائے باہمی کے لیے ماحول کو سازگار اور خوش گوار بنائے رکھنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔"(۴۲)

ادبِ اطفال کو دنیا کی کسی بھی زبان میں بہت اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آج کے بچے کل کو سنجیدہ ادب کو پڑھنے والے قاری کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ چناں چہ چینی ادب میں بھی ادبِ اطفال کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چینی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے والے مترجمین بھی ادبِ اطفال کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اردو میں چینی ادبی تراجم کی روایت میں معروف مترجم احفاظ الرحمن کا نام بہت اہم ہے، جنہوں نے مشہور چینی ناول نگار یان ون چینگ کے مقبول چینی ناول کو "تین

خود پسند بلو نگڑے" کے نام سے اردو ترجمہ کر کے پیش کیا۔ فاضل ناول نگار کا اس ناول پر لکھے اپنے تعارفی نوٹ میں اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> " مجھے خواب پسند ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میں چینی بچوں کے لیے کہانیاں اور حکایتیں لکھنے کی طرف مائل نہ ہوتا۔ اگر میری یہ کاوش دوسرے ملکوں کے بچوں کو پسند آ جائے تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔۔۔ اچھی کہانیاں بچوں کو یہ سکھاتی ہیں کہ دنیا کی کوئی بھی چیز ان کی دست رس سے باہر نہیں ہے، اور انسان ہر قسم کے معجزے دکھا سکتا ہے۔۔۔ ہمیں ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ مختلف ملکوں اور قوموں کے بچے کس طرح اپنے تعصبات اور غلط فہمیوں پر قابو پا کر آپس میں دوستی کے گہرے رشتے قائم کرتے ہیں۔"[۴۳]

زیرِ نظر چینی ناول کے مترجم کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ ترجمہ اس وقت کیا تھا جب وہ چینی دار لحکومت بیجنگ کے "غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر" میں کام کر رہے تھے۔ ناول بنیادی طور پر پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے کردار بڑے بڑے کارنامے سرانجام دینے کے جستجو میں انوکھے اور دل چسپ تجربات سے گزرتے ہیں۔ اس ناول سے چینی بچوں کی عادات اور رویئوں کے بارے میں مفید معلومات میسر آتی ہے۔ یہ ناول جس کتابی شکل میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں فاضل ترجمہ نگار کی تین کتابوں کو یک جا کیا گیا ہے، جن میں "نیمو کیمو" کے عنوان سے دلچسپ کہانیاں "کہانیوں کی دنیا" کے عنوان سے بلغاریہ کی کہانیوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے اسے "ایک کتاب میں تین کتابیں" کا ٹائٹل دیا گیا ہے۔

قدیم چینی فوجی تاریخ میں "سن زو" نام کے فوجی جرنیل کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ ایک روایت کے مطابق اسے کنفیوشس کا ہم عصر تصور کیا جاتا ہے۔ جنگی علوم و فنون اور حکمت عملی کے عنوان پر لگ بھگ چوبیس سو برس قبل لکھی گئی تاریخی کتاب چین کے ماضی کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ عابد میر نے ۲۰۰۸ء میں کیا۔ اس سے قبل اس کتاب کے انگریزی زبان سمیت

دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ جدید چین کے معمار چیئر مین ماؤزے تنگ سمیت دیگر چینی فوجی قیادت کے مشاہیر بھی جنگی حکمت عملی میں سن زو کی مہارت و اصولوں کا اعتراف کر چکے ہیں۔فاضل مترجم کتاب کے بارے میں تعارف کرواتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔

> "سن زو کی کتاب "جنگی فن" میں مختلف موضوعات ہیں جن میں جنگی قانون، جنگ کا فلسفہ، جنگی حکمت عملی سے متعلق باتیں، سیاست، اقتصادیات، سفارت کاری، علمِ نجوم اور جغرافیہ کے موجوعات بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا موجودہ نقطہ نظر سے بھی مطالعہ لازمی ہے جس کے ذریعے اہم باتوں کو منتخب اور غیر اہم باتوں سے اجتناب کیا جا سکتا ہے۔ یوں حال کی ترقی کے لیے ماضی کی مفید باتوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ جنگ کے دوران جنگ کی ترتیب اور جنگی سوچ و فکر کو بڑھانے میں ہر طبقے کے کمانڈر کو بہت زیادہ مدد دے سکتا ہے۔"[۴۴]

۲۰۱۱ء میں محمد اسلم جنجوعہ کی چینی سماج اور نظامِ حکومت کے بارے میں ایک اہم کتاب بعنوان "چین پر امن تعمیر و ترقی کی نئی شاہراہیں" زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب میں بہت تفصیل سے چینی ریاستی ڈھانچے اور سیاسی نظام کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ گو کہ اس کتاب میں کوئی دیباچہ یا ابتدائیہ شامل نہیں ہے تاہم اپنے موضوع کے اعتبار سے اس میں مفید اور ضروری مباحث فراہم کی گئی ہیں۔ کتاب کی دل چسپ بات یہ ہے کہ اس میں بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں چین کی سیاسی و معاشی حیثیت کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔[۴۵]

رشید بٹ کا نام پاکستان کے سینئر صحافی، مترجم اور ادیب کے طور پر جانا جاتا ہے۔ چین کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر بیجنگ میں ایک طویل عرصہ بطور مترجم کے گزارنے کے باعث چینی ادب پر ان کی انتہائی گہری نگاہ ہے۔ جدید چین کے بانی چیئر مین ماؤ کی منتخب تحریروں کو ترجمہ کرنے کے علاوہ ادبی کتب کو بھی اردو میں منتقل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۲۰۱۵ میں "چین کی بہترین قدیم حکایتیں" کے نام سے ان کی ترجمہ شدہ کتاب شائع ہوئی۔ چینی ادبی دانش کے نمونوں سے مزین یہ ترجمہ جن حکایات پر مشتمل ہے ان میں زیادہ تر چوتھی اور تیسری قبل مسیح اور پھر سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں تخلیق ہوئیں۔ چین میں

حکایت نویسی انہی ادوار میں بام عروج پر پہنچی۔ ۱۲۱ قدیم چینی حکایات پر مشتمل یہ کتاب بہت دل چسپ اور منفرد ہے۔ اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا دیباچہ وئی چن چی نے لکھا۔[۴۶]

۲۰۱۵ء میں چین شناسی پر ایک اور اہم کتاب "چین کی کامیابیوں کی کہانی" سامنے آئی۔ اس کتاب کو پیش کرنے کا سہرا پاک فضائیہ کے سابق ہوا باز اور معروف صحافی ایس ایم حالی کے سر ہے۔ فاضل مصنف نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث ایک طویل عرصہ چین میں گزارا اور چین کی حیرت انگیز ترقی کے چشم دید گواہ ہیں۔ بنیادی طور پر یہ کتاب ذاتی مشاہدات پر مبنی منتخب مضامین کی تالیف ہے۔ تاہم اس میں دونوں ممالک کے مابین حکومتی و عوامی سطح پر پائی جانے والی گرم جوشی کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قومی و بین الاقوامی موقر جرائد و اخبارات میں چھپنے والی ان چالیس تحریروں کی بدولت پاک چین تعلقات کی جملہ جہات کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کا پیش لفظ اس وقت کے چینی سفیر جناب سن وی دونگ کی جانب سے تحریر کیا گیا تھا، جس میں انہوں نے فاضل مصنف کے اس کام کی نہ صرف تعریف کی بل کہ اسے دونوں ممالک کی عظیم دوستی میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا۔[۴۷] فاضل مصنف نے اگلے برس چینی ثقافت کے بارے میں شان دار کتاب "چینی ثقافت کے تابندہ نقوش" کے عنوان سے تحریر کی، جس میں چینی آرٹ، طعام، روائتی تہوار، چینی طب، آلاتِ موسیقی، بیجنگ اوپیرا، بازی گری، چینی تفریحی مقامات، لوک کھیل، رقص سمیت چینی طرزِ زندگی کے اہم ترین امور کو بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

۲۰۱۵ء کو پاکستان اور چین کے مابین دوستی کے سال کے طور پر منایا گیا۔ اسی سلسلے میں اکادمی ادبیات پاکستان نے لاہور میں پاکستانی اور چینی ادب کے موضوعاتی اشتراک پر ایک شان دار کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اسی پس منظر میں ۲۰۱۷ء میں "معاصر چینی افسانے" کے نام سے منیر فیاض نے منتخب چینی افسانوں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کو اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی سرپرستی میں پیش کیا گیا۔ معاصر افسانہ نگاری کے بیس ادب پاروں پر مشتمل یہ ترجمہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ دل چسپ بھی ہے۔[۴۸]

عوامی جمہوریہ چین کے صدر اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سیکرٹری شی چنگ پنگ کی اہم تقاریر، خطوط، انٹرویوز، اور مباحثوں پر مبنی کتاب کا اردو ترجمہ "چین کی طرزِ حکمرانی" کے نام

سے پاکستان۔ چائنا انسٹیٹیوٹ اور جمہوری پبلی کیشنز نے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا۔ کتاب میں شامل ۷۹ مضامین کو ۱۸ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں چین کے معاشرتی نظام، تاریخ اور تمدن کے بارے میں تفہیم کی غرض سے حواشی بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ اپنی طرز کی اس واحد کتاب میں چین کی حکومتی داخلہ و خارجہ پالیسی کے بارے میں نمایاں امور کی وضاحت سے چین شناسی کے بارے میں بہت مفید معلومات میسر آنے کے سبب اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ کتاب "چین کی طرزِ حکمرانی" کی ایک اور دل چسپ بات اس میں شامل دیدہ زیب تصاویر بھی ہیں، جن میں مختلف اہم مواقع کی عکاسی کی گئی ہے۔[۴۹]

چینی ادبی تراجم میں جملہ اصنافِ ادب شامل ہیں۔ سائنس فکشن کی روایت اردو ادب میں باوجوہ کچھ زیادہ توانا اور معتبر نہیں ہے۔ تاہم چینی ادب میں اس کی ایک مضبوط روایت موجود رہی ہے۔ اردو سائنس بورڈ کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر عابد حسین سیال نے "چین میں سائنس فکشن" کے نام سے ایک ترجمہ پیش کیا۔ ایک ناولٹ اور دو افسانوں کے ترجمے پر مشتمل اس کتاب کی خاص بات فاضل مترجم کا چین میں سائنس فکشن کی روایت پر مشتمل ایک پر مغز مقالہ ہے۔ اس میں عرق ریزی اور باریک بینی سے ادبیات عالیہ کے تناظر میں چینی سائنس فکشن کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر یوں لکھتے ہیں:۔

> "ڈاکٹر صاحب نے یہ تراجم کرواتے ہوئے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ایک طرف چینی ثقافت، کردار، چینی سائنسی طرزِ فکر اردو زبان میں منتقل ہو جائے اور دوسری طرف ان کی نثر بول چال کی اردو زبان کے قریب رہے۔ یہ کافی مشکل کام تھا، جسے انہوں نے خوبی سے انجام دیا۔۔۔ یہ کتاب پاکستان اور چین کے درمیان ثقافتی اور ادبی روابط کو مزید مضبوط کرنے میں بھی کردار ادا کرے گی۔"[۵۰]

ممتاز چینی ادیب لو شیون کی ایک نمائندہ تحریر "ایہہ کیو کی سچی کہانی" کی اشاعت کا اہتمام نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے تعاون سے ۲۰۱۸ء میں ہوا۔ اس کہانی کا پس منظر ۱۹۱۱ء کے چین میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی ہے۔ نیم جاگیردارانہ اور نیم نو آبادیاتی چینی سماجی تشکیل کے مابین ٹکراؤ کو فن کارانہ مہارت

سے پیش کرنے میں لوشیون ے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ فاضل مترجم نے زیرِ نظر ترجمے کے دیباچہ میں اس کی وضاحت کی ہے:۔

> "ایہہ کیو کی سچی کہانی" اسے بھی تھوڑی لوک اور تھوڑی سیاسی کہانی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس کا تعلق ۱۹۱۱ء کے بعد کے عرصے سے ہے جب چین میں شہنشاہی دور ختم ہونے کے بعد نیم جمہوری سیاسی زمانے کا آغاز ہو چکا تھا۔"(۵۱)

چینی لوک ادب بھی اپنی قدامت اور پراسراریت کے باعث بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فاضل مترجم رشید بٹ نے لوک ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ "مغربی چین کی لوک کہانیاں" کے نام سے ۲۰۱۸ء میں ہی نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد کے تعاون سے یہ ترجمہ سامنے آیا۔ اس کتاب میں مجموعی میں پندرہ چینی لوک کہانیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ رشید بٹ اس کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ چین میں صدیوں پر محیط لوک ادب میں قومیتوں کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ مختلف علاقوں، پہاڑوں، جھیلوں اور خطوں سے متعلق بھی لوک کہانیاں ملتی ہیں۔ مثلاً "ہانگ چو ایک ایسا خوب صورت، حسین اور دل کش منظر کا حامل علاقہ ہے جس کا ذکر قبلائی خان کے زمانے یعنی چودھویں صدی عیسوی کے معروف سیاح ابنِ بطوطہ کی سفری یادداشتوں میں بھی ملتا ہے۔(۵۲)

عوامی جمہوریہ چین ایک وسیع و عریض ملک ہونے کے ساتھ انسانی آبادی میں تنوع کا حامل ایک منفرد ملک ہے۔ یہاں کی ۹۳ فیصد آبادی ہان قومیت پر مشتمل ہے۔ جب کہ باقی آبادی کا تعلق ۵۵ اقلیتی قومیتوں سے ہے۔ یوں مجموعی طور پر ۵۶ قومیتوں کا حامل یہ ملک اپنے ادبی سرمائے میں بھی تنوع کا حامل ہے۔ چینی قومیتوں کے لوک ادب میں بھی انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ رشید بٹ نے اپنے ایک اور اہم چینی ادبی ترجمے بعنوان "مینڈک گھڑ سوار" میں بالترتیب تبتی قومیت، دیغور قومیت، ہان قومیت، ای قومیت، چوانگ قومیت اور تھونگ قومیت کے لوک ادب پر مشتمل لوک کہانیوں کو اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم کی بدولت چین کی مختلف قومیتوں کے ادبی سرمائے اور ان کے سوچنے سمجھنے سے آگاہی ملتی ہے۔(۵۳)

چینی تراجم کے اسی سلسلے کو آگے بڑھانے میں "سورج کی تلاش" کے عنوان سے رشید بٹ کا ایک اور ترجمہ ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں بھی چوانگ قومیت، نونگ قومیت، پائی قومیت، میاؤ قومیت اور ہان قومیت کی منتخب لوک کہانیاں پیش کی گئیں ہیں۔ فاضل مترجم اپنے قیامِ چین کے عرصے میں کیے جانے والے ان تراجم کو اپنا ادبی ورثہ تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اِن لوک کہانیوں میں مرکزی کردار خواہ وہ عام لوگ تھے یا شہزادے، بادشاہ تھے یا شہنشاہ، سب عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مصیبتیں اور دکھ اٹھاتے تھے۔ اِن کہانیوں میں عوام کی بے لوثی، دانائی اور جفاکشی جھلکتی ہے اور ظالموں کا خواہ وہ اعلیٰ عہدے دار تھے، شہزادے یا بادشاہ اور شہنشاہ تھے، برا انجام دیکھنے میں آتا ہے۔ کہانیوں کا اندازِ بیاں بے حد دل کش ہے۔"(۵۴)

چین شناسی کی روایت میں جہاں ادبی تراجم نے بنیادی کردار ادا کیا، وہیں سفر ناموں کے ذریعے بھی اہم تہذیبی نقوش کو دریافت کرنے میں خاطر خواہ مدد میسر آئی۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر شفیق انجم کی رپورتاژ کی صنف میں لکھی کتاب "سنکیانگ نامہ" بہت اہم اور مفید ہے۔ اس میں ویغور قومیت کے حامل چینی مسلمانوں کو درپیش مسائل اور ان کے اسباب پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے ممکنہ حل کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دلائی گئی ہے۔(۵۵)

اردو زبان میں چینی تراجم کی روایت میں اُس وقت ایک اہم اضافہ ہوا جب مختار صدیقی نے چینی فلسفے کی ایک اہم ترین کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ممکنہ طور پر اسے اپنی نوع کی پہلی ترجمہ شدہ کتاب تصور کیا جا سکتا ہے۔ لین یو تانگ کی اس تصنیف کو چینی فلسفے، دانش اور دانائی میں ایک سند کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ چینی زبان میں یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی۔ تاہم اردو زبان میں اس کا ترجمہ بیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی میں ہوا۔ تاہم عدم دستیابی کے باعث نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے زیر اہتمام اس کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۱۷ء میں جب کہ دوسرا ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔

"میں آئندہ صفحات میں زندگی کا وہ نقطہ نظر پیش کروں گا جس کی تشکیل چینی شاعروں اور عالموں نے اپنی دانش، اپنی حقیقت پسندی اور اپنے ذوقِ سلیم سے کی

تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ دنیا کا وہ حصہ جو الہامی دین سے لاتعلق رہا اس کا سارا حسن آپ پر ظاہر ہو جائے۔ زندگی کا سارا سوز و گداز، زندگی کا سارا حسن، اس کی ساری ہیت اور سارا مزاج آپ کے سامنے آ جائے۔ اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے نقطہ نظر سے لکھا جائے جنھیں انسانی زندگی کی مجبوریوں اور پابندیوں کا شدید احساس تھا مگر جو یہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی ایک باوقار چیز ہے اور جو باوقار انسانی زندگی کی عمدہ مثال تھے۔"(۵۶)

۲۰۱۹ء میں انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد کے تعاون سے سید فرست شاہ کی کتاب بعنوان "مشرق کو ذرا دیکھ" سامنے آئی۔ یہ کتاب اپنی طرز کی ایک منفرد، دل چسپ اور بصیرت افروز تصنیف ہے۔ ذاتی تجربات اور زمینی حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب میں نہایت متوازن انداز میں جدید چینی تہذیب اور ثقافت کے مختلف رنگوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ پاک چین دوستی کے ایک تاریخی پس منظر کو آنے والے دور میں مزید موئثر بنانے کی غرض سے جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ بلاشبہ اربابِ اقتدار کے لئے بہترین حکمت عملی ثابت ہو سکتی ہیں۔ چین شناسی کے لیے فاضل مصنف نے صرف سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرنے کے بجائے محققانہ روش اختیار کر کے معاملات کا صحیح رخ پیش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اسی پس منظر میں وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"چین اور چینی معاشرے کے بارے میں بھی دنیا بھر میں جو معلومات بڑے پیمانے پر مہیا کی گئی ہیں وہ چینی قوم اور وہاں کے معاشرے کی درست عکاسی نہیں کرتیں۔ چینی معاشرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اور اس قوم کے طور طریقوں کا ذاتی مشاہدہ کرنے والے کا چین کے بارے میں ایک مختلف تصور تشکیل پاتا ہے۔ چین سے باہر چین کے بارے میں بہت کم اور کئی معاملات میں غلط معلومات پھیلی ہوئی ہیں، جس کی بناء پر لوگ اس معاشرے کے بارے میں عجیب و غریب تصورات قائم کر لیتے ہیں۔"(۵۷)

معروف چینی ادب لوشون کے افسانوں پر مبنی ترجمہ "پاگل آدمی کی ڈائری" کے نام سے ۲۰۲۰ء میں فکشن ہاؤس، لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے مترجم خالد فتح محمد تھے۔ کتاب میں لوشون کی جن پانچ کہانیوں

کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے ان کے نام بالترتیب "پاگل آدمی کی ڈائری"، "چارہ"، "درے سے روانگی"، "بیوہ کا بیٹا"، اور "سیلاب" شامل ہیں۔ کتاب کی ابتداء میں درج تعارف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب چینی زبان میں ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اسے جدید چینی افسانہ نگاری میں اہم سنگِ میل کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کا اصل موضوع چین میں عرصے سے رائج جاگیرداری نظام پر تنقید کرتے ہوئے اعلانیہ جنگ کا اظہار کرنا تھا۔(۵۸)

چینی شعری ادب میں سب سے طویل ترین نظم کا اعزاز حاصل کرنے والی تخلیق "لی ساؤ" کا خالق چھویو آن کو سمجھا جاتا ہے۔ چینی ادبی تاریخ میں چھویو آن کو پہلے عظیم محبِ وطن ادیب اور بابائے شاعری کے طور پر جانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سی نظمیں لکھیں مگر گردشِ زمانہ کے باعث ان کا بیشتر کلام ناپید ہو گیا۔ "لی ساؤ" ان کی ایک ایسی نظم ہے جسے آج بھی چینی شعری ادب کا شاہکار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دنیا کی دیگر اہم زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں تاہم اردو زبان میں اسے پیش کرنے میں ڈاکٹر عابد حسین سیال پیش پیش رہے۔ اس نظم کو "غم کے محاذ پر" کے عنوان سے اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی سرپرستی میں ۲۰۲۱ء میں شائع کیا گیا۔ کم و بیش ۲۳۰۰ برس پرانی اس نظم کو ترجمہ کرنے کے لیے انگریزی متن کو پیشِ نظر رکھا گیا تاہم اصل چینی متن سے ہم آہنگ کرنے کی غرض سے چینی اور اردو زبان کے ماہرین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم اس ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "لی ساؤ" نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اسلوبی زاویئے سے جدید طرز کی شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی بلحاظ ہئیت ایک نئی صنف کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ نئی صنف فو (fu) کے نام سے معروف ہوئی جو شاعری اور نثر کے عناصر کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ اس کی تشکیل ہان دور (۲۰۶ ق م تا ۲۲۰ عیسوی) میں ہوئی جو چھویو آن کی وفات (۲۷۸ ق م) سے کافی بعد کا دور ہے، تاہم اس صنف کی بنیاد لی ساؤ کے ہیئتی نظام پر رکھی گئی ہے۔ اس سے پہلے شاعری کی معروف صنف ساؤ تھی جس میں داخلیت اور غنائیت کے عناصر حاوی تھے۔"(۵۹)

۲۰۲۱ء میں معروف صحافی اور پاک فضائیہ کے سابق افسر ایس ایم حالی کی چین کے بارے میں دوسری کتاب "چینی کمیونسٹ پارٹی کے سو سال" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا موضوع عوامی جمہوریہ چین کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے بارے میں ہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو دنیا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ چین میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل اور اس کے بعد درپیش مسائل پر قابو پانے کی روداد اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے جن امور اور مباحث کو زیرِ نظر کتاب میں زیرِ بحث لایا ہے ان کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے تمام حالات کو اپنے تجربے اور چین میں گزرے وقت کو سامنے رکھا ہے۔ یوں یہ کتاب چشم دید حقائق پر مبنی ہونے کے باعث اپنی مثال آپ ہے۔ کتاب کا انتساب چین اور پاکستان کی عوام اور لازوال دوستی کے رشتے کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بطورِ خاص ان چینیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے جنہوں نے اپنے وطن کو سامراجی قوتوں سے آزادی دلانے میں اپنی جانوں کا عظیم نذرانہ پیش کیا ہے۔ کتاب کو اردو زبان میں لکھنے کی وضاحت ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے:۔

> "میں نے یہ کتاب اردو میں اس لیے لکھی ہے تاکہ میرے پاکستانی ہم وطن خود ہمارے سچے دوست چین اور اس کی کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں مغربی تعصب سے پاک اپنی رائے قائم کر سکیں۔"(۶۰)

ڈاکٹر محمد امین کی چین شناسی کے بارے میں ایک اہم کتاب بعنوان "کنفیوشس اور چین کی ثقافت: ایک تعارف" سامنے آئی۔ اس کتاب میں چینی فکر و فلسفے اور سماجی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرنے والے امور کو دلچسپ انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کتاب میں چینی زبان، شاعری، لوک کہانیوں، اساطیر، تہوار، اقدار اور چینی مشاہیر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ چینی شاعری کے بارے معلومات دیتے ہوئے اہم چینی نظموں کا ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے جس کے باعث کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ کتاب کا سب سے اہم پہلو ڈاکٹر قاضی عابد مرحوم کا لکھا ہوا پیش لفظ ہے جس میں انہوں نے کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں اس انداز میں تبصرہ کیا ہے:۔

"اس کتاب میں چین کے مختلف قدیم ثقافتی مظاہر، اساطیر، رسوم و رواج، کھانے پینے کے طور طریقوں پر بھی اچھی جانکاری مہیا کی گئی ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر محمد امین جاپان شناس کی شہرت رکھتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت سے وہ چین شناس بھی کہلائیں گے۔ اصل بات یوں ہے کہ اس طرز کی ان تخلیقی اور علمی کاوشیں، نو آبادیات اور مشرق شناسی کی بڑی روایت کا حصہ ہیں۔"(۶۱)

چینی ادب کی کلاسیکی تاریخ میں لوگوان چھونگ کا مشہورِ زمانہ ناول "تین سلطنتوں کی داستان" بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چینی ادب کے طالب علم کے لیے اس ناول سے آگاہ ہونا از حد ضروری ہے۔ داستانوی طرز پر لکھے گئے اس ناول کے کل دس حصے ہیں ان میں سے سات حصے تاریخی اور تین حصے افسانوی ہیں۔ اس ناول میں قدیم چینی معاشرے اور عوام کی زندگی، سیاست اور جنگی حکمت عملی کے بارے میں سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک نثری تخلیق ہے تاہم جابجا اس میں نظمیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ناول کے تقریباً" ہر اہم موڑ پر ایک نظم پیش کی گئی ہے۔ جن میں سلطنت کے عروج و زوال، دنیا کے فانی ہونے اور داستان کے باقی رہ جانے کی بات کی گئی ہے۔ فاضل مترجم ناول کے تعارف میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ "تین سلطنتوں کی داستان" کی مقبولیت کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ لگ بھگ دو ہزار سال گزرنے کے باوجود آج بھی یہ چین کے ادب، ثقافت، معاشرت اور سیاسی منظر نامے کی سچی عکاسی کرتی ہے۔ یہ داستان چین کے معاشرے اور ان انسانی جذبات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتی ہے جو آج بھی چین میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یعنی اپنے خاندان، ماں، باپ اور دوستوں سے وفاداری، سچائی، بہادری، ذہانت اور خلوص۔"(۶۲)

چینی تاریخ کا ایک طویل دور بدھ مت کی تعلیمات کے زیر اثر رہا ہے۔ بدھ مت کی تعلیمات کا ایک بڑا مرکز پاکستان کے شہر ٹیکسلا میں بھی قائم تھا۔ چین میں بدھ مت کی تعلیمات میں جب گردشِ زمانہ کے سبب مختلف مذہبی رہنماؤں میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہوا تو اس پس منظر میں دو سیاحوں کا کردار اس اعتبار سے اہم نظر آتا ہے کہ انہوں نے اصل مذہبی ماخذات سے استفادے کی غرض سے ہندوستان کا پرخطر سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اعتبار سے فاہیان کو سبقت حاصل ہے کہ انہوں نے چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں مذہبی

تعلیم کے حصول کے لیے سفر کا آغاز کیا۔ ان کے اس سفر کی داستان بہت طویل اور صبر آزما ہے۔ اس سفری احوال کا چینی زبان سے دیگر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اردو زبان میں یاسر جواد کا ترجمہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ چینی ادبی تخلیقات میں سفر نامہ کی صنف میں یہ پہلا ترجمہ ہے۔ فاضل ترجمہ نگار لکھتے ہیں:۔

"فاہیان نے چینیوں کو بدھ مذہب کی بنیادی کتب فراہم کرنے کی خاطر برفیلے پہاڑوں، سنگلاخ چٹانوں، کھلے میدانوں، بڑے بڑے شہروں، جنگلوں، سمندروں میں سفر کیا اور جن علاقوں سے گزرا وہاں کا حال مختصراً" پیش کرتا گیا۔ اس سفر نامے کے شارحین نے مقامات کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ہر اہم لفظ کے پیچھے موجود تصور کو بھی واضح کرنے کی بھی کوشش کی۔ نیز روایات کی بھی تفسیر کی گئی۔ چنانچہ یہ سفر نامہ اور اس کے حاشیئے پانچویں صدی کے ہندوستان کا سماجی، مذہبی، جغرافیائی، تہذیبی اور کچھ حد تک معاشی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ تکونیاتی (Cosmologic) وضاحتیں بالخصوص دلچسپ ہیں۔"[۶۳]

قدیم چین میں فاہیان کے علمی کام سے بہت استفادہ کیا گیا اور بدھ مت کی تعلیمات کا احیاء کیا گیا۔ تاہم ساتھ ہی ساتھ فاہیان کے علمی کام کی شرح لکھنے میں مذہبی اختلافات کا ایک نہ ختم ہونے والا مسئلہ درپیش ہو گیا۔ اس مرحلے پر ہیون سانگ کا کردار بہت نمایاں اور اہم دکھائی دیتا ہے۔ ہیون سانگ ۶۰۰ عیسوی میں صوبہ ہونان میں پیدا ہوا۔ عہدِ شباب میں بدھ مت کی مذہبی تعلیمات میں موجود اختلافات کی نوعیت کو سمجھنے کی خاطر اس نے ہندوستان کا سولہ سال طویل سفر اختیار کیا اور واپس آنے پر چینی بدھ مت کو ہندوستان میں دیکھے ہوئے بدھ مت کی مطابقت میں لانے کی کوشش کی۔ اس نے ۷۴ اہم مذہبی کتب کا ترجمہ کیا۔ فاہیان کا سفر نامہ ہند اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس میں ہندوستان کی سماجی اور مذہبی صورت حال کے بارے میں بھی مفید اور اہم معلومات میسر آتی ہیں۔ اس سفر نامے کا ترجمہ بھی یاسر جواد نے پیش کیا۔ فاضل مترجم ہیون سانگ کے سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس کا سفر ہندوستان مشرقی ایشیائی تصورات اور خیالات میں ہیجان پیدا کرتا رہا ہے۔ اسکے سفر کا زمانہ ۶۲۹ء تا ۶۴۵ء ہے اور اس کی سیاحت کا رقبہ نہایت ہی وسیع ہے۔ ۔۔اگرچہ ہیون سانگ کی کتاب کا اصل تاریخی وصف یہ ہے اس سے ہم اس دور کے

سیاسی، مذہبی اور معاشرتی آئین و قوانین معلوم کر سکتے ہیں، مگر ہم اس کے اور بھی زیادہ اس لیے ممنون ہیں کہ اس نے قدیم روایات کو اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا۔ اگر ہیون سانگ یہ خدمت سرانجام نہ دیتا تو شاید یہ خزانہ ضائع ہو جاتا۔"(۶۴)

کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے تعاون سے ۲۰۲۲ء میں "چین شناسی" کے نام سے ایک اہم کتاب شائع ہوئی۔ اس مرتبہ کتاب کو ترتیب دینے کا سہرا ڈاکٹر عبدالواحد تونسوی کے سر ہے، جنہوں نے چینی تاریخ، تہذیب، تمدن، زبان، سماج، فلسفہ، عقائد، بین الاقوامی تجارت سمیت چین کے بارے میں اہم امور کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ عہدِ حاضر کے سکالرز اور عام قارئین کو چین کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے میں یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کا انتساب ان پاکستانی اور چینی مزدوروں کے نام کیا گیا ہے جنہوں نے پاک چین دوستی راہداری (شاہراہ قراقرم) کی تعمیر میں اپنی قیمتی جانیں پیش کیں ہیں۔ بارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں چینی سیاسی و معاشی امور پر مبنی مباحث کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے دیباچے میں ریکٹر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن یونیورسٹی، اسلام آباد نے ان الفاظ میں پاک چین دوستی کی اہمیت کو واضح کیا ہے:-

"موجودہ دور میں ضرورت اس امر کی ہے کہ عوامی سفارت کاری کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے پاک چین تعلقات کی ثقافتی جہتوں پر توجہ دی جائے۔ اگر چین اور پاکستان کے شہریوں کے درمیان تعاون دیگر شعبہ جات کے ساتھ ساتھ علم، ثقافت اور روایات کے باہمی تبادلے پر مبنی ہو، تو دونوں معاشروں کے درمیان معاشی خوشحالی کو جنم دے سکتا ہے۔ جس سے خطے کے جغرافیائی ثقافتی ورثے کی تعمیر میں مدد مل سکتی ہے۔۔۔ وقت آ گیا ہے کہ چین اور پاکستان کی مشترکہ ثقافتی تاریخ کے پیشِ نظر ثقافتی روابط کو بین الریاستی رابطوں کے روایتی طریقوں سے آگے بڑھنا ہو گا۔"(۶۵)

"چین شناسی" کے بعد اسی سلسلے کی ایک اور کتاب بعنوان "چین از چیئرمین ماؤ تا غربت مکاؤ" شائع ہوئی۔ اس کتاب کو پیش کرنے میں ڈاکٹر عبدالواحد تونسوی اور پروفیسر طاہر نعیم ملک کا بنیادی کردار ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں کمیونسٹ پارٹی کا سیاسی فلسفہ، جماعت کا انتظامی ڈھانچہ اور فیصلہ سازی کے امور، تخفیفِ غربت اور پارٹی پالیسی، عوامی فلاح و بہبود پر مرکوز فلسفہ اور موجودہ صدر شی

چنگ پنگ کا کردار شامل ہیں۔(۶۶) کتاب میں خاص طور پر چینی حکومت کے اس اہم ترین ہدف کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کے تحت چینی حکومت نے بین الاقوامی اداروں کی جانب سے دیئے گئے وقت سے پہلے ہی غربت جیسی عفریت کو اپنے سماج سے نکال باہر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک انتہائی درجے کی شاندار کامیابی ہے جو فی زمانہ پاکستان سمیت ہر ترقی پذیر ملک کے لیے روشن مشعل راہ ہے۔

۲۰۲۲ء میں چینی مصنف مائی جیا کے ناول DECODED کا ترجمہ محمد عاصم بٹ نے "افشائے راز" کے نام سے کیا، جسے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے شائع کیا۔ اس ناول میں خفیہ نگاری کے رموز اوراس سے وابستہ افراد کی زندگیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک نابغہ روزگار خفیہ نگار ہے جس کی پیغامات کی رمز کشائی کی اہلیت انتہائی ناقابلِ یقین ہے اور پڑھنے والے کو حیران کر دیتی ہیں۔ مجموعی طور پر اردو ادب کے قارئین کے لیے یہ ایک خوب صورت ادبی مرقع ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی سرپرستی میں چینی ادب کی سو کتب کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے پراجیکٹ کے تحت ۲۰۲۴ء میں معروف چینی ناول نگارہ شیاؤ ہونگ کا مقبول ناول "دریائے ہولن کی کہانیاں" شائع ہوا۔ اس ناول کے مترجم کا نام انعام ندیم ہے، جو اس سے قبل بھی عالمی ادب کے کئی ایک تراجم کر چکے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ناول چینی ادبی روایت میں ایک سنگِ میل کے طور پر اپنا مقام رکھتا ہے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے اصلاح جیسے نظریات کی مباحث ہمارے ادب کی طرح چینی سماج میں بھی ہوتی رہی ہیں۔ چین اور جاپان کے درمیان لڑی جانے والی دوسری جنگ کے بعد ادبی منظر نامے پر اس بات کی شدت کو محسوس کیا گیا کہ ادباء کو اس جارحیت کے خلاف ادب کی تخلیق پر زور دینا چاہیے۔ مگر شیاؤ ہونگ نے اس امر سے متفق نہ ہوتے ہوئے ادب کو جمالیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے مقبول بیانئے کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے معافی الضمیر کو اپنے ناول میں پیش کیا۔ یہ ناول دراصل شیاؤ ہونگ کی زندگی کی اُن یادوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں دریائے ہولن کے آس پاس ذہن نشین کیں۔ نامساعد حالات، والدہ کی وفات اور پھر والد کی جانب سے زبردستی شادی طے کرنے جیسے ناخوش گوار تجربوں سے زندگی کے ابتدائی برس شیاؤ لنگ کے لیے کسی ڈرانے خواب سے کم نہ تھے۔ ناول نگارہ نے چینی ادب کو نئے رجحان سے متعارف کرواتے ہوئے ادبی منظر نامے کو اپنے دوررس اثرات سے متاثر کیا۔ بلاشبہ

اس ناول کا اردو ترجمہ چینی تہذیب و تمدن سے آگاہی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور ثقافتی ہم آہنگی کے قیام میں مدد و معاون ہے۔

تھانگ عہد کی شعری روایت سے روشناس کروانے والی ایک اہم کتاب "۱۰۱ چینی نظمیں" ۲۰۲۴ء میں ڈاکٹر صفدر علی شاہ نے پیش کی۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تھانگ عہد میں لڑی جانے والی جنگوں کے بارے میں انسانی احساسات کو پیش کیا گیا ہے۔ مستقل جنگی ماحول کے باعث انسانی سماج میں پیدا ہونے والے المیوں کو بہت عمدگی سے شعری آہنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

چین اور اہلِ چین کے بارے میں اردو زبان میں ترجمہ ہونے والی جن کتب کی روایت کو گزشتہ اوراق میں پیش کیا گیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پاکستان اور چین کے مابین جو دوطرفہ تعلقات دیگر شعبوں میں انتہائی مثالی ہیں۔ تجارتی، سفارتی، دفاعی اور بین الاقوامی امور میں دونوں اقوام کے مابین روز بروز بڑھتا تعاون اقوام عالم کے لیے ایک زبردست مثال ہے۔ تاہم ادبی حوالے سے اب بھی کافی گنجائش موجود ہے۔ اگرچہ گزشتہ چند برسوں میں تراجم کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے جو کہ حوصلہ افزاء ہے، تاہم اس تسلسل کو برقرار رکھنے اور مزید گرم جوشی پیدا کرنے کی غرض سے سرکاری سطح کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی حلقوں میں بھی تراجم کی رفتار کو مزید تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔

ج۔ ترجمہ نگاری اور تہذیبی ثقافتی اشتراک

ترجمہ کاری کا عمل بنیادی طور پر کسی ایک زبان کا علمی یا ادبی متن کسی دوسری زبان میں اس غرض سے منتقل کرنا ہے کہ جس کی بدولت دونوں زبانوں کے حاملین یکساں استفادہ حاصل کر سکیں۔ متن کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کے عمل کو اول اول ترجمہ نگاری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم اب اس عمل کے لیے جو اصطلاح رائج ہے اسے "ترجمہ کاری" کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ترجمہ کاری کے عمل کو سرانجام دینے والا شخص مترجم کہلاتا ہے۔

ابتدائی طور پر مذہبی تعلیمات کو عام کرنے کی غرض سے اس عمل کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ ایک ہی عقیدے کے حامل مختلف زبانیں بولنے والے افراد کے لیے مذہبی تعلیمات کو قابلِ فہم بنایا جا سکے، بعد ازاں اس میں ترقی یافتہ اقوام کی زبانوں کے علم و ادب اور افکار و خیالات سے استفادے کی غرض سے بھی

خاطر خواہ توجہ کی گئی۔ عملِ ترجمہ سے تجارتی یا مالی منفعت کا حصول ممکن بنانے کی طرف بہت بعد میں توجہ مبذول ہوئی۔ تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد کے مابین ترجمہ ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے اور اس کی بدولت عالمی سطح پر ایک انسان دوست سماج کی تشکیل کا ماحول پیدا ہونے کی جانب پیش رفت ہوتی ہے۔

> "ترجمہ تخلیق مکرر ہے۔ یہ تیسرے درجے کا عمل یا کام نہیں ہو سکتا، ہاں مترجم پہلے، دوسرے یا تیسرے درجے کا ہو سکتا ہے۔ اور یہ درجہ بندی تو تخلیق، تحقیق اور تنقید میں بھی بہر طور موجود ہے۔ ایک تیسرے درجے کے مترجم کی وجہ سے ترجمے کو کسی طور تیسرے درجے کی سرگرمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ترجمہ جہاں تخلیق میں وسعت اور تحقیق میں معاونت کا فریضہ ادا کرتا ہے وہیں لسانی حدود کے پھیلاؤ میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ نئی لفظیات اور اصطلاحات سے زبانوں کو ثروت مند بناتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تہذیبوں کے درمیان رابطے اور مکالمے کا ذریعہ بنتا ہے۔"[۶۷]

ترجمے کا عمل اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی زبانوں کی تاریخ قدیم ہے۔ ترجمہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔ تاہم ترجمے کے معیار کے حوالے سے مباحث اٹھائی جاتی رہی ہیں۔ جن میں بسا اوقات باوجوہ ایسا تاثر بھی قائم ہوتا ہے کہ شاید یہ ایک ناقص عمل ہے۔ بنیادی طور پر ترجمے کے عمل پر ہونے والے اعتراضات دراصل ان تراجم پر ہیں جو اس فن سے نابلد ہو کر کیے گئے ہیں۔ ترجمہ کاری کے ناقدین کا قطعی طور پر یہ مقصد ہوتا ہے کہ ترجمے کو اصل متن سے قریب تر اور ہم آہنگ کیا جائے۔ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے کہ کسی متن کا ترجمہ کرتے ہوئے کوئی مترجم محض لکیر کا فقیر بن کر الفاظ کو لغوی ترتیب سے دوسری زبان میں منتقل کر دے۔ بد قسمتی سے ترجمہ کاری کے اس انتہائی اہم عمل کو بسا اوقات لاپروائی اور عجلت میں اس طرح سر انجام دیا جاتا ہے کہ جس کے باعث اس اہم علمی سرگرمی پر بے جا اعتراضات اٹھانے کی نوبت آتی ہے۔ بہرحال یہ ایک اہم علمی کاوش ہے جسے کسی بھی طور کم تر اور دوسرے درجے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا حامد بیگ ترجمے کی روایت کے بارے میں بجا طور پر لکھتے ہیں کہ:-

> "ترجمہ عملِ خیر ہے جو ہمیشہ امن و آشتی، نسلِ انسانی کی فکری تربیت، زبان و بیان میں بڑھوتری اور علوم و فنون میں اضافے کا باعث بنا، جب کہ شروع دن سے عملِ ترجمہ کو

گناہ تصور کیا گیا اور مترجم کو قدم قدم پر شدید مشقت کے بدلے میں صرف و محض حقارت نصیب ہوئی۔۔۔خود ہمارے ہاں نذیر احمد دہلوی کے بامحاورہ "ترجمہ قرآن" کے بعد ان سے عالمانہ مذہبی تقدس چھن گیا۔"(۶۸)

ایک صاحب طرز ادیب جس انداز میں اپنی تخلیقی کاوش سے زبان کے دامن کو وسیع کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے وہیں ایک مترجم بھی اپنے ترجمے میں تخلیقی شان کا بے مثال مظاہرہ کر سکتا ہے۔اس کے لیے بنیادی شرط زبان پر دسترس اور اعلیٰ درجے کی مہارت ہے۔مترجم کا کام کسی بھی طور تخلیق سے کم تر نہیں ہے۔امریکہ میں ترجمہ کاری کے لیے (Recreation) کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے، جو اس بات کی وضاحت ہے کہ ترجمہ بھی ایک اہم ادبی سرگرمی ہے۔تراجم میں مسائل کا ہونا ایک حد تک ناگزیر بھی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ کسی ایک زبان میں لکھا گیا متن اپنے سماج اور تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔جب کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہو، وہاں تہذیبی و سماجی اقدار قدرے مختلف ہونا ایک فطری امر ہے۔عمومی طور پر نثری متون کے برعکس شعری متون کے تراجم میں بسا اوقات سنگین سقم راہ پا جاتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ مترجم کی کوتاہ اندیشی اور الفاظ کے ثقافتی مفاہیم سے عدم واقفیت ہے۔زبان کسی بھی خیال کے اظہار کے بہت سے ذرائع میں سے صرف ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے۔دنیا کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ترجمہ کاری کی اس روایت سے تہذیبی اشتراک کا عمل آگے بڑھ رہا ہے۔اردو زبان کی ترویج و ترقی میں دیگر زبانوں کا حصہ بقدر جثہ موجود ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ باقاعدہ تراجم کی صورت میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی ہے جو لسانی اشتراک کو مزید ترقی دینے کا باعث بن رہی ہے۔

"اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے مثلاً "ادبی تراجم نے نئی اسالیبِ بیان کو جنم دیا، نئے طرزِ احساس کو ابھارا، نئی فکری نہج عطا کی، پیرایہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرائیہ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔نیز یہ کہ ادب کو نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ اس اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔"(۶۹)

عمومی طور پر ترجمے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ اول الذکر میں متن کا لفظی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ جملوں کی نحوی ترتیب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایسے تراجم عام طور پر قاری کے لیے بسا اوقات دشواری کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ زبان کے ثقافتی تناظر سے عدم واقفیت ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر زبان اپنے سماج کی اقدار سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جو قدر ایک سماج میں قابلِ قبول ہو، وہی روش کسی دوسری تہذیب کا حاملین کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ ایک ہی قسم کے حالات و واقعات پر مختلف سماج ایک دوسرے سے جداگانہ طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ترجمے کی دوسری قسم تخلیقی یا ادبی ترجمہ کہلاتی ہے۔ ترجمہ کاری کے اس عمل میں مترجم دونوں زبانوں کے ماہرِ زبان کے طور پر ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں اس اہتمام سے منتقل کرتا ہے کہ اس میں اصل متن بھی ترجمہ ہو کر سامنے آجاتا ہے اور ساتھ ساتھ متن کی ادبی شان کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ترجمے کا عمل اقوامِ عالم کے مابین افہام و تفہیم کو ممکن بناتا ہے۔ اس سے عالمی سطح پر پُر امن بقائے باہمی کے دیرینہ خواب کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ اب تک علمی دنیا میں جس قدر ترقی ممکن ہوئی ہے، اس میں ترجمے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ترجمہ محض کسی ایک زبان کے الفاظ بدل کر کسی دوسری زبان کے الفاظ رکھنے کا نام نہیں ہے بل کہ یہ ایک تہذیب کے مظاہر کو دوسری تہذیب میں منتقل کرنے کے مترادف ہے۔ ہر زبان اپنا ایک مخصوص تہذیبی و ثقافتی مزاج رکھتی ہے۔ سو اس اعتبار سے ترجمہ دو تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین ایک پل کا کردار ادا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

تہذیبوں کے مابین مکالمے کا تصور واضح طور پر امریکی دانش ور سیموئیل ہنٹنگٹن کی معروف کتاب "Clash of the Civilization and the Making of the New World Order" "تہذیبوں کا تصادم اور نئے عالمی نظام کی تشکیلِ نو" کے ردِ عمل میں سامنے آیا۔ تاہم اس کے نقوش اس سے بہت پہلے ابھر چکے تھے۔ تہذیبی مکالمے کی اصطلاح کو سب سے پہلے آسٹریا کے ایک مفکر ہینس کوچلر Hans Kochler نے ۱۹۷۲ء میں استعمال کیا۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو کو ایک خط لکھ کر مختلف تہذیبوں کے مابین مذاکرے کی ضرورت پر زور دیا۔ جسے جمہوریہ سینیگال کے صدرِ مملکت لیوپولڈ سیڈر نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کروا کر ممکن بنایا۔[۷۰] ۱۹۷۷ء میں فرانسیسی مفکر راجر گراڈے

Roger Garadfy نے فرانسیسی زبان میں Les Dialogue des Civilizations کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ جس سے تہذیبوں کے مابین مکالمے کے نظریئے کو باقاعدہ طور پر پیش ہونے میں مدد میسر آئی۔ اس نظریئے کے پیش گزاروں میں جن شخصیات کا نام لیا جاتا ہے، اُن میں اسلامی جمہوریہ ایران کے سابق صدر سیّد محمد خاتمی کا نام بھی نمایاں ہے۔ انہی کی تجویز پر ۴ نومبر ۱۹۹۸ء کو اقوامِ متحدہ نے سال ۲۰۰۱ء کو عالمی سطح پر تہذیبوں کے مابین مکالمے کے سال کے طور پر منانے کا باضابطہ اعلان کیا۔ اس دوران دنیا کے مختلف ممالک میں تہذیبوں کے مابین اشتراکِ عمل پیدا کرنے کے بارے میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمینارز کا انعقاد کیا گیا۔ ایرانی صدر کا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں خطاب کا ایک اقتباس اس بارے میں واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان مکالمہ انسانیت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اساسی اہمیت کا حامل ہے:-

> "میں اسلامی جمہوریہ ایران کی طرف سے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ پہلے قدم کے طور پر ۲۰۰۱ء کے سال کو اقوامِ متحدہ کی طرف سے تمدنوں کے درمیان مکالمے کے سال کے طور پر نامزد کیا جائے، اس توقع کے ساتھ کہ اس مکالمے کے ذریعے عالمگیر آزادی اور انصاف کے حصول کے لیے ضروری قدم اٹھ سکیں گے۔ اس صدی کے اعلیٰ ترین ارمغانوں میں مکالمے کی ضرورت اور اہمیت تسلیم کیا جانا، بالادستی کے اصول کی ممانعت، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی میدانوں میں افہام و تفہیم کی ترویج اور آزادی، انصاف اور انسانی حقوق کی بنیادوں کا استحکام شامل ہیں۔"[۷۱]

تہذیبوں کے مابین مکالمے کا نظریہ اپنی بنیاد کے اعتبار سے کسی ردِ عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بین الثقافتی ہم آہنگی پر یقین رکھتا ہے۔ سماجی ہم آہنگی دراصل سماجی انصاف سے جڑا ہوا تصور ہے اور ایسا صرف معاشرہ کے تمام طبقات کے مابین باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ فن ترجمہ سماجی خلیج کو پاٹنے اور معاشرہ و سماج کے ہر طبقے کو بنیادی حقوق کے شعور سے آگاہ کرتے ہوئے سماجی ترقی کے نئے در وا کرتا ہے۔ فکری حوالے سے ''سماجی ہم آہنگی'' کا تصور سیاسی و سماجی جہت کا حامل ہے۔ دنیا کی ہر ثقافت اور اسکے زمانی

مظاہر میں سماجی ہم آہنگی کا ایک مخصوص تناظر اور بیانیہ پایا جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بیانیے کی تشکیل ان مختلف النوع عناصر سے ہوتی ہے جو کسی مخصوص سماج کا تانا بانا تشکیل دیتے ہیں۔

ستمبر ۲۰۰۱ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دہشت گردی کے واقعے کے بعد دنیا میں ہر طرف خوف وہراس کی فضا پیدا ہو گئی۔ اسی ماحول میں تہذیبوں کے مابین تصادم کے نظریئے نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ مغربی دنیا میں امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے پیش کردہ بیانئے کو بنیاد بنا کر ایک ایسا ماحول قائم کر دیا گیا جس میں جنگ اور طاقت کے استعمال کو ہر مسئلے کا حل قرار دیا گیا۔ ایسے میں سفارتی اور سیاسی حلقوں سے تہذیبوں کے مابین مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

تہذیبوں کے مابین مکالمے کا تصور اس نظریئے کے باقاعدہ طور پر رائج ہونے سے بہت پہلے ہی موجود تھا۔ در حقیقت تہذیبیں ایک دوسرے پر اثرات ڈالتی اور قبول کرتی رہتی ہیں۔ انسانیت کی بنیادی خصوصیت ہے کہ یہ مدنی الطبع ہے۔ اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ یونانی مفکر ارسطو نے کہا تھا کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ تہذیب کا ارتقاء دراصل انسان کی تاریخ ہی کا سفر ہے۔ آج انسانیت جس انداز میں گزر بسر کر رہی ہے وہ مسلسل تہذیبی ورثے کی منتقلی کے باعث ممکن ہوا ہے۔ آج تک کی معلوم تاریخ میں بہت سی تہذیبوں کا ارتقاء ہوا۔ کچھ تہذیبیں وقت کے ساتھ ساتھ گردشِ زمانہ کی دھول میں معدوم ہوتے ہوتے صفحہء ہستی سے مٹ گئیں۔ تاہم جو تہذیبیں آنے والے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے آگے بڑھتی رہیں، ان کی بقاء کا سفر جاری رہا۔ یوں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی کی فضا قائم کرتے ہوئے انسانیت آگے سے آگے بڑھتی رہی۔ تاریخی اعتبار سے تہذیبوں کے مابین مکالمے کا تصور مختلف ادوار میں بتدریج پروان چڑھتے ہوئے سامنے آیا، جسے سمجھنے کے لیے ماضی قریب میں علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر پیش آنے والے حالات و اقعات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔[۴۲] ڈاکٹر ناصر عباس نئیر اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ ترجمہ ایک تہذیب کا دوسری تہذیب سے مکالمہ ہے۔ مترجم دو تہذیبوں کے درمیان 'ترجمان' کا کردار ادا کرتا اور دونوں کے درمیان اس مغائرت کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے جو زبان اور دوسری ثقافتی اوضاع کی وجہ سے موجود ہوتی ہے۔ مثال کہ طور پر یہ ترجمان اپنی یا دوسری تہذیب کے ان بہترین حاصلات کا انتخاب کرتا ہے، جن کے بارے میں وہ یقین رکھتا ہے

کہ انھیں انسانی تہذیب کا مشترکہ ورثہ بنایا جاسکتا ہے۔ مشترکہ انسانی تہذیب کا خواب اگر کسی طور پورا ہوسکتا ہے تو فقط ترجمے کے ذریعے۔ مگر یہ مثالی صورت ہر جگہ موجود نہیں ہوتی، خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں ترجمے کی روایت اپنا آغاز ہی ان قوتوں کے زیر اثر کرے جو نئے خیالات کے ذریعے اجارہ واقتدار چاہتی ہوں۔ اس صورت میں ایک تہذیب دوسری تہذیب سے مکالمہ نہیں کرتی، اس پر نافذ ہوتی ہے۔ اردو میں انگریزی شاعری کے ترجمے کی روایت اپنے آغاز کے سلسلے میں کچھ ایسی ہی کہانی سناتی ہے۔ اس کہانی کا ایک اہم واقعہ میراجی کے تراجم ہیں جو اس میں ایک نیا موڑ لاتے ہیں۔

تہذیبوں کے مابین مکالمے کا پس منظر نہایت قدیم اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جب سے سقراط نے اساسی ثقافتی مسائل کی تفہیم کی روش کے لیے تمدنوں کے مابین گفت گو کا دروازہ کھولا اور انسان کی پہچان کے لیے "مفاہمہ" کو موضوع بنایا تو انسانی معاشروں میں ایک تغیر وجود میں آیا۔ اس عمل سے سرزمینِ یونان معاشی افکار کا گہوارہ بن گئی۔ اس کے بعد ایرنی، ہندی اور ماوراء النہر اور مصر کی تہذیبوں سے گفت گو کے نتیجے میں روم اور یورپی تمدن کو اساس میسر آئی۔

بیسویں صدی عیسوی میں عالمی منظر نامے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کی تباہ کاریوں نے کرہِ ارض پر انسانیت کی کسمپرسی اور بے چارگی کا پردہ فاش کر دیا۔ لاکھوں انسانوں کو جنگی جنون کے باعث لقمہ اجل بنایا گیا۔ امنِ عالم کو قائم کرنے کی خواہش کو کمزوری سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ بر سرِ پیکار اقوام اور ممالک کے باہمی تعلقات میں مکالمے کے بجائے مجادلے کو دخل تھا۔ امن پسند سفارتی حلقوں کی کوششوں سے لیگ آف نیشن جیسے عالمی ادارے کے قیام سے اس بات کی امید پیدا ہوئی تھی کہ آئندہ انسانیت عالمی جنگ جیسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوگی۔ تاہم امن کی خواہش محض خواہش ہی ثابت ہوئی اور اِسی صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز میں ہی دوسری عالمی جنگ کا بگل بجادیا گیا۔ جدید ٹیکنالوجی اور بھاری بھر کم عسکری وسائل سے لیس متحارب گروہوں نے انسانیت سوز مظالم ڈھاتے ہوئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ستم بالائے ستم جوہری ہتھیاروں کے استعمال نے اس جنگ کو فیصلہ کن بنا کر امنِ عالم کی خوب درگت بنائی گئی۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد عالمی تشکیلِ نو کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں دنیا غیر اعلانیہ سرد جنگ کی لپیٹ میں آگئی۔ بین الاقوامی سطح پر نظامِ سرمایہ داری کی حلیف قوتیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی

قیادت میں اپنے نظامِ فکر و عمل کے فروغ میں کمر بستہ ہو گئیں۔ جب کہ دوسری جانب اشتراکی فکر و فلسفے کے تحت سویت یونین کی سربراہی میں سوشلسٹ بلاک کو متحرک کر دیا گیا۔ اقوامِ عالم کو غیر محسوس انداز میں مجبور کر دیا گیا کہ وہ کسی ایک بلاک سے منسلک ہو کر آئندہ کی عالمی بساط میں اپنے کردار کو منظم کریں۔ عالمی طاقتوں سے لاتعلق رہنے والے ممالک پر مبنی غیر جانبدار تحریک (Non Allied Movement) کا وجود بہر حال موجود رہا، تاہم وہ کسی فیصلہ کن حیثیت کو قائم کرنے میں سرگرداں ہی رہی۔ المختصر بیسویں صدی کا بیشتر دورانیہ جنگی جنون کی زد میں رہا۔

بادی النظر میں ۱۹۴۵ء میں اقوامِ متحدہ کا قیام ایک بڑی کامیابی سے کم نہ تھا۔ اس ادارے کے قیام سے امن پسند سیاسی و سفارتی حلقوں میں امید پیدا ہوئی کہ بین الاقوامی برادری اپنے باہمی تنازعات اس پلیٹ فارم پر حل کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔ اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کے صوابدیدی اختیارات کی حامل طاقت ور اقوام کے اس اختیار کے باعث ٹکراو کی کیفیت برقرار رہی۔ متحارب اقوام کے وسیع تر قومی و علاقائی مفاد کے باعث تناؤ کی کیفیت سرحدوں سے نکل کر تہذیبوں کے دائرے تک پھیل گئی۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی بلاک کی باہمی رقابت کے باوجود اقوامِ متحدہ تنظیم پر دنیا کے بیشتر ممالک نے اپنے اعتماد کا اظہار کر کے بین الاقوامی امن اور ہم آہنگی کے قیام کی جانب پیش رفت کا آغاز کیا۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سرد جنگ اپنے انجام سے دوچار ہوتے ہی نئی عالمی تشکیل کا بگل بجنے لگا۔ طاقت کے دو مراکز کے بجائے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بلاشرکتِ غیرے واحد عالمی طاقت کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایسے میں فرانسس فوکویاما نے عالمی سطح پر مغربی سیاسی طرزِ جمہوریت کی برتری کا تصور دیا۔ بعد ازاں سیموئیل ہنٹنگٹن Samuel Huntington نے اپنی شہرہ آفاق کتاب " تہذیبوں کا تصادم اور نئے عالمی نظام کی تشکیلِ نو" "Clash of the Civilization and the Making of the New World Oder". شائع کی۔ اس کتاب میں درج مباحث سے اس بات کی جانب توجہ دلائی گئی کہ مغربی تہذیب دنیا کی معاصر تہذیبوں پر سبقت کی حامل ہے، جب کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں جنم لینے والے تنازعات کی نوعیت تہذیبی ہو گی۔ بین الاقوامی سطح پر ہونے والی چپقلش جس بنیاد پر استوار ہو گی وہ

سیاسی یا معاشی نوعیت کے بجائے تہذیب کی بنیاد پر ہو گی۔ آئندہ دنیا میں مختلف اقوام کے درمیان ٹکراؤ اس بنیاد پر ہو گا کہ وہ اپنی اپنی تہذیب کی برتری کے لیے کوشاں ہوں گے۔ اس بارے ہینٹنگٹن کا کہنا ہے:-

"آج کی دنیا میں جو اہم ترین اور خطرناک جنگیں چھڑ سکتی ہیں وہ معاشی حوالے سے غریب یا امیر طبقوں کے درمیان نہیں بلکہ مختلف ثقافتوں کے لوگوں کے درمیان ہو سکتی ہیں۔ تہذیبوں کے اندر قبائلی اور نسلی جھگڑے واقع ہوں گے۔ اس کے علاوہ مختلف تہذیبوں کی ریاستوں اور گروہوں میں جنگیں ہونے کا امکان ہے۔"(۷۳)

تہذیبی ٹکراؤ کا جو تصور سیموئیل ہنٹنگٹن نے پیش کیا اس میں مغربی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ اسلامی تہذیب کو قرار دیا گیا۔ حیران کن طور پر چینی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی حلیف تہذیب کے طور پر پیش کرتے ہوئے مغربی تہذیب کا مخالف قرار دیا گیا۔ تہذیبوں کے مابین اس ٹکراؤ کی کیفیت کے اس نظریئے کو علمی، سفارتی وسیاسی حلقوں میں ملے جلے رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ مغرب کی جانب جھکاؤ رکھنے والے اہل علم نے اس کی زبردست پذیرائی کی اور دنیا میں مغرب کے سیاسی غلبے کا ڈھول خوب پیٹا۔ تاہم اس کے برعکس تہذیبوں کے ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت اور مکالمے کی ضرورت پر بھی اہلِ علم ودانش کے ایک بڑے حلقے نے توجہ دلائی۔ بین الثقافتی ہم آہنگی کا تصور بنیادی طور پر مختلف ثقافتوں کے مابین مکالمے کا ہی نتیجہ ہے۔ مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں اسی صورت میں ایک دوسرے کے قریب آسکتی ہیں جب ان کے درمیان بات چیت کا سلسلہ جاری ہوا ہو۔ تہذیبی تصادم کے بجائے تہذیبی تعاون اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے جب مختلف تہذیبوں کے حاملین اپنے مافی الضمیر سے دوسروں کو آگاہ کریں گے۔ گویا تہذیبی مکالمہ پر امن بقائے باہمی اور محفوظ مستقبل کی جانب پیش رفت کرنے میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ تراجم کا عمل انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا بھرپور ذریعہ ہے۔ انسان جو رنگوں، زبانوں، جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہے۔ ترجمے کے ذریعے ایک غیر مانوس زبان کو اپنی زبان کے حروف تہجی میں ڈھالنے سے انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل ہو تا ہے۔ عام طور پر ہمارا غیر ملکی دنیا سے تعلق صحافتی اور اخباری سطح پر ہوتا ہے۔ یہ معلوماتی طور پر افادی تو ضرور

ہے، لیکن وہاں کے جمہور کے مزاج، تمدن اور زندگی کے ذہنی وجذباتی رنگ و آہنگ کی خبر یہ نہیں دیتا۔ چنانچہ انسانوں کا ارد گرد کی دنیا سے جذباتی اور ذہنی سطح پر سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ترجمہ ہی ایک وسیلہ ہے جو محض خبر ہی کا ذریعہ نہیں بنتا، بلکہ انسانوں میں اشتراک کا قرینہ بھی پیدا کرتا ہے۔ زبان کی توسیع، تمدن کے تعارف، انسانی کائنات کی دریافت اور تاریخ سے واقفیت کے لئے ترجمہ ہی سب سے اہم ذریعہ ہے۔ ترجمے کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہر سال ۳۰ ستمبر کو "ترجمے کے عالمی دن" کے طور پر منایا جاتا ہے۔

تہذیبوں کے درمیان مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی کا تصور بتدریج پروان چڑھا۔ اول اول اسے سیاسی اور سفارتی حلقوں میں بحث کا موضوع بنایا گیا۔ انسانی سماج میں اس نظریئے نے دیگر طبقات اور اداروں کو بھی متاثر کیا۔ ادب بنیادی طور پر سماج ہی کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ ایسے میں ادبی تحریروں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے۔ قدیم ادباء کے متون پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں بھی تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اہمیت کا واضح احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رضا مصطفوی اپنے مضمون "تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان گفتگو کی اصلیت" میں یوں رقم طراز ہیں:۔

> "آج کی پُر آشوب دنیا میں ضروری ہے کہ تمدنوں اور ثقافتوں کے درمیان گفتگو کی راہ کھولنے کے لیے حالات اور ماحول فراہم کیا جائے تاکہ حقیقی افہام و تفہیم کچھ اس طرح سے وجود میں آئے کہ کم از کم قوموں کے حقوق کی بنیاد پر امن قائم ہو اور دنیا کے کسی بھی حصے میں انسانوں کے مصائب و آلام دنیا کے دوسرے تمام لوگوں سے مخفی و پوشیدہ نہ رہیں اور تمدنوں کے درمیان گفتگو کے داعی شیخ سعدی رح کے اس سدا بہار پیغام کی صدائے بازگشت ہمیشہ اہل عالم کے کانوں میں گونجتی رہے:
>
> بنی آدم اعضای یک پیکرند
> کہ در آفرینش زیک گوہرند
>
> بنی نوع انسان ایک ہی بدن کے اعضاء ہیں کیونکہ وہ تخلیق اور پیدائش میں ایک ہی گوہر سے ہیں۔"(۴۷)

بالخصوص ترجمہ نگاری کے شعبے میں اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ عالمی رہنماؤں نے جب دنیا میں قیامِ امن کے لیے کوششوں کا آغاز کیا تو ادیبوں نے اس کی زبردست پذیرائی کی۔ فارسی سمیت السنہ شرقیہ کے

گراں مایہ ادبی آثار اور خزینے افہام و تفہیم اور گفت گو کے متعلق بیانات سے بھرے ہوئے ہیں۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی شخصیت اہلِ مشرق کے ایک عظیم مفکر اور مدبر کے طور پر مسلمہ ہے۔ افکارِ اقبال میں اس حقیقت کی واضح طور پر نقاب کشائی ہوتی ہے کہ اقبال مختلف تہذیبوں کے مابین مکالمے کے زبردست حامی رہے ہیں۔ اگر وہ کسی تمدن پر تنقید کرتے ہیں تو اس کی بنیادیہی تصور ہوتا ہے کہ کوئی تہذیب کسی دوسری تہذیب کو محض طاقت کے بل بوتے پر مغلوب کرنے کی استحقاق نہیں رکھتی۔ ڈاکٹر فتح محمد ملک اپنے ایک مضمون میں اس بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "اقبال نے دنیائے عجم کی گم شدہ تہذیبی وحدت کی بازیافت کی خاطر فارسی شاعری کا آغاز کیا اور 'پیغامِ مشرق' کے ذریعے مشرق اور مغرب کے درمیان اس گفتگو کا دروازہ پھر سے کھول دیا جو گوئٹے اور اس کے معاصرین کے بعد بند ہو کر رہ گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گفتگوئے تمدن کا نیا سلسلہ اقبال ہی کی روایت کی توسیع ہے۔ اقبال نے اگر ایک طرف مشرق و مغرب کے مابین مکالمہ کی روایت کو تازہ کیا تو دوسری جانب 'جاوید نامہ' میں ظہورِ اسلام سے بیشتر کی مغربی تہذیبوں سے بھی راہ و رسم پیدا کی۔ مہاتما بدھ، زرتشت، وشوامتر اور کتنی ہی دیگر مقدس ہستیاں 'جاوید نامہ' میں محو گفتگو نظر آتی ہیں۔"(۷۵)

ترجمہ اصلاً تہذیبی و ثقافتی مکالمہ ہے جو نہ صرف لسانی تنوع کو اجاگر کرتا ہے، بلکہ افکار و نظریات کے باہم تبادلہ کے ذریعے ملکی سالمیت کا باعث اور سماجی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر عمل ترجمہ پہلو دار اہمیت کا حامل ہے۔ ترجمہ کا عمل تہذیبوں، قوموں اور ثقافتوں کے مابین رواداری اور برداشت کو فروغ دیتے ہوئے انسانیت کے تقدس کو بحال کرتا ہے۔ سماجی ترقی کا شعور ہی قوم کو کئی ممکنات سے ہمکنار کرتا ہے۔ نسل انسانی کو باہمی افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کی جتنی آج ضرورت ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ سماجی ہم آہنگی کے کئی ذرائع ہیں۔ ترجمہ لسانی تعصب کو ختم کرتے ہوئے مختلف قومیتوں میں باہمی اتحاد و ہم آہنگی کی فضا کو پروان چڑھاتا ہے۔ پاکستان جیسے کثیر اللسانی مُلک میں ہم آہنگی، برداشت اور رواداری کے جذبات کو مہمیز کرنے کے لئے علوم ترجمہ اور ترجمہ نگاری کا فروغ لازم ہے۔ علمی تراجم کی باضابطہ اور مربوط تحریک سماجی ہم آہنگی کے لئے

ناگزیر ہے۔ نسل انسانی کے افکار و نظریات میں تنوع نظام ہستی کی خوبصورتی کا مظہر ہے۔ انسان بذات خود ایک تہذیبی وجود ہے۔ ایک اجتماعی وجود کی تشکیل کے لئے انفرادی طور پر انسانی کاوشیں لازم ہیں۔ علمی و ادبی تراجم تہذیب و ثقافت کی باہمی تفہیم اور سماجی حدود کی وسعت میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے انسان دوستی کا درس دیتے ہیں۔ انسانی تہذیب کے ارتقاء میں وحدت و تنوع کے مظہر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

تہذیبوں کے مابین مکالمے کی وسیع بحث کو سمیٹا جائے تو اسے مختصرا" یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک انسانی پکار ہے، جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ انسانیت کی سرشت میں رائے کلی یعنی مل جل کر رہنے کا جو وصف رکھا گیا، وہ دنیا کی تمام تہذیبوں کو اس امر پر قائل کرتا ہے کہ وہ اپنے ارتقاء کے عمل کو جاری ساری رکھنا چاہتے ہیں تو آپس میں مکالمے کا عام کریں۔ اسی صورت میں تہذیبیں اپنی بقاء کے ساتھ ساتھ انسانیت کی بقاء کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ وگرنہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

حوالہ جات

۱۔ عابد حسین سیال، ڈاکٹر، چینی ادب کے اردو تراجم: تہذیبی مکالمے کی ایک صورت، امتزاج ۱۸
۲۔ جمیل الدین عالی، (دیباچہ) ایک وارڈن کی ڈائری (چینی کہانیاں) انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء
۳۔ جیمز فرانسس کارکرن، تاریخ ممالکِ چین، جلد اول، مطبع پادری تھامس، کلکتہ، ۱۸۴۸ء
۴۔ جیمز فرانسس کارکرن، تاریخ ممالکِ چین، جلد دوم، ناشر ٹھاکر اسپنگ اینڈ کو کولکتہ، انڈیا، ۱۸۵۲ء، سرورق
۵۔ لارڈ الیگن، تاریخ چین و جاپان، مطبع منشی نول کشور، کلکتہ، ۱۸۷۶ء
۶۔ محمد شفیع الدین خان، چین و چینی، شمس المطابع پریس، مراد آباد، ۱۹۸۷ء
۷۔ چینی اور جاپانی افسانے، عبد القادر سروری، (مرتبہ)، انجمن امداد باہمی، مطبع مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، ۱۹۳۰ء
۸۔ چودھری فتح الدین، چین کی کہانی، ناشر منشی گلاب سنگ اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۳۴ء
۹۔ بدر الدین چینی، چینی مسلمان، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء
۱۰۔ بدر الدین چینی، چین و عرب کے تعلقات اور ان کے نتائج، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۴۸ء
۱۱۔ سید اسد علی انوری، (مترجم) تمہید مشمولہ صحیفہ چین، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۷ء، ص ۵
۱۲۔ تمنائی، زندی چین: جدید چینی کہانیاں، نیا سنسار کتاب گھر، بانکی پور، پٹنہ، ۱۹۴۱ء
۱۳۔ میر عابد علی خان، دیباچہ مشمولہ مشاہیر چین، حیدر آباد دکن، سیاسیہ ۱۹۴۴ء، ص ۹
۱۴۔ اسرار احمد آزاد، سرخ چین کا رہنما، پروگریسیو پرنٹرز اینڈ پبلشرز، دہلی، ۱۹۴۴ء، ص ۲۳۳
۱۵۔ ظ انصاری (مترجم)، چینی گاؤں، تیئن چن، کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۵۰ء
۱۶۔ ظ انصاری (مترجم) زلفوں کے سائے میں، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۵۳ء
۱۷۔ ظ انصاری (مترجم) چین کی بہترین کہانیاں، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۴ء ص ۲۲
۱۸۔ عادل رشید، چین کی شہزادی، انڈین پرنٹنگ ورکس، نئی دہلی، ۱۹۵۸ء
۱۹۔ ابن انشاء، چینی نظمیں، لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۰ء، ص ۷
۲۰۔ ابراہیم جلیس، نئی دیوارِ چین، (سفر نامہ) برکت پریس، کراچی، ۱۹۵۸ء
۲۱۔ کوثر نیازی، ایک ہفتہ چین میں، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۵ء ص ۴۴-۴۵
۲۲۔ چوچائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، مترجمین محمد سلیم خاں، گوپال متل، محمد سلیمان صابر، نیشنل اکاڈمی، دہلی، ۱۹۶۶ء

۲۳۔ ڈیوڈلو، گوپال متل (مترجم) چین میں اسلام کا ماضی اور حال"، نیشنل اکاڈمی، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۵-۶
۲۴۔ جمیل الدین عالی، ابتدائیہ، چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۷
۲۵۔ شفیع عقیل، (مترجم)، پہلی بات (دیباچہ) چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲
۲۶۔ رشید بٹ، (مترجم)، لاوشہہ، قہوہ خانہ، (فلیپ)، غیر ملکی کتابوں کا اشاعت گھر بیجنگ، ۱۹۸۳
۲۷۔ یحیٰی امجد (مترجم) پیش لفظ مشمولہ چینی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۸
۲۸۔ حامد ہاشمی، (مترجم) پھوای شہنشاہ سے شہری تک، (آپ بیتی) فلیپ، غیر ملکی کتابوں کا اشاعت گھر، بیجنگ، ۱۹۸۵ء، ص ۲
۲۹۔ آنسہ کوثر جمال، چین میں اردو، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء ص ۱۰
۳۰۔ بہجت شبیر، (مترجم) طلسمی پرندہ، چینی لوک کہانیاں، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء ص ۴
۳۱۔ تابش صدیقی (مترجم) چین کے مسلمان مختصر تاریخ، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء
۳۲۔ چین کے مشہور ادیب اور شاعر، یوان وئے شوئے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶، ص
۳۳۔ شمیم اکرام الحق، (مترجم) داور قبیلے کے قصے، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء ص ۲۹-۳۰
۳۴۔ انور غالب، (مترجم)، ادھورے مرد، ژانگ زیان لیانگ، مشعل، لاہور، ۱۹۹۶، ص ۶
۳۵۔ کوثر جمال، ڈاکٹر، پریم چند اور لوشن کے پسندیدہ موضوعات، (مشمولہ) سہ ماہی ادبیات، بین الاقوامی نمبر ۴، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ص ۶۴۲
۳۶۔ توصیف تبسم، ڈاکٹر، بادِ شمال، (تبصرہ)، مشمولہ گلبانگِ وفا، انتخاب عالم، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵
۳۷۔ احفاظ الرحمن، (مترجم) سورج نکل رہا ہے، از انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ص ط
۳۸۔ جمیل الدین عالی، (دیباچہ) ایک وارڈن کی ڈائری، مترجمہ احفاظ الرحمن، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ص و
۳۹۔ یوان وئے شوئے، نظمیں، خطاطی اور محبت- پاکستان کیلئے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص (ix)
۴۰۔ یاسر جواد، (مترجم) مکالماتِ کنفیوشس، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
۴۱۔ آفتاب اقبال شمیم، (دیباچہ) چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲-۱۳

۴۲۔ افتخار عارف، (دیباچہ) چین کا ادب (قدیم و جدید فکشن سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۵-۶

۴۳۔ یان ون چینگ (دیباچہ)، ایک کتاب میں تین کہانیاں مترجمہ احفاظ الرحمن، فرید پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۷-۸

۴۴۔ عابد میر، (مترجم)، جنگی حکمت عملی اور اس کا تحقیقی جائزہ، گوشۂ ادب، کوئٹہ، (بار سوم) ۲۰۱۱ء، ص ۲۰

۴۵۔ محمد اسلم جنجوعہ، چین پرامن تعمیر و ترقی کی نئی شاہراہیں، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۱ء

۴۶۔ رشید بٹ (مترجم) چین کی بہترین قدیم حکایتیں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء،

۴۷۔ ایس ایم حالی، چین کی کامیابیوں کی کہانی، رومی اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

۴۸۔ منیر فیاض، (مترجم)، معاصر چینی افسانے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء،

۴۹۔ شی چنگ پنگ، چین کی طرزِ حکمرانی، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء

۵۰۔ ناصر عباس نیّر، (ابتدائیہ) چین میں سائنس فکشن، مترجمہ عابد سیال، ڈاکٹر، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸ء ص ۷

۵۱۔ رشید بٹ (مترجم) ایہہ کیو کی سچی کہانی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹

۵۲۔ رشید بٹ (مترجم)، مغربی جھیل کی لوک کہانیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۳۔ رشید بٹ (مترجم)، مینڈک گھڑ سوار، (بہترین چینی لوک کہانیاں)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء،

۵۴۔ رشید بٹ (مترجم)، سورج کی تلاش، (منتخب چینی لوک کہانیاں)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۰۹

۵۵۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، سنکیانگ نامہ، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء

۵۶۔ لین یو تانگ، جینے کی اہمیت، مختار صدیقی (مترجم) نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱

۵۷۔ سید فراست شاہ، مشرق کو ذرا دیکھ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۶

۵۸۔ خالد فتح محمد، (مترجم) پاگل آدمی کی ڈائری (چینی کہانیاں)، از لوشون، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۹

۵۹۔ عابد حسین سیال، ڈاکٹر، (مترجم) غم کے محاذ پر، از چھویو آن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۴۲

۶۰۔ ایس ایم حالی، چینی کمیونسٹ پارٹی کے سو سال، رومی اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۲۱ ص xxi

۶۱۔ محمد امین، ڈاکٹر، کنفیوشس اور چین کی ثقافت۔ ایک تعارف، بکس اینڈ ریڈرز ملتان، ۲۰۲۱ء، ص ۱۳

۶۲۔ ظہور احمد،(مترجم)، تعارف، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۲۲

۶۳۔ یاسر جواد،(مترجم) فاہیان کا سفر نامہ ہند، تخلیقات، لاہور، ص ۲۰۲۲ء، ص ۷

۶۴۔ یاسر جواد،(مترجم) ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند، تخلیقات، لاہور، ص ۲۰۲۲ء، ص ۸

۶۵۔ محمد جعفر، میجر جنرل (ر)،(دیباچہ)، چین شناسی، مرتبہ عبدالواحد تونسوی، ڈاکٹر، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۰

۶۶۔ عبدالواحد تونسوی، ڈاکٹر، طاہر نعیم ملک، پروفیسر، چین از چیئرمین ماؤ تا غربت مکاؤ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء

۶۷۔ عامر ظہیر، ڈاکٹر، چینی زبانیں اور لسانی ورثہ، (مضمون)، مشمولہ چین شناسی، مرتب عبدالواحد تونسوی / چانگ وے سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۸۲

۶۸۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، (دیباچہ)، فنِ ترجمہ نگاری، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۷

۶۹۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو ترجمے کی روایت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۸

70- https://en.wikipedia.org/ 16 Nov, 2023 10:00 PM

۷۱۔ سید محمد خاتمی، اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب، مترجم مرتضیٰ موسوی، مشمولہ پیغام آشنا، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۹

72-Mohamad Zain, Dialogue among Civilazations, International Journal of Publication and Social Studies, Vol 2 No 1, 2017 page 34

۷۳۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، مترجمہ محمد احسن بٹ، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۱۵

۷۴۔ رضا مصطفوی، ڈاکٹر، تمدنوں اور ثقافتوں کے درمیان گفتگو کی اصلیت، مشمولہ مجلہ پیغام آشنا، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳

۷۵۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، اپنے آپ سے گفتگو، مشمولہ مجلہ پیغام آشنا، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء ص ۴۲

باب دوم:

پاک چین دوستی: پس منظر اور پیش منظر

الف: عہدِ قدیم میں چین اور پاکستان کے باہمی تعلقات (بین المذہبی اور بین الثقافتی تناظر)

قدیم چین اور برعظیم پاک و ہند کے مابین صدیوں سے وسیع البنیاد باہمی تعلقات قائم رہے ہیں۔ دوطرفہ روابط کا یہ سلسلہ باہمی اعتماد اور بھروسے کی بنیاد پر دونوں خطوں میں بسنے والے عوام کے لیے باعثِ خیر و عافیت رہا ہے۔ چینی تہذیب کم و بیش سات ہزار سال قبل دریائے زرد اور اس کے آس پاس پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چینی تہذیب ایک ایسی تہذیب ہے جس نے بڑی حد تک بیرونی اثرات سے خود کو لاتعلق رکھ کر اپنے ارتقاء کی منازل کو طے کیا ہے۔[1] چند ایک مستثنیات سے قطع نظر، تاریخی طور پر کسی بھی دور میں ایسے شواہد میسر نہیں آتے جس سے کسی بیرونی طاقت یا کسی گروہ کی جانب سے چین پر یلغار کر کے براہِ راست اپنا دستِ نگر بنایا ہو۔ تاہم یہ تاثر درست نہیں کہ قدیم چین بیرونی دنیا سے کٹا ہوا کوئی خطہ ارضی رہا ہے۔ دراصل چین میں جب بیرونی عوامل نے اثر انداز ہونے کی کوشش کی، انہیں اہلِ چین نے اپنے سماج سے ہم آہنگ ہو کر ہی اپنے اندر جذب کیا ہے۔

قدیم چین اور برعظیم پاک و ہند کے درمیان بین المذہبی اور بین الثقافتی باہمی تعلقات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور غیر معمولی اہمیت دلوانے میں جس زمینی راستے نے کلیدی کردار ادا کیا اسے شاہراہ ریشم کہا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی شاہراہ تھی جو چین سے شروع ہو کر قدیم سلطنتِ روما تک جاتی تھی۔ اس راستے میں بے شمار شہر، قصبے اور بازار بھی تھے، جہاں ملبوسات، زرعی اجناس، طلائی زیورات سمیت انواع و اقسام کی بے شمار چیزیں میسر تھیں۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں، صحراؤں اور بیابانوں سے گزرتی یہ شاہراہ اپنے عہد کی بین الاقوامی تجارت کا اہم ترین وسیلہ تھی۔ اس شاہراہ کو سلک روٹ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس شاہراہ کو یہ نام جرمنی کے ایک محقق اور جغرافیہ دان بیرن وان ریچ ٹیفن BARON VON RICHTHAFEN نے دیا۔[۲] قدیم زمانے میں رومی امراء اپنے لباس کو ریشم کے کپڑے سے تیار کروانا پسند کرتے تھے۔ جب کہ ریشم کے کپڑے کے حصول کے لیے اسی شاہراہ کے تاجروں کی خدمات لی جاتی

تھیں۔ ریشم کی مانگ میں غیر معمولی اضافے کے باعث اس اہم تجارتی گزر گاہ کو شاہراہِ ریشم کے نام سے تعبیر کیا جانے لگا۔

"چین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے ریشم کے کیڑے کاشت کیے اور ریشم سے کپڑا تیار کرنا شروع کیا۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق چین نے ۵۰۰۰ سے ۶۰۰۰ سال قبل نیو لیتھک (Neolithic) دور سے ریشم بنانا شروع کیا ہے۔ ۳۰۰۰ سال پہلے تک قدیم چین میں سیری کلچر اور ریشم کی بناوٹ پہلے ہی نمایاں طور پر تیار کی جا چکی تھی۔"[۳]

تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ عام مسافر، عسکری اہلکار اور مذہبی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والے مبلغین کی بھی ایک بڑی تعداد شاہراہِ ریشم کے اسی راستے سے چین میں وارد ہوئی۔ یوں شاہراہ ریشم کی بدولت مختلف تہذیبوں سے وابستہ لوگوں میں مکالمے کی صورت پیدا ہوئی۔

"سلک روٹ صرف تجارت کا نام نہیں، مادی ترقی کا نام نہیں۔ یہ ایک تہذیب، تمدن اور ثقافت کا نام ہے۔ سلک روٹ اور اس کی شاخوں کے راستوں سے دنیا کے بڑے مذاہب اس خطے میں پہنچے۔ سلک روٹ نے ایک دوسرے کو اپنی تہذیب، کلچر، علم و عرفان اور فنونِ لطیفہ سے روشناس کیا جن کی وجہ سے مشرق اور مغرب پر دوررس اثرات پڑے۔ یہی خصوصیات سلک روٹ کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتی ہیں اور عالموں اور محققوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔"[۴]

جغرافیائی حالات میں تغیر، دریاؤں کے رخ میں غیر معمولی تبدیلی اور نت نئی جدت کے باعث شاہراہِ ریشم کی یہ اہم تجارتی گزر گاہ اپنی وہ گہما گہمی برقرار نہ رکھ پائی اور رفتہ رفتہ دیگر راستوں سے تجارتی سرگرمیاں سرانجام دی جانے لگیں۔ تاہم موجودہ چینی قیادت کی دور اندیش اور باریک بین قیادت نے روڈ اینڈ بیلٹ منصوبے کی بدولت اس کی نئی جہت کو پیش کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

چین میں مذہب کے اثر و نفوذ کی بحث انتہائی منفرد اور دل چسپ ہے۔ قدیم چین کی تاریخ میں بدھ مت، تاؤ مت اور کنفیوشس ازم کا کردار بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان تینوں مذاہب کے بانیان کا تعلق چھٹی صدی قبل مسیح سے ہے۔ جب کہ اسلام کا ظہور چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ کنفیوشس ازم اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی باقاعدہ مذہب نہیں ہے بل کہ اخلاقی تعلیمات پر مبنی ایک ایسا

مجموعہ ہے جس میں مابعد الطبعیات کا کوئی قابل ذکر پہلو موجود نہیں ہے۔بدھ مت کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی۔ جب کہ چین کے علاقوں میں اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک زمانے میں اسے چین کے ریاستی مذہب کی حیثیت بھی حاصل رہی۔ اس کے باوجود اہلِ چین کا اپنی ثقافتی اقدار سے جڑے رہنا اظہر من الشمس ہے۔فائیان اور ہیون سانگ کے اصل بدھی تعلیمات تک رسائی کی غرض سے ہندوستان کا طویل اور پُر خطر سفر اس حقیقت کا عکاس ہے کہ چین کا باشعور طبقہ مثبت بیرونی اثرات کو قبول کرنے میں بے جالیت ولیل سے کام نہیں لیتا۔ جب کہ اس کے برعکس ہندوستان پر بیرونی اثرات کی ایک منفرد تاریخ ہے جو دراوڑوں پر آریاؤں کے حملے سے شروع ہو کر ہندوستان پر بالترتیب منگول، افغان اور یورپی اقوام کے تسلط پر محیط ہے۔اسی پس منظر میں سرزمینِ چین کی تاریخ اور تہذیب سے واقفیت فراہم کرانے والی کتاب "چین شناسی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

> "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ چینیوں کے لیے پاکستان ایک مقدس سرزمین ہے جو کبھی گندھارا کی تہذیب کی شکل میں بدھ مت کا مرکز رہی۔ یہ تہذیب پاکستان کے جن علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی ان میں بلاشبہ پشاور، مردان، سوات، مانسہرہ، ٹیکسلا اور پوٹھوہار کے خطے شامل ہیں۔بدھ مت کے نظریات اور عقائد نے لگ بھگ دو ہزار سال کے دوران چینی ثقافت کو مختلف شعبوں میں متاثر کیے رکھا۔ جن سے چین کے خطے میں فن، سیاست، ادب، فلسفہ، طب اور ثقافت میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔"(۵)

چین میں جن مذاہب نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ان میں بدھ مت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔بدھ مت کے بانی مہاتما بدھا تھے، جن کا اصل نام سدھارتھ تھا۔ آپ ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کم سنی سے ہی روایتی کھیل تماشوں سے جی بہلانے کے بجائے غور و فکر میں مصروف رہتے تھے۔ نوجوانی میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ دنیا کی ناپائیداری اور بے رغبتی کے باعث لذاتِ نفسانی سے بے زار تھے۔اپنے خاندانی جاہ و حشم کو خیر باد کہہ کر آفاقی سچائی کی تلاش میں جنگلوں اور ویرانوں کا رخ کیا۔ تپسیا اور گہرے تدبر کے بعد بالآخر نروان حاصل کیا اور مخلوق کو وعظ و نصیحت کرنے کی غرض سے بستیوں کا رخ کیا

۔مہاتمابدھ کی زندگی میں ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کے نظریات وافکار کو اختیار کر لیا۔ ہندوستان سے باہر چین میں بدھ مت کی تعلیمات کو عام کرنے میں بھکشوؤں نے اہم کردار ادا کیا۔ڈاکٹر عبدالواحد کی مرتبہ کتاب اس بارے میں یوں رہنمائی کرتی ہے:-

> "بدھ مت کا چین میں پھیلاؤ ہان سلطنت کے دور میں بھارتی بدھ راہبوں کی بدولت ممکن ہوا اور اسے چینی ثقافت میں ضم ہونے میں قریبا" ایک صدی کا وقت لگا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہان سلطنت کے دوران چین میں بدھ مت کو متعارف کروایا گیا۔ اس کے بعد چین میں بدھ مت کی سب سے نمایاں شاخ "مہایانا بدھ مت" نے چینی تہذیب میں اہم کردار ادا کیا۔"(۶)

ہندوستان سے ایک مذہبی فکر کا چین میں پہنچ کر غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لینا اہم باتوں میں سے ایک خاص بات ہے۔ چین ایک وسیع و عریض علاقے پر پھیلا ہوا ملک ہے۔ یہاں بدھ مت کے ظہور سے قبل بھی ایسی شخصیات موجود رہی ہیں جو اپنے معاشرے کی رہنمائی میں پیش پیش تھیں۔مشاہیر چین کی صلاحیتوں سے مفر ممکن نہیں ہے۔اہل چین قدیم زمانے ہی سے بنیادی ضروریات کی کئی ایک ایجادات کر کے انسانیت کے سامنے اپنے سر کو فخر سے بلند کر چکے تھے۔ ایسے میں بدیسی فکر و فلسفے کو قبول کرنا اور اس نظریئے کو سماجی تشکیل میں مرکزی اہمیت دینا اس امر پر دال ہے کہ چینی لوگ جدت کو قبول کرنے میں غیر ضروری تاخیر کے قائل نہیں ہیں۔بدھ مت کی تبلیغ کا یہ سلسلہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی جاری رہا۔جموں اور کشمیر کی ریاستوں تک اس کے اثرات محسوس کیے گئے۔ خطہ کشمیر کو کشمیرا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس ضمن میں خبے نارمل یونیورسٹی، چین کے دانش ور دائے جیان بِنگ اپنے تحقیقی مقالے میں اشوک اعظم کی اس کام میں دلچسپی کا احوال بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:-

> "اشوکا نے بھکشو مجھنتکا (Mo Chan/ Madhyantika) کو کشمیرا میں بدھ مت کی تبلیغ اور وحشی لونگ قبیلے کے لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجا۔۔۔ فوتھو چھنگ (Fo Tucheng) چین آنے سے پہلے بدھ مت کا مطالعہ کرنے کے لیے کشمیرا گیا تھا۔ کوچا سے ہی کمارا جیوا بھی بدھ مت کا مطالعہ کرنے کے لیے وہاں گیا تھا۔ اسی دور میں کشمیرا کے نامور بھکشو صحیفوں کا ترجمہ کرنے کے لیے چین آئے تھے ان میں سنگھادیوا، سمگھا

بھوتی، بدھایاشس، گناور من، بدھاتراتا شامل تھے۔ چین سے درجنوں لوگ کشمیرا کی جستجو میں کشمیرا گئے جن میں جیمنگ (چوتھی صدی عیسوی-۴۵۳) فایونگ اور ژی یَن شامل تھے۔ ان تمام بدھ بھکشوؤں نے چین اور کشمیرا کے درمیان بدھ مت کے تبادلوں کو براہ راست فروغ دیا۔"(۷)

بدھ مت کی تعلیمات کو ہن دورِ حکومت میں اس وقت سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی جب چینی حکمران خاندان نے مہاتما بدھا کی تعلیمات سے متاثر ہو کر بدھ مت کا عقیدہ اختیار کر لیا۔ اس تبدیلی سے سلطنت کے طول و عرض میں بدھ مت کو قبول کرنے والے افراد کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ ہندوستان میں بدھ مت کا مذہبی لٹریچر بڑی تعداد میں موجود تھا۔ ان کتب کو چینی زبان میں ترجمہ کرنے کی جانب توجہ کی گئی۔ ان تراجم کی بدولت چین کے عوامی حلقوں میں مہاتما بدھا کی تعلیمات پہنچنا شروع ہو گئیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں چین کے بدھ مت پیروکاروں کے کئی مکاتیب وجود میں آچکے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ غیر معتبر اور غیر مستند کتب کی بھرمار تھی۔ اس فکری انتشار سے بچنے کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ہندوستان میں حقیقی بدھ مت کی تعلیمات کی جانب رجوع کیا جائے اور بنیادی نوعیت کی اہم کتب کے چینی تراجم کر کے فکری مغالطے کو دور کیا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جن دو شخصیات کا نام نمایاں ہے ان میں فائیان اور ہیون سانگ شامل ہیں۔

فائیان بنیادی طور پر ایک چینی سیاح تھا۔ ان کی پیدائش ۳۳۷ء میں ہوئی۔ اس نے چوتھی صدی عیسوی میں ہندوستان کا رخ کیا۔ یوں تو ہندوستان میں بدھ مت کے مبلغین کی ایک بڑی تعداد وقتاً فوقتاً چین کا سفر کرتی رہی ہے۔ تاہم فائیان چینی سرزمین سے تعلق رکھنے والا پہلا شخص ہے جس نے مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کا رخ کیا۔ ایک روایت کے مطابق فائیان نے اپنے نو ساتھیوں کے ہمراہ بغیر کسی سواری کے باپیادہ سفر کیا۔ اس نے مہاتما بدھا کی جائے پیدائش سمیت دیگر اہم مقامات اور اس وقت موجود بدھ مت کے رہنماؤں سے بالمشافہ ملاقاتیں کیں۔ اس سفر میں انہوں نے اپنی یادداشتوں کو بھی محفوظ کیا۔ بعد ازاں اس سفر کا احوال بھی سفر نامے کی صورت میں قلم بند ہوا۔ اس چینی سفر نامے کو ہندوستان میں انگریز محققین نے انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ فائیان کے سفر نامے کا پہلا انگریزی ترجمہ ہربرٹ اے گیلیز

(Herbart A. Giles) نے ۱۸۷۷ء میں کیا۔ بعد ازاں ۱۸۸۶ء میں ایک اور انگریز مترجم جیمز لیگی (James Legge) نے اس سفر نامے کا ترجمہ کیا۔ فی زمانہ اس سفر نامے کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ سفر نامے قدیم ہندوستان اور چین کے مابین مذہبی اشتراک کے ایک اہم عنصر کا ثبوت ہے۔اس سفر نامے کے مترجم یاسر جواد دیباچے میں لکھتے ہیں:-

> "فائیان نے چینیوں کو بدھ مت کی بنیادی کتب فراہم کرنے کی خاطر برفیلے پہاڑوں، سنگلاخ چٹانوں، کھلے میدانوں، بڑے بڑے شہروں، جنگلوں، سمندروں میں سفر کیااور جن علاقوں سے گزرا وہاں کا حال مختصراً" پیش کیا۔ اس سفر نامے سے شارحین نے مقامات کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ہر اہم لفظ کے پیچھے موجود تصور کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی نیز روایات کی بھی تفسیر کی گئی۔ چنانچہ یہ سفر نامہ اور اس کے حاشیے پانچویں صدی کے ہندوستان کا سماجی، مذہبی، جغرافیائی، تہذیبی اور کچھ حد تک معاشی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ تکونیاتی (Cosmologic) وضاحتیں بالخصوص دلچسپ ہیں۔"(۸)

فائیان نے ہندوستان میں لگ بھگ دس برس قیام کیا۔ اس دوران اس نے یہاں کی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ معاشرت کا بھی بغور مشاہدہ کیا۔ بدھ مت کے اہم علمی مراکز ٹیکسلا اور ایودھیا سے بطور خاص استفادہ کیا۔ایک تحقیق کے مطابق اس وقت ہندوستان میں چندر گپت وکرامدھیا(چندر گپت دوم) کی حکومت تھی۔فائیان کے خیال کے مطابق اس وقت ہندوستان ایک خوش حال اور پرامن ملک تھا۔یوں فائیان کے اس سفر نامے کی بدولت ہمیں ایک غیر جانب دار شخص کی رائے بھی میسر آتی ہے کہ بیرونی دنیا کے لوگ ہندوستان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

فائیان کے اس مذہبی جوش وجذبے کو آنے والے دور میں جس شخصیت نے ایک نئے انداز میں آگے بڑھایا، انہیں تاریخ میں ہیون سانگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ہیون سانگ کی پیدائش ۶۰۲ء میں ہوئی۔ اپنے خاندان کے افراد کی مانند وہ بھی بدھ مت کی تعلیمات کا دل وجان سے قائل تھا۔بدھی علمی ذخیرے بالخصوص فائیان کے کام سے خوب استفادہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ چین میں بدھ مت کی تعلیمات کے احیاء

کے لیے ابھی مزید تحقیقی کاوش کی اشد ضرورت ہے۔ فائیان کے مخطوطات کی غلط تفسیر و تعبیر کے باعث اہلِ علم کے ہاں بہت سے امور باعثِ نزاع تھے۔ ہیون سانگ نے اس مسائل کے یقینی حل تک پہنچنے کی جستجو میں ہندوستان کا رخ کیا۔ ۶۲۹ء میں ہندوستان کا سفر شروع کیا اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں اور پر خطر ویرانوں سے گزرتے ہوئے آخر کار وہ ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یاسر جواد اسی بنیاد پر اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "کسی اور ملک میں کبھی کوئی اور ایسا سیاح نہیں پیدا ہوا، جس نے چینی سیاح کی مانند دور دراز علاقوں میں سفر صعوبتیں برداشت کی ہوں اگرچہ اس کا مقصد مذہبی نوعیت کا تھا، لیکن اپنے دیکھے ہوئے علاقوں کو بیان کرنے میں اس کی باریک بینی اور عرق ریزی یقینا" قابلِ ستائش ہے۔"[۹]

قدیم چین اور موجودہ پاکستان کے چند علاقوں کے درمیان بدھ مت کے فروغ کی ایک باقاعدہ تاریخ ہے جس سے اس حقیقت کی واضح طور پر نقاب کشائی ہوتی ہے کہ دونوں خطوں کے درمیان باہمی تعلقات کی نوعیت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ماہرین نے بدھ مت کی تعلیمات کے چین میں نفوذ کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اس درجہ بندی سے پورے ماحول اور منظر نامے کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ بدھ مت کے پھیلاؤ کے تناظر میں پاک چین تاریخی تعلقات کا پہلا دور تیسری صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوا جب یہاں کشان سلطنت کا طوطی بولتا تھا۔ اس سلطنت کے حکمرانوں نے موجودہ پشاور اور ٹیکسلا کے علاقوں کو اپنا پایہ تخت بنایا ہوا تھا۔ ٹیکسلا میں بدھ مت کی تعلیمات کا ایک بڑا مرکز یا مذہبی خانقاہ موجود تھی، جہاں سے مذہبی تعلیم و تربیت کا سلسلہ چلایا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر اسی مرکز کے زیر اثر چین اور اس کے ملحقہ ممالک تک بدھ مت کی تعلیمات کو عام کرنے کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ چین میں مقدس مذہبی متون کا عوامی زبان میں ترجمہ نہ ہونے کے باعث تفہیم و تعبیر کے مسائل کا پیدا ہونا پہلے دور کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔

بدھ مت کی تبلیغ کے تناظر میں دونوں خطوں کی تاریخ کے دوسرے دور کو مذہبی متون کے تراجم کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ تاریخ اعتبار سے یہ دور چوتھی سے پانچویں صدی عیسوی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اسی زمانے میں چینی راہب فاہیان نے چین سے سفر کا آغاز کیا اور ہندوستان میں بدھی لٹریچر کے حصول اور درست

ترجمے کے کام کا آغاز کیا۔ مقامی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتے ہی اس کام بیڑا اٹھایا گیا۔ اس ضمن میں گو وَیالنگ، رین شوئے مئے اور مظہر عالم کا تحقیقی مقالہ بعنوان "قدیم پاکستان اور چین کے درمیان بدھ مت تبادلوں کے تین ادوار" بہت خاصے کی چیز ہے جس میں بہت عرق ریزی سے اس تاریخ کا زندہ کیا گیا ہے:-

> "چین اور پاکستان کے بیچ بدھ مت کے تبادلوں کی دوسری لہر میں چینی راہب بدھ مت کے عقائد کی جستجو میں مغرب کی طرف نکلے جب کہ قدیم پاکستانی راہب اپنے نظریات پیش کرنے کے لیے چین آنے لگے۔ چینی طلباء نے پاکستانی اساتذہ کی طرف سے زبانی پڑھائے گئے بدھ مت کے صحیفوں کو تحریری شکل دی جس نے قدیم پاکستان کی ثقافت کو تقویت بخشی اور محفوظ کیا۔ لہذا بدھ مت کی یک طرفہ ترسیل آہستہ آہستہ دوطرفہ ابلاغ میں تبدیل ہو گئی۔"(۱۰)

موجودہ پاکستان کے قدیم بدھی مراکز سے قدیم چین میں نفوذ کا تیسرا دور چھٹی سے ساتویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں بدھ مت کی تعلیمات بڑے موثر انداز میں چین میں پھیل رہی تھیں۔ اسی بنیاد پر اس دور کو چین میں بدھ مت کے عروج سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بدھ مت کی مزید تفہیمی و تشریحی کتب کو چینی زبان میں منتقل کرنے کا اہم ترین کام بھی اسی دور میں ہوا۔ یہی وہ دور تھا جس میں بدھ مت کی تعلیمات میں علماء کے طبقے میں اختلافِ رائے بھی پیدا ہو گیا۔ جس کے باعث تفرقہ بازی کا ماحول پیدا ہو رہا تھا۔ اسی صورت حال میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اصل ماخذات کی جانب توجہ کر کے ان اختلافات کا حل تلاش کیا جائے۔ بہر حال اس پیش رفت سے بدھ مت کی تعلیمات چینی تاریخ میں اپنے عروج کی حد تک مقبول ہوئیں۔ بعض شواہد کے مطابق چین میں بدھی تعلیمات کو اتنی پذیرائی اور مقبولیت میسر آئی کہ ہندوستان کے راہب یہاں آنے والے چینی راہبوں کو تبلیغی مساعی پر دادِ تحسین دینے پر مجبور ہو گئے۔ ان تمام کوششوں سے مختلف تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور رابطے کی کئی ایک نوعیتیں پیدا ہوئیں۔ اسی اہم پیش رفت کی جانب توجہ دلاتے ہوئے فاضل مصنفین یوں رقم طراز ہیں:-

"چین اور پاکستان کے درمیان بدھ مت کے تبادلوں نے دونوں ثقافتوں کے درمیان خلیج کو کم کر دیا اور دونوں تہذیبوں کے درمیان متعدد مکالموں کا باعث بنا ہے۔ چین میں متعارف کروائے گئے بدھ مت کا چینی فلسفے، ثقافت، آرٹ، ادب موسیقی اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ چینی راہبوں نے چینی ثقافت کو پھیلانے کے لیے قدیم پاکستان کا سفر کیا۔۔۔ان تبادلوں سے دونوں ممالک کے عوام کو قریب آنے کا موقع ملا۔ چین اور پاکستان کے درمیان موجودہ قریبی تعلقات کی صدیوں پرانی تاریخ ہے جو دونوں ممالک کی عوام کے درمیان باہمی اعتماد اور مشترکہ افہام و تفہیم کی بنیاد ہے۔"(۱۱)

ثقافتی طور پر چین اور پاکستان کے درمیان کئی ایک امور مشترک ہیں۔ دونوں ممالک کے عوام بنیادی طور پر مذہبی تعلیمات کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اختیار کیے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں ان روایات کو آگے بڑھانے میں متحرک ہیں۔ خاندانی طور طریقوں میں بزرگوں کی اہمیت کو دونوں ممالک میں بنیادی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ خاندان کے بزرگ افراد بالخصوص والدین کو چینی عوام بہت اہمیت دیتے ہیں۔ احترامِ انسانیت کا رویہ ہر دو اقوام میں یکساں طور پر مشترک ہے۔ قدیم چینی روایات میں انسانوں کے چار اہم تعلقات پر زور دیا گیا ہے جن میں والدین اور اولاد کے تعلقات، زوجین کے معاملات، بھائی کے بھائی سے تعلقات اور آخری درجے میں ریاست اور شہری کے مثالی تعلقات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

مذہبی تہواروں کو پاکستان اور چین میں روایتی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ ثقافتی تقریبات جیسے جشنِ بہاراں اور بسنت کو پاکستانی اور چینی عوام بڑی خوش دلی سے مناتے ہیں۔ موسمِ بہار اور موسمِ خزاں کے روایتی تہوار چینی سماج میں بہت اہتمام سے منائے جاتے ہیں۔ چینی قمری سال کے آغاز پر جو تہوار منایا جاتا ہے اسے موسمِ بہار کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ اس تہوار کے موقع پر ملک کے طول و عرض میں زور و شور سے تیاریاں کی جاتی ہیں۔ بیرون ملک یا دوسرے شہروں میں مقیم چینی اس تہوار کے موقع پر اپنے والدین کے پاس جانا نیک شگون تصور کرتے ہیں۔ اس تہوار کو بطریق احسن منانے کے لیے ایک ہفتے کی تعطیلات دی جاتی ہیں۔

پاکستان اور چین کے درمیان بین المذہبی اشتراکات کے حوالے سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کنفیوشس اور اسلام کی تعلیمات میں بے شمار اشتراکات موجود ہیں۔ ہر دو مذاہب کے مابین قدرِ اشتراک کی بہت سی مثالیں ہیں۔ چین کے مقبول مذہبی فلسفے کنفیوشس ازم میں خاندانی نظام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ والدین کی خدمت کو اولاد کے لیے سعادت مندی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ دین اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے۔ پاکستان میں پچانوے فیصد سے زائد عوام دینِ اسلام کے پیروکار ہیں۔ دین اسلام میں بھی خاص طور پر خاندانی نظام پر زور دیا گیا ہے۔ نکاح جیسے مقدس رشتے سے معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کا ادارہ تشکیل پاتا ہے۔ خاندانی نظام کو مضبوط بنانے کے لیے جہاں والدین پر اپنی اولاد کی نشوونما اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہیں اولاد کو بھی اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بھی والدین کی خدمت کا فریضہ مذہبی جوش و جذبے اور عقیدت و احترام سے سرانجام دیں۔ بزرگوں کا ادب اور ان کے آرام و آسائش کا حکم اسلامی تعلیمات میں بھی بڑی شدومد سے آیا ہے۔

چین میں اسلام کے ظہور کی ایک منفرد تاریخ ہے۔ اس بارے میں ایک روایت بہت دلچسپ ہے جس کے مطابق پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ہی چین میں مسلمان تاجروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ تاہم دستیاب دستاویزی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانۂ خلافت میں باقاعدہ طور پر سفارتی روابط کا آغاز ہوا۔ اس بارے میں سید فراست شاہ اپنی کتاب "مشرق کو ذرا دیکھ" میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "چین اور اسلام کا تعلق تقریبا" اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ اسلام کی عمر۔ غالب امکان اس بات کا موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دور ہی میں ان روابط کی ابتدا ہو گئی تھی۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دور میں یقینا" مسلمانوں کی ایک اچھی، بڑی تعداد چین کے مختلف علاقوں میں پہنچی تھی۔ اس بناء پر چین میں ساتویں صدی عیسوی کی ابتداء میں قائم کی گئی مساجد موجود ہیں اور ان میں سے بعض آج بھی آباد ہیں۔ چین کا شہر گوانگ جو (Guangzhou) آج ایک اہم تجارتی مرکز ہونے وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ تاہم مسلمانوں کے لیے اس شہر کی تاریخی حیثیت بھی نہایت اہم

ہے۔ یہ وہ شہر ہے جسے چین کا باب الاسلام کہا جاسکتا ہے، کہ اسی شہر میں رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حیاتِ طیبہ کے دور میں پہلے پہل مسلمانوں نے قدم رکھا۔"[۱۲]

یوں تو اسلام کی آمد سے قبل بھی چین کے بحری جہاز خلیج فارس کے راستے دریائے دجلہ اور فرات تک جایا کرتے تھے۔ بعد ازاں تجاری روابط میں بے پناہ ترقی ہوئی اور مسلمان تاجروں کے حسنِ اخلاق اور مثالی کردار کے باعث چینی عوام میں مسلمانوں کے بارے میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ اس بارے میں چینی مسلمان حاجی ابراہیم ٹی وائی ما کی کتاب "چین کے مسلمان: مختصر تاریخ" بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۸۶ء میں اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب کا ایک اقتباس چین میں مسلمانوں کی آمد کے بارے میں یوں رہنمائی کرتا ہے:-

"تانگ (TANG) خاندان کی سرکاری دستاویزوں اور چن یوین (CHEN YUEN) کی تصنیف "چین میں اسلام کی آمد کا مختصر مطالعہ" کے مطابق اسلام کی چین میں آمد شہنشاہ یونگ ہوئی (YONG HUI) کے عہدِ حکومت کے دوسرے سال میں ہوئی۔ ہجری سن کے مطابق یہ سن ۳۲ ہجری اور سن میلاد کے حساب سے ۶۵۲ء بنتا ہے۔ یہ تاریخ زیادہ قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مطابق خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان بن عفان کے فرستادہ سفیر چین پہنچے۔"[۱۳]

چینی شاہی تاریخ میں چھنگ دورِ حکومت اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے حوالے سے خوئی مسلم علماء کا کردار سامنے آتا ہے۔ اس صف میں معروف خوئی عالم لیؤژی کا کردار تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ لیؤژی ایک سنجیدہ عالم تھے۔ انہوں نے بدھ مت، تاؤازم اور مغربی افکار کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا۔ انہیں اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی، فارسی اور لاطینی زبانوں پر بھی دسترس تھی۔ انہیں چینی مسلم اہلِ علم اور مسلم عوام الناس کے ہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چینی اسلام کا نظریہ پیش کیا اور اسلام کو چینی ثقافت اور حالات سے ہم آہنگ کرنے میں نمایاں کام کیا۔ اس بارے میں خبے نارمل یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اسکالر اپنے تحقیقی مقالے بعنوان "اسلام اور کنفیوشن ازم: لیؤژی" میں اس بارے روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:-

"چین میں اسلام تانگ خاندان کے ابتدائی دور میں آیا۔ اسلام سونگ، یوآن اور مِنگ ادوار میں پھیلتا ہوا چھنگ دور تک کئی صدیوں کا سفر طے کر کے مقامی چینی ثقافت کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کے اثرات سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں جیسے نیویگیشن، جہاز سازی، ملٹری اور کامرس پر بھی پڑے۔ خوئی مسلم سکالرز نے اسلامی تعلیمات کی تشریح چینی زبان میں کی۔ اس دوران بہت سے خوئی کنفیوشن سائنالوجسٹ ابھر کر سامنے آئے۔۔۔ اس دور کے چند سرکردہ خوئی مسلم سکالرز میں چَن سی، خودنگ ژؤ، وانگ دائے یوئی اور ماژؤ شامل ہیں۔ ان مسلمان اسکالرز نے اسلامی عقائد اور چینی روائتی افکار کو یکجا کر کے اجتماعی معاشرتی و ثقافتی مفاد کے حصول کے لیے کام کرنے کی کوشش کی۔ لیوژی نے علمی اور فلسفیانہ سطح پر اسلام کو چینی ثقافت میں ڈھالنے کا کام ایک نئی نہج تک پہنچادیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسلام اور روایتی چینی افکار کے اصولوں میں بہت مماثلت اور باہمی ربط ہے اس لیے دونوں آسانی سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔"[۱۴]

چین عہدِ قدیم ہی سے ایک کثیر المذہبی ملک کے طور پر قائم رہا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کو اگرچہ چین میں ایک اقلیت کی ہی حیثیت حاصل رہی۔ تاہم مسلمانوں کی یہ تعداد ایک موثر اقلیت کے طور پر موجود رہی۔ سماجی سطح پر مسلمانوں کو ان کی صلاحیتوں کے باعث حکومتی ایوانوں میں بھی پذیرائی میسر رہی۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے باعث بسا اوقات محدود مدت کے لیے مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مگر مسلمانوں کے مجموعی مثبت طرزِ عمل کے باعث ایسی سیاسی حکمتِ عملی جلد ہی تبدیل ہو کر مسلمانوں کی موافقت میں بدل جاتی۔ چین میں مسلمانوں کی غیر معمولی اہمیت کا اعتراف مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال "چین میں اسلام کا ماضی اور حال" کے مصنف ڈیوڈلو کی کتاب سے بھی ملتا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ گوپال متل نے کیا۔ بھارت کی نیشنل اکاڈمی، دہلی نے اس کتاب کو ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ اس کتاب میں مترجم کے بیان کے مطابق:-

"اسلام چونکہ ایک تبلیغی مذہب ہے اس لیے جغرافیائی حدود میں کبھی مقید نہیں رہا اور کم و بیش اس نے دنیا کی سبھی قوموں کو متاثر کیا۔ چین پر بھی اسلام کے گہرے اثرات ہیں اور یہ اثرات رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔

مسلمانوں نے چین کو صرف مذہبی اعتبار سے ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ثقافتی سطح پر بھی چین کو ان سے بہت زیادہ فیض پہنچا۔ چین کی سائنسی ترقیات، اس کی حکومتی نظام کی اصلاح اور اس کی عسکری طاقت کا فروغ، ان سب میں مسلمانوں کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ ۔۔ تاریخ میں کئی دور ایسے بھی آئے ہیں جب اکثریت نے ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا اور انہیں کاروبارِ حکومت میں فراخدلی سے شریک کیا۔"(۱۵)

قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی عوامی جمہوریہ چین کا قیام بھی عمل میں آگیا۔ پاک چین باہمی تعلقات کو اس اہم پیش رفت سے بہت تقویت ملی۔ دونوں ممالک اپنے تاریخی ورثے کو محفوظ کرنے اور بہترین مستقبل کی تعمیر میں ابتداء ہی سے متحد ہو گئے۔ دو مختلف ثقافتوں کی حامل ریاستوں کے قیام سے شاندار اور درخشاں روایت کو مزید مضبوط بنانے کے لیے دونوں ممالک کی حکومتوں نے روایتی جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا اور پاک چین ثقافتی تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔

بین المذہبی اور بین الثقافتی تناظر میں چین اور پاکستان کے باہمی تعلقات ایک زریں اور درخشاں مثال کے طور پر موجود ہیں۔ پاک چین دوستی کو پہاڑوں سے بلند، سمندروں سے گہرا اور شہد سے زیادہ میٹھا تصور کیا جاتا ہے۔ اس لازوال دوستی کی بنیاد باہمی احترام اور اعتماد کے رشتے پر استوار ہے۔ پاکستان کا قیام برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی عظیم جدوجہد اور قائد اعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں ممکن ہوا۔ جب کہ دوسری طرف ماؤزے تنگ جیسے عظیم انقلابی رہنما کی قیادت میں یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو تاریخی لانگ مارچ میں کامیابی کے بعد عوامی جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آیا۔ چین اور پاکستان چونکہ ہمسایہ ممالک ہیں اور دونوں ممالک کی ایک طویل سرحد مشترک ہے۔ چین کی آزادی کے ساتھ ہی پاکستان نے چین کو تسلیم کر لیا۔ اسلامی ممالک میں پاکستان پہلا ملک ہے جس نے چین کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات کا آغاز کیا۔ ۲۱ مئی ۱۹۵۱ء کو دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ طور پر سفارتی تعلقات کا آغاز ہوا۔ نوزائیدہ ممالک کے طور پر دونوں ملکوں کی حکومتوں اور عوام کو بے پناہ مسائل اور چیلنجوں کا سامنا تھا۔ چند مشترکہ مسائل میں سرد جنگ کی ریشہ دوانیاں، ہندوستان کے ساتھ دونوں ممالک کے سرحدی تنازعات اور معاشی بحران نمایاں تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی بساط کچھ اس انداز سے بچھائی گئی تھی کہ جس میں

معاشی طور پر کم زور ممالک کے لیے اپنے بنیادی انتظامی ڈھانچے اور عوامی فلاح کے منصوبے شروع کرنے میں بے شمار الجھنیں اور مسائل کھڑے تھے۔

چین اور پاکستان کے درمیان عوامی سطح پر دوستانہ تعلقات کو مزید بہتر بنانے کی غرض سے دونوں ممالک کے درمیان کئی ایک معاہدے ہوئے۔ جن کے تحت دونوں ممالک کے ثقافتی وفود نے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے ممالک کے دورے کئے۔ ان میں صحافی، طلبہ، ادباء اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔ ذرائع ابلاغ کے کردار کو سمجھتے ہوئے دونوں ممالک کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اداروں کے درمیان بھی معاہدات موجود ہیں۔ سربراہان حکومت اور مملکت کے سرکاری دورہ جات کی ایک مثالی تاریخ موجود ہے۔ پاکستان میں ہر دو عسکری اور جمہوری حکومتوں کے ادوار میں باہمی تعلقات مثالی اور گرم جوشی سے بھرپور رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالواحد تونسوی اپنی مرتبہ کتاب "چین شناسی" میں اس تفصیل کے ابتدائی نقوش کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "پیکنگ سے آنے والا پہلا سرکاری وفد نومبر ۱۹۵۵ء میں آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن کی دعوت پر لی تہ چھوان کی قیادت میں خواتین کا خیر سگالی وفد پاکستان تشریف لایا، جس میں سیاسی جماعتوں کے رہنما، مزدور رہنما، صحافی، اراکینِ اسمبلی، فنکار، گلوکار، کھلاڑی، سائنسدان، ماہرینِ تعلیم، مصنفین اور سیاح وغیرہ شامل تھے۔ دونوں ممالک نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۵ء کو ثقافتی معاہدے پر دستخط کیے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخر تک تعلقات مزید مستحکم ہونے کے بعد ۵۴ ارکان پر مشتمل اس پہلے ثقافتی وفد نے جنوری سے فروری ۱۹۶۸ء میں لاہور، پشاور اور ڈھاکہ کا دورہ کیا۔"(۱۶)

چین اور پاکستان کے عوام اور حکومتوں نے نامساعد حالات اور ناموافق ماحول میں بہترین سیاسی بصیرت اور زبردست سفارتی حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ خلوص اور نیک نیتی کی بنیاد پر استوار ہونے والے سفارتی تعلقات نے اس وقت سفارتی دوستی کی شکل اختیار کر لی جب دونوں ممالک نے اپنے سرحدی معاملات کو باہمی افہام و تفہیم سے پر امن طور پر حل کر لیا۔ دونوں ممالک کے سربراہانِ حکومت نے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے ممالک کے دورے کیے۔ یوں بین الاقوامی تعلقاتِ عامہ میں

چین اور پاکستان کی دوستی دن دگنی اور رات چوگنی رفتار سے ترقی کرتی ہوئی ایک زندہ و تابندہ مثال بن کر ابھری۔

پاک چینی دوستی کو علمی بنیادوں پر مضبوط کرنے کی غرض سے تعلیمی و تحقیقی سطح پر ادارہ جاتی تشکیل کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ دونوں ممالک کے اہل علم کے باہمی تجربات اور ثقافتی تبادلوں کو مزید بہتر بنانے کے لیے اور چینی زبان و ثقافت کے فروغ کے لیے چینی حکومت کے تعاون سے پاکستان کی جامعات میں کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ کا قیام ایک اہم ترین پیش رفت ہے۔ اس ضمن میں ۲۰۰۴ء میں دوطرفہ تعلقات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کیمپس میں پاکستان کا پہلا کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کی بدولت پاکستان میں چینی زبان کی موثر تدریس کے لیے معیاری نصاب مرتب کیا گیا۔ تعلیمی اور کاروباری مقاصد کی غرض سے پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد چین کا رخ کرتی ہے۔ ایسے افراد کو چین میں رہ کر بہتر طور پر اپنے امور سرانجام دینے کے لیے چینی زبان سے شدبد ہونی ازبس ضروری ہے۔

اسلام آباد میں قائم کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ کی مقبولیت کے پیشِ نظر ۲۰۱۲ء میں پاکستان کے سب سے بڑے صنعتی و کاروباری شہر کراچی کی عظیم درس گاہ جامعہ کراچی میں بھی اس کا اجراء کر دیا گیا۔ پاکستان میں چینی زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث سکول کی سطح پر بھی چند اداروں میں اس کی تدریس کا اہتمام کیا جانے لگا۔ اس پس منظر میں نوعمر طالب علموں کے لیے معیاری نصاب کی تیاری کی ذمہ داری بھی کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ کے سر تھی۔ ۲۰۱۵ء میں پاکستان کی اعلی تعلیم کی معروف درس گاہ جامعہ فیصل آباد میں بھی اس کی ایک نئی شاخ کا افتتاح کر دیا گیا۔ اس ادارے سے فارغ التحصیل فضلاء چین میں پاک چین دوستی کے سفیر کی حیثیت سے پاکستان کا نام روشن کرنے میں کوشاں ہیں۔

پاکستان اور چین کے مابین مشترکہ ثقافتی تاریخ کے پیشِ نظر اس بات کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا جارہا ہے کہ دونوں ممالک روایتی سفارتی روابط سے بڑھ کر نئی جہتوں کو تلاش کرنا ازحد ضروری ہے۔ اس پس منظر میں تحقیقی و تعلیمی سرگرمیوں کے تناظر میں جامعات کا کلیدی کردار بہت اہم ہے۔ چین میں اردو زبان کی تدریس کے حوالے سے بہت حوصلہ افزاء صورت حال ہے۔ مختلف چینی جامعات میں باقاعدہ طور پر

شعبہ اردو قائم ہیں۔ اردو ادب کے کلاسیکی اور معاصر ادبی فن پاروں کے تراجم کا سلسلہ بھی زور و شور سے جاری ہے۔ جب کہ پاکستان میں بھی چینی زبان سیکھنے کا رجحان ترقی کر رہا ہے۔ کاروباری معاملات اور دو طرفہ تعاون کے منصوبوں میں کام کرنے والے افراد کے علاوہ پاکستانی طالب علموں کی ایک معقول تعداد چینی جامعات میں زیر تعلیم ہے۔ جامعاتی سطح پر ہونے والی اس پیش رفت سے دونوں ممالک کے عوام میں قربت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ضروری ہے کہ دونوں ممالک کے تعلقات کو مزید مضبوط بنانے کے لیے دونوں ممالک کی عوام کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے تاکہ وسیع تر بین المذہبی و بین الثقافتی تناظرات کی موجودگی میں دوستی کے اس سفر کو مزید تیز تر کیا جا سکے۔

ب۔ اردو اور چینی زبان میں باہمی اشتراک کی صورت حال

چینی زبان کا شمار دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے جب کہ اردو زبان کا ایک خاص تہذیبی و ثقافتی پس منظر ہے۔ چینی زبان، زبانوں کے جس گروہ سے تعلق رکھتی ہے اسے زبانوں کا چینی تبتی خاندان کہتے ہیں۔ اس زبان کی نا صرف تاریخ قدیم ہے بل کہ اپنے رسم الخط کے باعث بھی دیگر زبانوں سے منفرد ہے۔ چینی باشندے اپنی زبان کے لیے مختلف نام استعمال کرتے ہیں۔ سب سے مقبول اصطلاح "ہان یو" (بمعنی ہان کی زبان) ہے۔[۱۷] عمومی طور پر دنیا کی اکثر زبانیں دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں کی جانب لکھی جاتی ہیں۔ حیرت انگیز طور پر چینی زبان کو عمودی یعنی اوپر سے نیچے کی جانب لکھا جاتا ہے۔[۱۸] فی زمانہ چینی زبان کو دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب کہ اردو زبان ہند آریائی خاندانِ السنہ سے متعلق ہے، جس کا ایک مخصوص ثقافتی اور تاریخی پس منظر ہے۔ زبانوں کے ہند یورپی خاندان سے تعلق رکھنے والی اردو اور چینی زبان کے مابین بعد طرفین کے باوجود جو اشتراکِ عمل کی جو باہمی سرگرمی موجود ہے، بجا طور پر اسے مثالی کہا جا سکتا ہے۔ ذیل میں دونوں زبانوں کے مابین باہمی اشتراکَ عمل کی جو صورت حال در پیش ہے اس کا اجمالی احوال حسبِ ذیل ہے۔

چین اور پاکستان کے مابین دو طرفہ سفارتی تعلقات کے قیام کے ساتھ ہی اس ضرورت کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ دونوں ممالک کے درمیان پائیدار دوستی کے خوب صورت رشتے کو مزید مضبوط بنانے کے لیے ایک دوسرے کی زبان اور تہذیب و ثقافت کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر چین میں

اردو زبان کی معیاری تدریس کے لیے پیچنگ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا قیام ۱۹۵۴ء میں عمل میں آیا۔ڈاکٹر کوثر جمال نے اس موضوع پر اپنی منفرد کتاب "چین میں اردو" کے نام سے ۱۹۸۶ء میں شائع کی۔ اس کتاب کی بدولت چین میں اردو زبان کے ارتقا کی صورت حال کا صحیح منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اس روایت کی ابتدائی صورت کی وضاحت کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:-

> "چین میں اردو کی باقاعدہ تدریس کا آغاز ستمبر ۱۹۵۴ء میں ہوا، اس سال جامعہ پیچنگ (BEIJING) کے مشرقی زبانوں کے شعبہ میں شعبہء اردو کی بنیاد رکھی گئی اور اسی سال ستمبر میں چینی طلبا کی پہلی جماعت نے یونیورسٹی سے اردو زبان میں چار سالہ ڈگری کورس کا آغاز کیا۔"[۱۹]

عوامی جمہوریہ چین میں اردو زبان کی ترویج و ترقی میں جن اداروں نے کردار ادا کیا ان میں جامعہ پیچنگ کا کردار بلاشبہ مثالی ہے۔ اس ادارے کو چین کے سب سے بڑے علمی اور تاریخی اہمیت کے حامل مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ چینی سماجی و سیاسی منظر نامے پر ابھرنے والی بیشتر تحریکات کے سوتے اسی درس گاہ سے پھوٹتے ہیں۔ چینی مشاہیر کی ایک بڑی تعداد اسی ادارے سے فارغ التحصیل ہے۔ اردو جیسی غیر ملکی زبان کو تدریسی و تحقیقی سطح پر چین میں متعارف کروانے میں اس ادارے کا بنیادی کردار ہے۔ ابتدا میں یہاں اردو زبان کی جانب راغب ہونے والے طالب علم سفارتی خدمات کی بہتر انجام دہی کی غرض سے متوجہ ہوئے۔ تاہم بعد ازاں یہاں صنعت و تجارت سے متعلقہ پیشہ ور افراد بھی بڑی تعداد میں زیرِ تعلیم رہے۔ ابتدا میں اردو زبان کی معیاری تدریس کو ممکن بنانے کے لیے جمہوریہ بھارت سے ماہر اردو مضمون مختار احمد صاحب اور پاکستان سے پروفیسر آفتاب اقبال شمیم صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان اساتذہ کے لیے سب سے اہم چیلنج اردو زبان سے ناواقف مبتدیوں کے لیے مناسب درسی کتب، مطالعاتی مواد اور اردو چینی لغت کی تیاری بنیادی ہدف تھا، جسے ان تھک محنت سے حاصل کر لیا گیا۔ شعبہ اردو کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جلد ہی چین کے ہم سایہ ممالک سے بھی اردو زبان سیکھنے والے سفارتی اہلکار بھی یہاں زیرِ تعلیم ہو گئے۔

اردو زبان کی معیاری تدریس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی نمائندہ تحریروں کا چینی زبان میں ترجمہ کرنے کی روایت کی داغ بیل بھی اسی ادارے میں ڈالی گئی۔ چناں چہ "پاکستان کے مختصر افسانے" کے عنوان سے دو جلدوں پر مشتمل چینی زبان میں ترجمہ پیش کیا گیا۔اسی ادارے کے اساتذہ نے اردو ادب کی تاریخ کے متعلق دو جلدوں پر مشتمل تصنیف مکمل کی۔ اردو ناول اور افسانوں کو بھی خاص اہتمام سے چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو گرائمر کی بہتر تفہیم کے لئے چار کتابوں پر مشتمل کام مکمل کیا گیا۔جب کہ متفرق موضوعات پر ہونا والا کام اس کے علاوہ ہے۔ شعبہ کی پہلی فارغ التحصیل طالبہ جو بعد ازاں صدرِ شعبہ کے منصب پر بھی فائز ہوئیں،اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:-

> "ہم مستقبل میں اردو زبان و ادب پر باقاعدہ اور سائنٹفک طریقے سے تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کی چین میں اس وقت مشرقی زبان و ادب پر تحقیقی کام کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔۔۔علاوہ ازیں ہماری خواہش ہے کہ پاکستان کے علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں کے ساتھ ہمارا رابطہ مزید بڑھے اور دونوں ملکوں کے ادبی سیمیناروں میں دونوں طرف کے ادیب و سکالر شرکت کریں۔"(۲۰)

چینی حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے ادارے "غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر" نے چینی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔یہ ادارہ ۱۹۵۲ء میں قائم کیا گیا۔ تاہم اردو زبان میں کتب کی تیاری اور اشاعت کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ اس ادارے کا مقصد چینی ادبی کتب اور حکومت کی سیاسی و معاشی کامیابیوں کو دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کرنا تھا۔ اردو چوں کہ دنیا کی چند اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہے، اس لیے اس زبان میں چینی کتب کی ایک بڑی تعداد کو منتقل کیا گیا۔ اس ادارے سے وابستہ اہم مترجمین میں زاہد چودھری، احفاظ الرحمن، مظفر رزمی اور نظام صدیقی کے نام نمایاں ہیں۔جب کہ مقامی مترجمین کی بھی ایک معقول تعداد پاکستانی مترجمین کی نگرانی میں ترجمہ کاری کے امور سرانجام دینے میں پیش پیش رہی۔ اپنے قیام سے لے کر ۱۹۸۶ تک چینی زبان کی ستر سے زائد کتب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ترجمہ کی گئی کتب میں ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، سرکاری دستاویزات، ادب اطفال اور عام قارئین کے

لیے معلوماتی نوعیت کی کتابیں شامل ہیں۔"غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر" میں شعبہ اردو کے سربراہ تولی چنگ اپنے ادارے کی کارکردگی یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "چین اور پاکستان دوست ملک ہیں اور دوستی اسی وقت پختہ ہوتی ہے جب دوست ایک دوسرے کو سمجھیں۔ ہمارا ادارا اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم اپنی اب تک کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ آئندہ اپنی اردو جاننے والے قارئین کو چین کے ادب، تاریخ، اقتصادیات، معلوماتِ عامہ اور موجودہ صورت حال پر سب کچھ بتائیں۔ جلد از جلد بتائیں اور صحیح طور پر بتائیں۔ ہماری بچوں سے متعلق مطبوعات یہاں خاصی مقبول ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں زیادہ تیز رفتاری سے اور پاکستانی قارئین کے ذوق کے مطابق کتابیں چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"(۲۱)

کسی بھی زبان کی ترویج و ترقی میں ذرائع ابلاغ کا کردار از حد اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ عہدِ حاضر میں تو ان ذرائع کی بدولت تہذیب و ثقافت کو بھی اجاگر کرنے میں خاطر خواہ مدد میسر آرہی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں برقی ذرائع ابلاغ میں ریڈیو ایک پر اثر اور تیز ترین ذریعہ کے طور پر پوری دنیا میں مقبول رہا ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر حکومتِ چین نے ریڈیو بیجنگ کے زیرِ اہتمام اردو سروس کا باقاعدہ آغاز یکم اگست ۱۹۶۶ء میں کیا۔ اس سروس کی بدولت اردو زبان میں چینی سماج، نظامِ حکومت، بین الاقوامی تعلقات، ثقافت اور سائنس و ٹیکنالوجی جیسے موضوعات پر سامعین کو دل چسپ معلومات اور رواں تبصروں کے ذریعے آگاہی فراہم کی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ چینی موسیقی، ادب اور مشاہیر کے بارے میں بھی تعارف کروایا جاتا تھا۔ سامعین کی دل چسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے وقتاً" فوقتاً" مختلف نوعیت کے مقابلہ جات کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا، جس میں بڑی تعداد میں شرکاء کی شمولیت اس سروس کی مقبولیت کی غمازی کرتی ہے۔ ریڈیو پیکنگ کی اردو سروس کے انچارج چاؤ چنگ شیو نے اپنے ایک مکتوب میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔

> "پاکستان چین کا قریبی ہمسایہ ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام دیرینہ اور روایتی دوستی کے رشتے میں ہم اپنے دوستوں اور سامعین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اردو پروگرام کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارا مستقبل میں چند نئے پروگرام شروع کرنے کا ارادہ

ہے، جن میں کہانیاں اور عورتوں اور بچوں کے لیے خصوصی پروگرام بھی شامل ہوں گے"(۲۲)

چینی اور اردو زبانوں میں اشتراکِ عمل کی صورت حال کو مزید بہتر بنانے میں جو کاوشیں کی گئیں ان میں "چین باتصویر (اردو ایڈیشن) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک ماہانا تصویری مجلہ تھا، جو اردو سمیت ۱۹ زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا اجراء ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ اس کے مقاصد میں چینی سیاسی، معاشی اور سماجی حکمت عملی کے دوررس نتائج کو اجاگر کرنا شامل تھا۔ دلچسپ اور دیدہ زیب تصاویر پر مبنی اس مجلے کو پوری دنیا میں چینی سماج کے آئینہ دار کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس رسالے سے وابستہ اردو زبان کے ماہرین ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں نام چانگ شر شوئین ہے، جو کہ اپنے اردو نام انتخاب عالم سے مقبول ہیں۔ اپنے منفرد شعری اسلوب اور زبان و بیان پر مہارت کے سبب اردو مشاعروں میں سامعین سے ڈھیروں داد سمیٹنے اور پذیرائی حاصل کرنے میں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔

چینی اکادمی برائے سماجی علوم کا ذیلی ادارہ انسٹیٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین سٹڈیز بھی اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے تحت ایک سہ ماہی رسالہ شائع کیا جاتا ہے۔ علمی و تحقیقی نوعیت کے اس رسالے میں پاکستان کی تہذیب و ثقافت، تاریخ اور سماجی عکاسی کے حامل موضوعات کو پیش کیا جاتا رہاہے۔ اس ادارے کی سربراہ مسز چانگ یوی لان کی حیثیت ایک بہترین مترجم کے طور پر بھی تسلیم شدہ ہے۔

چینی دارالحکومت میں پاکستانی سفارت خانے سے متعلق سفارتی عملے کے بچوں کے لیے اردو زبان کی درس و تدریس کو ممکن بنانے کے لیے ایک اسکول کا اجراء کیا گیا۔ جلد ہی اس کی مقبولیت میں، دیگر ممالک کے سفارتی اہلکاروں کے بچوں کے داخلے کے سبب، اضافہ ہو گیا۔ یوں اس اسکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ پاکستانی کالج میں بنیادی طور پر ذریعہ تعلیم انگریزی ہے تاہم اردو زبان کو بطور ایک مضمون بہت اہتمام اور توجہ سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس ادارے کی بدولت بھی دونوں زبانیں بولنے والے افراد کے مابین مکالمے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا ہونے میں خاطر خواہ مدد میسر آرہی ہے۔

پاکستان میں چینی زبان کے فروغ کے ضمن میں کنفیوشس انسٹی ٹیوٹس کا قیام ایک اہم سنگِ میل ہے۔ پاک چین حکومتوں کے اشتراک سے ۲۰۰۴ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد میں

پاکستان کے سب سے پہلے کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ چینی زبان و ثقافت کو فروغ دینے اس ادارے کی خدمات گراں قدر ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں جامعہ کراچی میں بھی کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جب کہ ۲۰۱۵ء میں فیصل آباد یونیورسٹی میں بھی تیسرا کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔

> "اس ادارے کا بنیادی مقصد چینی زبان کی تدریس، چینی ثقافت کا تعارف اور لوگوں کے روابط پر تعلیمی اور ثقافتی تبادلے کو فروغ دینا ہے۔ یہ ادارہ چین کی بیجنگ لینگویج اینڈ کلچر یونیورسٹی (BLCU) اور پاکستان کی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (NUML) کے تعاون سے چینی زبان کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ چینی زبان سکھانے کے لیے نصاب تیار کرتا ہے، چینی زبان کے اساتذہ کو تربیت دیتا ہے، چینی زبان کی مہارت جانچنے کے امتحانات منعقد کرواتا ہے، ثقافتی اور فنکارانہ پروگراموں کی میزبانی کرتا ہے اور جدید چین کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔"(۲۳)

حکومتِ پاکستان اور حکومتِ چین کے مابین دوطرفہ تعلقات کو نئی بلندیوں اور وسعتوں سے ہم کنار کرنے میں پاک چین اقتصادی راہ داری منصوبہ (CPEC) اپنی مثال آپ ہے۔ اس منصوبے کی تعمیری ضروریات کی غرض سے چینی ماہرین کی ایک بڑی تعداد پاکستان میں اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ اس پس منظر میں مقامی ہنر مندوں سے ابلاغی تقاضوں کے پیش نظر اردو زبان سے واقفیت از حد ضروری ہے۔ پیشہ وارانہ ضروریات کی انجام دہی میں اردو زبان کی ترویج کی بدولت بھی دونوں ممالک کی عوام میں ہم آہنگی اور مکالمے کی نوعیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

دنیا کی اہم زبانوں کی طرح چینی زبان میں بھی اقوامِ متحدہ کی دستاویزات کو تیار کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ۲۰ اپریل کو چینی زبان کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اردو ادب میں چینی زبان پر تحقیقی سرگرمیوں کا سلسلہ باوجوہ اس قدر توانا نہیں ہے۔ ۲۰۱۶ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے شعبہ اردو زبان و ادب کے ایک طالب علم لوطنے اردو اور چینی محاوروں پر ایک تحقیقی مقالہ قلم بند کیا، جس میں اڑھائی

سو سے زائد اردو اور چینی محاوروں پر تحقیق کی گئی ہے، جس سے دونوں زبانوں کے مابین لسانی اشتراک کی نشان دہی ہوتی ہے۔

ج۔ چین اور پاکستان کے مابین وسیع الابنیاد سیاسی، سفارتی اور دفاعی تعلقات

چین اور پاکستان کے درمیان سفارتی اور دفاعی میدان میں انتہائی مثالی اور شان دار تعلقات قائم ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں دونوں ممالک نے سفارتی تعلقات کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ جلد ہی اس ضرورت کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ خطے کی علاقائی تزویراتی صورت حال میں مغربی سامراجی طاقتیں پڑوسی ملک بھارت کو اپنا آلہ کار بنا کر پاکستان اور چین دونوں کے لئے مسائل پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ اس پس منظر میں پاکستان اور چین نے اپنے سرحدی امور کو خوش اسلوبی سے حل کر لیا۔ سرحدی امور کا پرامن طور پر حل نکلنے سے دونوں ممالک کے درمیان اعتماد اور بھروسے کا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ جلد ہی یہ رشتہ روایتی سفارتی تعلقات سے بڑھ کر باہمی شراکت داری اور دوستی جیسے لازوال رشتے میں تبدیل ہو گیا۔

اپنے قیام کے ابتدائی زمانے میں چین کو عالمی طاقتوں بالخصوص مغربی ممالک کی جانب سے بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔ سفارتی طور پر چین کو تنہا کرنے کو مذموم کوششوں کو چینی قیادت نے اپنی دور اندیشی کے باعث بھانپ لیا تھا۔ پاکستان نے اس نازک مرحلے میں اپنی عظیم ہمسائے کو عالمی تنہائی سے بچانے کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر کردار ادا کیا۔ پاکستان کے اس مخلصانہ کردار کو چینی عوام اور قومی قیادت آج تک فراموش نہیں کر سکے اور ہر مشکل وقت میں پاکستان کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔

> "پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا تھا۔ لیکن ۲۱ مئی ۱۹۵۱ء کو پاکستان نے عوامی جمہوریہ چین کی حیثیت سے اسے تسلیم کر کے سفارتی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ پاکستان کی طرف سے پہلا اعلی سطحی سرکاری وفد ۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو بیجنگ کے دورے پر پہنچا تھا۔ اس وقت عوامی جمہوریہ چین کو آزاد ہوئے صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ گو پاکستان ایک چھوٹا سا ملک تھا لیکن اس نے چین کے ساتھ اپنی دوستی نبھائی اور ہر دکھ میں اس کا ساتھ دیا۔ خصوصا" ایسے وقت میں جب کوئی مغربی ملک چین کو اس کا حقیقی مقام دینے کو تیار نہ تھا۔ تمام مغربی ممالک نے عوامی جمہوریہ چین کا ناطقہ بند کر رکھا

تھا۔۔۔پاکستان نے چین کے لیے دنیا کی جانب ایک کھڑکی کھول رکھی تھی جس سے تازہ ہوا کے جھونکے آئے اور چین کی ضروریات پوری ہوئیں۔"(۲۴)

چین اور پاکستان کے درمیان باقاعدہ سفارتی تعلقات کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہوتے ہی دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے ملک میں اپنے اپنے سفارت خانے قائم کر دیئے۔ پروفیسر احمد علی کی نگرانی میں بیجنگ میں پاکستانی سفارت خانے کے سفارتی عملے نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ پروفیسر احمد علی پچھلے کئی سالوں سے چین کی پیکنگ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ اس بنیاد پر ان کے چین کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں قریبی تعلقات موجود تھے۔ پاک چین دوستی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں انہوں نے از حد محنت اور کاوش کی۔ انہی کاوشوں کی بدولت ۱۴ اگست ۱۹۵۴ء میں پاکستانی سفارت خانے کے زیر اہتمام قیام پاکستان کی سالگرہ کی مرکزی تقریب میں چینی وزیر اعظم جناب چو این لائی نے بنفسِ نفیس شرکت کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ پاک چین تعلقات مستقبل میں جن بلندیوں پر پہنچ جائیں گے، ان کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔

دنیا کی سب سے بلند بین الاقوامی سڑک شاہراہ قراقرم کی تعمیر کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ منصوبہ پاکستان اور چین کے درمیان واحد زمینی راستہ ہے۔ اس شاہراہ کو دوستی شاہراہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ قدیم شاہراہِ ریشم کے احیاء کے اس منصوبے سے چین کو اپنی مصنوعات بیرونی دنیا میں پہنچانے کا موقع میسر آیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان کو بھی اپنی مصنوعات بذریعہ سڑک چین کی منڈی میں لے جانے کی سہولت میسر آئی ہے۔ کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ، نمل اسلام آباد کے نائب صدر ڈاکٹر چانگ وے بجا طور پر اس شاہراہ کی اہمیت کے پیشِ نظر مرتبہ کتاب "چین شناسی" کے پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہیں:-

"شاہراہِ ریشم کی تعمیر نے بھی ایشیا کی دو عظیم تہذیبوں کے درمیان تجارتی روابط کو فروغ دیا۔ اس شاہراہ کی بدولت دونوں خطوں کی عوام کے درمیان ثقافتی و معاشرتی روابط کو بھی فروغ ملا۔ یوں شاہراہ ریشم اور دریائے سندھ و دریائے زرد کی تہذیبیں ہمارے قدیم تہذیبی شعور کے لئے ایک منبع و محور ثابت ہوئیں جو آج بھی پاکستانیوں اور چینیوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔"(۲۵)

اس شاہراہ کی تعمیر ۱۹۵۹ء میں شروع ہوئی، جس میں پاکستانی اور چینی مزدوروں اور ہنر مندوں نے اپنی مہارت کا شان دار مظاہرہ کیا۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل ۱۹۷۹ء میں ہوئی جس سے دونوں ممالک کے درمیان دوطرفہ تجارت اور تعاون کا سلسلہ مزید وسعتوں سے ہم کنار ہوا ہے۔ اسی شاہراہ کے حیرت انگیز فوائد کو مد نظر رکھتے ہوئے چینی قیادت نے پاک چین اقتصادی راہ داری کے عظیم منصوبے کا بھی آغاز کیا ہے جو بین الاقوامی تجارتی عمل میں بہت بڑی پیش رفت ہے۔

علاقائی اور بین الاقوامی امور پر پاک چین یکساں موقف دونوں ممالک کی سوچ اور ہم آہنگی کا واضح اظہار ہے۔ ہندوستان کی غیر منصفانہ تقسیم کے نتیجے میں جنم لینے والے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے اصولی موقف کی چینی قیادت نے ہمیشہ تائید کی ہے۔ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو ان کے پیدائشی حقِ خودارادیت اور غیر قانونی بھارتی جارحیت کو چینی قیادت نے ہمیشہ بین الاقوامی فورمز پر اجاگر کیا ہے اور اس مسئلے کے پر امن حل کے لیے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے تحت استصوابِ رائے پر زور دیا ہے۔ ۵ اگست ۲۰۲۱ء کو بھارتی حکومت نے طاقت کے نشے میں مقبوضہ جموں و کشمیر کی آئینی حیثیت کو تبدیل کر کے اسے خصوصی حیثیت سے محروم کرنے کی مذموم کوشش کی تو پاکستان اور چین کے حکومتوں نے اس اقدام کی کھل کر مذمت کی۔ نہتے کشمیری عوام پر قابض افواج کے بہیمانہ ظلم و ستم کو پاکستان اور چین بین الاقوامی فورمز پر بے نقاب کر کے بھارت کے نام نہاد سیکولر اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے بے بنیاد دعوؤں کی حقیقت کو اقوامِ عالم کے سامنے واضح کرتے ہیں۔

پاکستان "ون چائنا پالیسی" کا ابتداء ہی سے حامی رہا ہے۔ چین کے تائیوان اور ہانگ کانگ کے ساتھ داخلی تنازعات کے پر امن اور سیاسی حل کی پاکستان نے ہمیشہ حمایت کی ہے۔ چین کو سفارتی تنہائی سے بچانے اور مغربی اقوام بالخصوص ریاست ہائے متحدہ امریکا کے ساتھ برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار کرنے میں پاکستان کا کردار بہت مثالی رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی باقاعدہ رکنیت کے حصول میں بھی پاکستان نے چین کی سفارتی مدد کی اور خاص طور پر اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت کے حصول کی جدوجہد میں چین ہمیشہ پاکستان کا ممنون رہا ہے۔

چین امریکہ تعلقات ابتداء میں عدم اعتماد اور مخاصمت پر مبنی تھے۔ اس کی بنیادی وجہ چین کا اشتراکی نظریئے کے تحت وجود میں آنا اور سرمایہ داری نظام کی مخالفت تھا۔ قیامِ چین کے بعد ایک عرصے تک مغربی ممالک نے چین کی اس آزاد حیثیت کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ اسی سرد مہری کے باعث چین کو عالمی سطح پر اپنا مقام حاصل کرنے میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے دوسرے ممالک سے فضائی پروازیں بھی چین میں داخل ہونے سے کتراتی تھیں۔ پاکستان نے چین کے ساتھ فضائی روابط کا آغاز کر کے چین کو بیرونی دنیا کے ساتھ مثبت تعلقات قائم کرنے کا قیمتی موقع فراہم کیا، جس کا چین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ چین اور امریکہ کے مابین سرد مہری کے خاتمے میں پاکستانی قیادت کے زبردست کردار کو چینی دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان کامیاب سفارت کاری کے ذریعے سفارتی تعلقات کی داغ بیل ڈالنا پاکستان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس پیش رفت کا احوال ایس ایم حالی اپنی کتاب میں یوں پیش کرتے ہیں۔

> "جولائی ۱۹۷۱ء میں امریکی حکومت کے قومی سلامتی امور کے مشیر جناب ہنری کسنجر پاکستان تشریف لائے۔ انہیں سیر کی غرض سے مری لے جایا گیا جہاں اعلان کر دیا گیا کہ کہ ان کی طبعیت ناساز ہے اور وہ مری میں ہی قیام کریں گے کیونکہ وہ پر فضا مقام ہے۔ راتوں رات جناب ہنری کسنجر کو خصوصی پی آئی اے کی پرواز سے بیجنگ پہنچا دیا گیا جہاں انہوں نے چینی قیادت سے تعلقات بڑھانے پہ اہم مذاکرت کیے اور امریکی صدر رچرڈ نکسن کے دورہ چین کی تفصیلات طے کیں۔ چین نے شرط رکھی کہ امریکی صدر کے دورے سے قبل امریکہ عوامی جمہوریہ چین کو اس کا جائز مقام دلائے۔۔۔یوں صدر نکسن ۲۱ فروری ۱۹۷۲ء کو چین کے دورے پہ تشریف لے گئے اور تاریخ رقم کی۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے:۔وہ ہفتہ جس نے دنیا کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔"(۲۶)

چین امریکہ تعلقات کا آغاز بین الاقوامی تاریخ میں انتہائی اہم پیش رفت تھی۔ اس اقدام سے چین اقوامِ عالم میں اپنے جائز مقام کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں سرخرو ہوا۔ اقوامِ متحدہ کے مستقل ادارے سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کا حصول بھی چین کی بہت بڑی اور شاندار کامیابی تھی۔ سلامتی کونسل کی

مستقل رکنیت رکھنے والے پانچ ممالک میں عوامی جمہوریہ چین کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس شامل ہیں۔ سلامتی کونسل کے ان مستقل آراکین کے علاوہ غیر مستقل آراکین بھی منتخب کیے جاتے ہیں جو اپنی طے شدہ معیاد مکمل ہونے کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ تاہم سلامتی کونسل میں حقِ تنسیخ یا ویٹو پاور کا اختیار صرف مستقل ممبران کو ہی حاصل ہے۔ چین کے اس غیر معمولی اختیار اوراثر ورسوخ کے باعث پاکستان کو کئی ایک مواقع پر سلامتی کونسل میں زبردست سفارتی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

پاکستان کو اپنے قیام کے ساتھ ہی پڑوسی ملک کی جانب سے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مسائل میں کشمیر کا مسئلہ سرِ فہرست تھا۔ بھارتی حکومت کے جارحانہ عزائم کا ادراک تو پاکستان کی اعلیٰ قیادت کو شروع دن سے ہی تھا۔ ۱۹۴۸ء کی پاک بھارت جنگ نے ان خدشات کو درست ثابت کیا۔ ارضِ وطن کے مضبوط دفاع اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لیے پاکستان نے اپنے دفاعی نظام کو موثر اور ناقابلِ تسخیر بنانے کا عہد کیا ہوا تھا۔ اس منزل کا حصول تن تنہا ممکن نہ تھا۔ چین نے اس موقع پر پاکستان کی بے حد مدد کی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران چین نے جس انداز سے پاکستان کی مدد کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جنگی سازوسامان اور گولہ بارود کی وافر مقدار میں فراہمی چین کی بے غرض دوستی کا ثبوت تھا۔ مغربی پاکستان کے محاذوں پر پاک فوج نے بھارتی افواج کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ مادرِ وطن کے دفاع میں پاک فوج دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی۔ تاہم مشرقی پاکستان میں افرادی قوت اور دفاعی ساز و سامان کی محدود دستیابی کے باعث اس بات کا خدشہ تھا کہ دشمن کہیں اس محاذ پر جنگ کا آغاز کر کے بھاری نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اس نازک صورت حال میں چین نے بھارتی فوج کو الٹی میٹم دیا جس کے باعث مشرقی محاذ پر دشمن کو جارحیت کا موقع نہ ملا۔ یوں جنگِ ستمبر دشمن کے لیے جنگِ ستم گر ثابت ہوئی۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی چین نے پاکستان کی سرزمین کے جغرافیائی تحفظ، علاقائی سالمیت اور خود مختاری کی کھل کر حمایت کی۔

دفاعی تعاون کا سلسلہ پاکستان اور چین کی لازوال دوستی کا ایک خوب صورت باب ہے۔ پاکستان کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنانے اور تینوں مسلح افواج کی پیشہ وارانہ مہارتوں کو دوام بخشنے کے لیے دونوں ممالک کی عسکری قیادت کے درمیان کئی ایک معاہدے اور مفاہمت کی یادداشتیں موجود ہیں۔ الخالد ٹینک اور الضرار

ٹینک سمیت ان گنت مشترکہ منصوبے دفاعی تعاون کی زندہ مثالیں ہیں۔ ہیوی مکینکل انڈسٹریز، ٹیکسلا، میزائل ٹیکنالوجی، مشترکہ فوجی مشقیں اور پیشہ وارانہ امور پر جاری تعاون دن بدن ترقی کی جانب گامزن ہے۔

وطنِ عزیز کی فضائی سرحدوں کی حفاظت اور دشمن کی جارحیت کے نمٹنے کے لیے پاک فضائیہ ہمہ وقت چوکس اور چوکنا رہتی ہے۔ مادرِ وطن کی فضاؤں کو ناقابل تسخیر بنانے کے لیے دفاعی منصوبوں میں پاکستان اور چین کی فضائیہ کے مابین مثالی اور دیرپا تعلقات موجود ہیں۔ اس دوستی کی سب سے زندہ و تابندہ مثال جے ایف تھنڈر-۱۷ نامی جنگی جہاز کی تیاری ہے۔ دونوں ممالک کے انجینئرز اور تکنیکی عملے کی مہارتوں کے باعث عالمی معیار کے اس منصوبے کی بدولت پاک فضائیہ کی پیشہ وارانہ کارکردگی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس منصوبے کی سب سے خاص بات یہ ہے کی چینی دوستوں نے اس لڑاکا طیارے کی تیاری میں پاکستانی ماہرین کو ٹیکنالوجی سے روشناس کروایا ہے۔ اس تعاون کی بدولت پاکستان میں دفاعی پیداوار کی صنعت کو بے حد فائدہ ملا ہے۔ پاکستان اپنی دفاعی ضروریات کا اسلحہ اور جنگی سازو سامان نہ صرف خود بنا رہا ہے بل کہ ضرورت سے زائد سازوسامان مختلف ممالک کو فروخت کر کے قیمتی زرِ مبادلہ بھی حاصل کر کے ملک کی معیشت کو مضبوط بنایا جارہا ہے۔

کسی بھی ملک کے دفاع میں مضبوط اور پیشہ وارانہ مہارتوں سے لیس بحری افواج کا ہونا لازمی اور بنیادی ضرورت ہے۔ پاکستان کے دفاعی منصوبہ سازوں کو اس حقیقت کا بخوبی احساس ہے۔ اسی احساس کے پیشِ نظر چین کی زبردست بحری صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے پاک بحریہ کے دفاع کو مضبوط بنانے کی جانب خاطر خواہ توجہ کی گئی ہے۔ دونوں ممالک کی بحری افواج کے درمیان مشترکہ تعاون کے کئی ایک منصوبے اور معاہدے ہیں۔ چین قدیم زمانے ہی سے ایک قابلِ رشک بحری قوت کے طور پر دنیا میں اپنا مثالی مقام رکھتا ہے۔

> "چین کی قدیم سمندری طاقت اور بحری جنگ میں استعمال ہونے والے مختلف اقسام کے جہازوں کی تاریخ کے دستاویزات ہزاروں سال پہلے ۲۲۷ قبل مسیح میں ملتے ہیں۔ پندرہویں صدی میں بھی چین عظیم بحری قوت تھا۔ چینی جہاز ساز بڑے پیمانے پر

سمندری جہاز تیار کرتے اور معروف مغربی مورخ بھی اس بات کے معترف ہیں۔"(۲۷)

جدید دور کی مہارتوں اور ضروریات سے بھی چینی سیاسی و دفاعی قیادت باخبر ہے۔ اسی بنیاد پر چینی بحریہ کو عالمی معیار اور تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ چین نے پاک بحریہ کو سرعت سے حملہ کرنے والی ہائیڈروفولک کرافٹ، حینان کلاس آبدوز کش لڑاکا کشتیاں ہیگن میزائل سمیت فراہم کیں۔ بحری تنصیبات میں پی این ایس نصر کی تعمیر دونوں ممالک کے درمیان بحری تعاون کی ایک گراں قدر مثال ہے۔ ۲۰۰۵ء میں دونوں ممالک نے چار P-22 کلاس فریگیٹ بحری جہاز مشترکہ طور پر تیار کر کے دوستی کے مثالی رشتے کو مزید مضبوط کیا ہے۔ گوادر میں چین کے تعاون سے تعمیر ہونے والی عالمی معیار کی بندرگاہ اور پاک چین بحری تعاون پر ایس ایم حالی اپنی کتاب میں یوں رقم طراز ہیں:-

"پاک بحریہ نے اپنی اہم تنصیبات کے ٹرمینل فضائی دفاع کی خاطر چین سے ریڈار کنٹرولڈ زمین یا سطح سمندر سے فضا میں مار کرنے والی توپیں اور نچلی سطح پر پرواز کرنے والے طیاروں کا پتہ لگانے والے خصوصی ریڈار حاصل کیے ہیں۔ ان کے حصول سے پاک بحریہ کے خود انحصاری کے منصوبوں کو فروغ حاصل ہونے کے علاوہ اعلی کوالٹی دفاعی نظام سے اپنی کارکردگی کو افضل بنانے میں مدد حاصل ہو گی۔ پاک چین بحری تعاون کے ضمن میں گوادر کی سٹراٹیجک بندرگاہ کی تعمیر میں چین کا اہم کردار ہے۔ یہ بندرگاہ تجارتی بحری جہازوں اور سامان کی ترسیل کے لیے تعمیر کی گئی ہے اور اقتصادی راہداری کا اہم جزو ہے۔ یہ خوش آئند امر ہے کہ گوادر کی بندرگاہ کا کنٹرول بھی چین نے حاصل کر لیا ہے۔"(۲۸)

دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی عالمی جنگ میں پاکستان نے اپنے وسیع تر قومی مفاد میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو اسے انتہا پسند اور دہشت گرد عسکری گروہوں کی طرف سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ عسکری اور قومی تنصیبات پر دہشت گردوں کے بزدلانہ حملوں میں لاکھوں پاکستانی فوجیوں اور سول شہریوں نے اپنی قیمتی جانیں قربان کی ہیں۔ دہشت گردی کے اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ملک کی اعلی سول و عسکری قیادت پرعزم ہے۔ بیجنگ اس اہم بین الاقوامی چیلنج سے نمٹنے کے لیے اسلام آباد کے ساتھ

بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ دونوں ممالک پوری دنیا میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنے والے اس مسئلے کو ایک مشترکہ ہدف کے طور پر دیکھتے ہیں۔ بین الاقوامی برادری بالخصوص مغربی ممالک میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی قربانیوں کو جب شک کی نگاہ سے دیکھا گیا تو بیجنگ نے اس احساس کو رد کرنے کے لیے اسلام آباد کی بھرپور مدد کی۔ عالمی پلیٹ فارمز پر پاکستان کی قربانیوں کے اعتراف اور پاکستانی معیشت کو پہنچنے والے ناقابلِ تلافی نقصان کو اجاگر کرنے میں چینی سفارتی حکام نے کبھی بھی بخل سے کام نہ لیا۔ اس جنگ میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کو جڑ سے اکھاڑنے میں چین پاکستان کے شانہ بشانہ برسرِ پیکار ہے۔ دہشت گردی جیسے اِس ناسور کو ختم کرنے میں چین پاکستان کی تکنیکی و انٹیلی جنس رابطوں سمیت ہر ممکن تعاون میں پیش پیش ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ یہاں کے باصلاحیت عوام مملکتِ خداداد کی ترقی و استحکام میں ہمہ تن کوشاں ہیں۔ لیکن غیر یقینی سیاسی صورت حال، قدرتی آفات اور دہشت گردی کے خلاف جنگ نے پاکستان کی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ چین مشکل کی ہر گھڑی میں پاکستان کے ہم رکاب رہا ہے اور دکھ کی گھڑی میں اپنے پاکستانی بہن بھائیوں کی دل کھول کر مدد کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ وطنِ عزیز میں پڑوسی ملک کی آبی جارحیت اور زائد پانی کو محفوظ کرنے کے ناکافی بندوبست کے باعث ہر چند سال بعد خوف ناک سیلاب آتے رہتے ہیں۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے باعث انفراسٹرکچر کے منصوبوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں جانی نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس ناگہانی قدرتی آفت سے نمٹنے کے لیے چین کی مدد اور تعاون آہنی بھائیوں کی لازوال دوستی کی بہترین مثال کا درخشاں مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ ۲۰۰۵ء کے خوف ناک زلزلے میں پاکستان کے شمالی مغربی علاقوں میں قیامت خیز تباہی ہوئی۔ ہزاروں قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔ لاکھوں رہائشی اور کاروباری عمارات منہدم ہو گئیں۔ سرکاری تنصیبات بھی اس زلزلے کے نتیجے میں ناکارہ ہو گئیں۔ تعلیمی سرگرمیاں بھی اس زلزلے کے باعث منقطع ہو گئیں۔ چین نے مایوسی اور دکھ کے ان لمحات میں پاکستانی عوام کی فراخ دلانہ مدد کی۔

۲۰۲۰ء کے اوائل میں کرونا وباء نے عوامی جمہوریہ چین میں بالخصوص اور باقی دنیا میں بالعموم ہلاکت خیزی کی ایک اندوناک داستان رقم کی۔ کرونا وائرس کا یہ موذی مرض دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کی طرح

پاکستان میں بھی اپنے پنجے گاڑھتا چلا گیا۔ دنیا کی معلوم تاریخ میں ایسی خوف ناک وباء پہلے کبھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر لقمہ ءاجل بنانے والی اس عفریت نے چین میں غیر معمولی تباہی مچائی۔ چینی حکومت نے اس وباء کے پھیلاؤ کو روکنے اور تدارک کے لیے انتہائی سخت اقدام بروئے کار لائے، جن میں مکمل لاک ڈاون اور احتیاطی تدابیر پر سختی سے عمل درآمد کو یقینی بنایا گیا تھا۔ چینی حکام نے اپنے طبی ماہرین کو اس مرض کا علاج دریافت کرنے کا اہم فریضہ سونپا۔ جلد ہی چینی ماہرین نے کرونا وباء کے پھیلاؤ پر قابو پالیا اور ویکسین بھی تیار کرلی۔ پاک چینی دوستی کی تابندہ مثال اس موقع پر بھی سامنے آئی جب چین نے بیرونی دنیا میں سب سے پہلے پاکستان کو یہ ویکسین تحفتا" فراہم کیں اور پاکستانی قوم کو اس مرض سے نجات دلانے میں اپنی بساط سے بڑھ کر کردار ادا کیا۔

کرونا وباء اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خوف ناک طبی مسئلہ تھا لیکن اس نے اپنی چیرہ دستیوں کے باعث بڑے پیمانے پر انسانی سرگرمیوں اور نقل و حمل کو ساقط کر دیا۔ چھوت کا مرض ہونے کے باعث انسانوں کے ایک دوسرے سے ملنے جلنے سے رکنا از حد ضروری تھا۔ اسی بنیاد پر تعلیمی سرگرمیوں کو بھی فوری طور پر روک دیا گیا۔ صنعت کا پہیہ بھی جام ہونے سے محنت کش طبقے کے لیے اپنی گزر بسر کرنا انتہائی دشوار ہو گیا۔ کئی ترقی یافتہ ممالک اپنے بھاری بھر کم وسائل کے باوجود اس صورت حال کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو گئے۔ ترقی پذیر معیشتوں کو زبردست جھٹکا لگا اور غیر یقینی صورت حال کے باعث عالمی منڈی میں طلب و رسد کے درمیان ہوش ربا عدم توازن کے باعث مصنوعات کی قیمتیں قابو سے باہر ہو گئیں۔ ایسے میں چینی حکومت نے انسانی ہم دردی اور خیر سگالی کے جذبے سے سرشار ہو کر نا صرف پاکستان بل کہ دنیا کے کئی ممالک میں کرونا سے بچاؤ کی اشیاء اور جان بچانے والے طبی آلات مثلا" وینٹی لیٹرز کی ایک بہت بھاری کھیپ مفت فراہم کی۔ معاشی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے جو اقدامات اٹھائے گئے، وہ عظیم چین کی عظیم روایات کے شایان شان تھے۔

> "چینی قیادت کا سب سے اہم کارنامہ محض اس وباء کے اثرات کو محدود کرنا نہیں تھا ---۔ چینی کمیونسٹ پارٹی نے انسان دوستی کے جذبے کے تحت اپنے تجربات سے حاصل کیے گئے سبق سے باقی دنیا کو آگاہ کیا۔ ---ترقی پذیر ممالک جو کرونا وبا کی وجہ

سے ہراساں تھے اور ان کی معیشت بھی لڑکھڑا رہی تھی، ان کے قرضے یا معاف کر دیئے یا ان کی معیاد بڑھا دی۔ اس کے علاوہ چین نے عالمی ادارہ صحت کو ۲۰ بلین ڈالر کی امداد دی تا کہ کرونا وبا کا سدباب ہو سکے۔"(۲۹)

پاک چین تعلقات بین الاقوامی سفارتی تاریخ میں ایک بہترین مثال ہیں۔ دونوں ممالک کے باہمی تعلقات اب رسمی سفارتی آداب سے بڑھ کر باہمی شراکت داری کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس دوستی میں ہر گزرتے دن مزید گرم جوشی اور محبت پیدا ہو رہی ہے۔

د۔ پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ اور باہمی تجارتی شراکت داری

پاکستان اور چین کے درمیان دوستی کے لازوال رشتے کو جس منصوبے نے ایک نئی جہت سے متعارف کروانے میں بنیادی کردار ادا کیا، اسے پاک چین اقتصادی راہداری منصوبے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پاک چین اقتصادی راہ داری منصوبے کو سی پیک (China Pakistan Economic Coridor) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ پاک چین اقتصادی راہداری بڑا تجارتی و تعمیراتی منصوبہ ہے۔ اقتصادی راہداری پاک چین تعلقات میں مرکزی اہمیت کی حامل تصور کی جاتی ہے۔ یہ گوادر سے کاشغر تک تقریباً ۲۴۴۲ کلو میٹر طویل ہے۔ راہداری چین کی اکیسویں صدی میں شاہراہ ریشم میں توسیع ہے۔ سی پیک کا یہ منصوبہ نہ صرف پاکستان اور چین کے درمیان تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے، بل کہ افغانستان سمیت وسط ایشیائی مسلم ریاستوں کو بھی باقی دنیا کے ساتھ سمندری راستے سے تجارت کے وسیع تر مواقع فراہم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گا۔ اس منصوبے کے تحت پاکستان کی نو تعمیر شدہ بندرگاہ گوادر پورٹ کو سڑک اور ریلوے نیٹ ورک کے ساتھ منسلک کر کے پورے ملک کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔ بعد ازاں اس سلسلے کو چین کے سرحدی صوبے سنکیانگ کے ساتھ منسلک کیا جانا ہے۔ سڑکوں اور ریل کے ساتھ ساتھ ہوائی سفر کے لیے بھی جدید سہولیات سے آراستہ ہوائی اڈا گوادر ائیرپورٹ کے نام سے اہم منصوبہ بھی شامل ہے۔

سی پیک کا تصور عوامی جمہوریہ چین کے صدر شی جنگ پنگ نے پیش کیا تھا۔ اس تصور کے تحت چین کو دنیا کے ساتھ جوڑنے کی غرض سے مختلف راہداریاں اور مرکزی شاہرائیں تعمیر کر کے چینی مصنوعات کو دنیا میں پیش کرنا تھا۔ مئی ۲۰۱۳ء میں چین کے وزیر اعظم لی کی چیانگ نے اپنے دورہ پاکستان کے دوران باقاعدہ طور پر اس بارے آگاہ کیا۔ پاکستانی قیادت نے اپنے عظیم ہمسائے کی اس فراخدلانہ پیش کش کی نا صرف تحسین

کی بل کہ انہیں اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔پاکستانی اعلیٰ قیادت نے اس منصوبے کو دونوں ممالک کے درمیان ایک اور سنگِ میل کے طور پر قبول کیا۔

پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ بنیادی طور پر قدیم شاہراہ ریشم کو جدید خطوط پر استوار کر کے دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نقل وحمل کے تیز ترین ذرائع کو یقینی بنانے کی ایک جامع اور ہمہ گیر حکمت عملی ہے۔ چینی قیادت اسے روڈ اینڈ بیلٹ منصوبے کے نام سے ترتیب دے چکی ہے۔اس منصوبے کے تحت چین اپنی مصنوعات کو دنیا میں پہنچانے کے لیے سڑک، ریل اور بحری راستوں کو ایک مربوط انداز میں منسلک کر کے دنیا کی بیشتر آبادی کو ایک دوسرے سے جوڑ رہا ہے۔ چینی قیادت اس عظیم منصوبے کو بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ بیلٹ سے مراد وہ زمینی شاہراہیں ہیں جن کی مدد سے تجارتی سامان کی نقل وحمل کو تیز ترین ذرائع کی مدد سے مطلوبہ مقامات تک پہنچایا جائے گا۔جب کہ روڈ سے مراد وہ بحری یا سمندری راستے ہیں، جن پر بحری جہازوں کی مدد سے تجارتی سامان کی نقل وحمل کو یقینی بنایا جائے گا۔ یہ منصوبہ چینی قیادت کے اس ویژن کا عکاس ہے جس کی بدولت چین اپنی مصنوعات کو پوری دنیا میں کم دورانیے میں پہنچانے کا خواہاں ہے۔اس منصوبے کے بہت سے پہلو ہیں جن کی بدولت پاکستان میں معاشی طور پر ایک سازگار ماحول پیدا ہونے کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔

سی پیک منصوبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پاکستان اور چین کے درمیان ایک میگا پراجیکٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس منصوبے کا سب سے اہم حصہ توانائی کے پیداواری منصوبوں پر مشتمل ہے۔پاکستان باوجوہ ان چند ممالک میں شامل ہے جہاں توانائی کا بحران بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے۔گھریلو استعمال کے ساتھ ساتھ زرعی اور صنعتی ضروریات کے لیے ارزاں نرخوں پر توانائی کا حصول ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں ہے۔فی الوقت بجلی کا پیداواری نظام ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ نجی شعبے سے توانائی کا حصول ایک وقتی حل کے طور پر کیا جارہا ہے۔ تاہم اس کے باعث قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ ہو جاتا ہے۔ موسمِ گرما میں گھریلو استعمال کی بجلی کی کھپت میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔اس وجہ سے صنعتوں کو بجلی کی فراہمی ناممکن ہو جاتی ہے۔قدرتی گیس بھی توانائی کے حصول کا ایک اہم ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔تاہم گزشتہ چند برسوں سے قدرتی گیس کی پیداوار میں کمی اور غیر معمولی طلب کے باعث اس کا بحران بھی سر اٹھارہا ہے۔

اس پس منظر میں چین اور پاکستان کے ماہرین نے سی پیک منصوبے کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہوئے اس بات کی جانب توجہ مبذول کی کہ توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے ایسی جامع اور دیرپا حکمت عملی ترتیب دی جائے جس کی بدولت توانائی کا مسئلہ مستقل طور پر حل کیا جاسکے۔ چنانچہ سی پیک کے بنیادی تصور کے تحت توانائی کے پیداواری منصوبوں پر پیش رفت کا آغاز ہوا۔ دونوں ممالک کے توانائی کے شعبے کے ماہرین نے گہرے غور و غوض کے بعد ۱۶ اہم منصوبوں پر کام کو ترجیح بنیادوں پر شروع کرنے کی نشاندہی کی۔ ان سولہ منصوبوں سے پیدا ہونے والی مجموعی بجلی سترہ ہزار میگاواٹ سے زائد کا تخمینہ لگایا گیا۔ سی پیک کے تحت بجلی کے جو منصوبے فوری طور پر شروع کئے گئے ان میں قائد اعظم سولر پارک، بہاولپور، حبکو کول پاور پلانٹ، سکی کناری ہائیڈرو پاور اسٹیشن اور تھل نو اتھر کول پاور پراجیکٹ بلاک ٹو اہم ترین ہیں۔ شروع کیے گئے منصوبوں میں سے بیشتر مکمل ہو کر قومی سطح پر بجلی کی کھپت کو پورا کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ زرعی شعبے کی ترقی وطنِ عزیز کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ سی پیک کا منصوبہ اپنے اندر پاکستان میں روایتی طریقہ کاشت کاری کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں بھی خاطر خواہ اہمیت کا حامل ہے۔ سی پیک کے تحت پاکستان کی زرعی میدان میں ترقی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے پاکستان اور چین کے زرعی ماہرین نے جامع حکمت عملی مرتب کی ہے۔ کھیتوں سے منڈیوں تک پختہ سڑکوں کی تعمیر بالواسطہ طور پر زرعی شعبے سے وابستہ کسانوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے، ساتھ ہی ساتھ فی ایکڑ پیداوار کو ترقی یافتہ ممالک کے برابر لانے کے لیے صحت مند اور بہتر قوتِ مدافعت کے حامل معیاری بیج کی تیاری اور کسانوں تک رسائی ممکن بنانے کے لیے چینی کمپنیاں پاکستان میں بھاری سرمایہ کاری کو یقینی بنائیں گی۔ فصلوں کو بیماریوں اور کیڑوں سے بچانے کے لیے تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے کا سلسلہ بھی اسی کا حصہ ہے تاکہ مضر جڑی بوٹیوں اور پیداوار کو متاثر کرنے والے عوامل کا مناسب تدارک کیا جاسکے۔ سبزیوں اور پھلوں کی پراسیسنگ اور پیکنگ کو عالمی معیار کے مطابق بنانے کے لیے صنعتی زونز میں جدید پلانٹس کی تنصیب بھی اسی منصوبے کا حصہ ہے۔ زراعت سے وابستہ لائیوسٹاک یا مویشی پالنے کا شعبہ بھی سی پیک کے وسیع الابنیاد منصوبوں کا حصہ ہے۔

پاک چین اقتصادی راہداری منصوبے میں ترجیحی طور پر سڑکوں کا ایک وسیع نیٹ ورک پھیلانا بنیادی ہدف کے طور پر طے کیا گیا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے موٹرویز اور ہائی ویز کے ساتھ ساتھ ریل ویز کو بھی جدید خطوط پر استوار کرنے کا عزم کیا گیا۔ ایم ایل ون منصوبے کے تحت پاکستان میں موجود پشاور تا کراچی ریلوے ٹریک، جو اس وقت یک رویہ ہے، کو دورویہ کیا جانا قرار پایا۔ دورویہ ٹریک سے ٹرینوں کے کراس کے دوران وقت کے ضیاع کو روکنے میں خاطر خواہ مدد میسر آئے گی۔ ٹریک کے جدید خطوط پر تعمیر ہونے سے ٹرینوں کی رفتار پر بھی مثبت اثر مرتب ہو گا۔ دونوں ممالک کے ریلوے ماہرین نے اس اہم ترین منصوبے پر منصوبہ بندی مکمل کر لی ہے اور جلد ہی اس کی باقاعدہ طور پر تعمیر کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔

پاکستان کو قدرت نے ایک طویل ساحلی پٹی سے نوازا ہے۔ اس گراں قدر قدرتی تحفے سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاحوں کے لیے بنیادی سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے گا۔ معیاری قیام و طعام کی سہولیات کے ساتھ ساتھ صحت مند تفریحی سرگرمیوں کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ساحلی علاقوں کو نئی شکل دے کر سیاحوں کے لیے پرکشش بنایا جانا بھی دونوں ممالک کی اس اہم ترین شراکت داری کا خصوصی پہلو ہے۔ گوادر شہر میں بین الاقوامی معیار کے ہوٹلز کا قیام پہلے ہی ممکن بنا دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رہائشی ضروریات کو پورا کرنے کی لیے بڑے پیمانے پر ہاوسنگ سوسائٹیاں بھی قائم کی جا رہی ہیں۔ دورِ جدید کی تیزی سے ترقی کرتی ہوئی انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے کئی ایک منصوبے زیرِ تکمیل ہیں اور چند ایک مکمل ہو کر فعال بھی ہیں۔ آپٹیکل فائبر کیبل کو بچھانے کے لیے دونوں ممالک کے درمیان ایک اعلیٰ سطحی معاہدہ ہوا، جس کے تحت چینی ٹیلی کام کمپنی پاکستان میں نئی آپٹیکل فائبر بچھانے کا کام مکمل کر رہی ہے۔

پاک چین اقتصادی راہداری کا منصوبے بلاشبہ دونوں ممالک کے درمیان ایک وسیع الابنیاد شراکت داری کا سلسلہ ہے۔ اس راہداری سے جہاں ایک طرف پاکستان کو بے پناہ فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہیں چین بھی مستفید ہو رہا ہے۔ چین کی مصنوعات کو دنیا کے دیگر ممالک میں بھیجنے کے لیے گوادر سی پورٹ ایک اہم گیٹ وے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں چینی مصنوعات کو کم وقت اور اخراجات میں باآسانی بیرونی ممالک میں بھیجا جا سکتا ہے۔ چینی کمپنیوں کا پاکستان میں ترقیاتی کاموں میں شامل ہونا انہیں بین الاقوامی سطح پر

اچھی ساکھ بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ چینی بنکوں سے اس راہداری منصوبوں کے لیے قرضوں کا حصول چینی معیشت کو مستحکم کرنے میں بھی اہم کردار کا حامل ہے۔ چینی ماہرین کا ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے پاکستان میں آنا اور اپنے شعبے کے پاکستانی ماہرین سے مکالمہ بھی ایک خوش آئند پیش رفت ہے۔ سی پیک منصوبے کے اجراء سے دونوں ممالک کے مابین اعتماد کی فضاء میں مزید گرم جوشی پیدا ہوئی ہے اور دونوں ممالک کے اقتصادی ماہرین کے باہمی مشورے سے دونوں ممالک کی حکومتوں نے اس اہم امر کا فیصلہ کیا ہے کہ باہمی تجارت کو مقامی کرنسی میں باقاعدہ طور پر قبول کیا جائے گا۔ چینی کرنسی یوآن کا عالمی کرنسی مارکیٹ میں دن بدن مضبوط ہونا اور اسے بین الاقوامی تجارت کے لیے عام کرنا چین کے ایک اقتصادی طاقت ہونے کی واضح نشانی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عابد علی عابد، مشاہیر چین، فیکٹ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۵

۲۔ عبد الغنی شیخ، لداخ تہذیب و ثقافت، کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳

۳۔ عبد المنان / محمد حسیب، چینی ثقافت (مضمون) مشمولہ چین شناسی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۶۸

۴۔ عبد الغنی شیخ، لداخ تہذیب و ثقافت، کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳

۵۔ میجر جنرل (ر) محمد جعفر، (دیباچہ) مشمولہ چین شناسی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۱۱

۶۔ اسد شیخ / پروفیسر چانگ وے، چینی تہذیب و تاریخ، مرتبہ چینی شناسی، ڈاکٹر عبد الواحد تونسوی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۲۸

۷۔ دائے جیان بِنگ، چین پاکستان ثقافتی تبادلوں کی تاریخ، مترجمہ خَہ مئے لَین، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص ۱۰۹-۱۱۰

۸۔ یاسر جواد (مترجم)، سفر نامہ فائیان، تخلیقات، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۷

۹۔ یاسر جواد (مترجم) ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند، تخلیقات، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۷

۱۰۔ گووَیالنگ، / رین شوئے مئے / مظہر عالم، چین پاکستان ثقافتی تبادلوں کی تاریخ، مترجمہ خَہ مئے لَین، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص ۱۶۶-۱۶۷

۱۱۔ ایضاً" ص ۱۷۱

۱۲۔ سید فراست شاہ، مشرق کو ذرا دیکھ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۱

۱۳۔ حاجی ابراہیم ٹی۔ وائی، چین کے مسلمان: مختصر تاریخ، مترجم تابش صدیقی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۹

۱۴۔ وانگ جن سائے، چین پاکستان ثقافتی تبادلوں کی تاریخ، مترجمہ خَہ مئے لَین، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص ۱۱۵-۱۱۶

۱۵۔ گوپال متل، (مترجم) چین میں اسلام کا ماضی اور حال از ڈیوڈ لیو، نیشنل اکاڈمی دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۵

۱۶۔ عبد الوحد تونسوی، ڈاکٹر، (تمہید)، چین شناسی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۱۵

۱۷۔ عبدالمنان/محمد حسیب، چینی ثقافت، (مضمون)، مشمولہ چین شناسی،مرتب عبدالواحد تونسوی/چانگ وے سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۲ء، ص۶۸

۱۸۔ کوثر جمال،ڈاکٹر،چین میں اردو، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۶ء، ص۷

۱۹۔ خط بنام کوثر جمال،ڈاکٹر،۲۸مارچ۱۹۸۶ء، ص۸

۲۰۔ ص۱۶

۲۱۔ ص۱۸

۲۲۔ چانگ وے، ڈاکٹر، (پیش لفظ)، مشمولہ چین شناسی،مرتب عبدالواحد تونسوی/چانگ وے سانجھ پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۲۲ء، ص۱۳

۲۳۔ شفیق عجمی، ڈاکٹر، تہذیبوں کے درمیان مکالمہ (ترجمے کا کردار)، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور ، ۲۰۱۸ء، ص۱۲

۲۴۔ ایس ایم حالی، چینی کمیونسٹ پارٹی کے سوسال،رومی اکیڈمی،اسلام آباد،۲۰۲۱ء ص۲۱

۲۵۔ چانگ وے،ڈاکٹر،(پیش لفظ)، مشمولہ چین شناسی،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۲ء، ص۱۳

۲۶۔ ایس ایم حالی، چینی کمیونسٹ پارٹی کے سوسال،رومی اکیڈمی،اسلام آباد،۲۰۲۱ء، ص۲۲-۲۳

۲۷۔ ایس ایم حالی، چین کی کامیابیوں کی کہانی،رومی اکیڈمی،اسلام آباد،۲۰۱۵ء، ص۱۵۷

۲۸۔ ایس ایم حالی، چین کی کامیابیوں کی کہانی، ص147

۲۹۔ ایس ایم حالی، چینی کمیونسٹ پارٹی کے سوسال، ص۹۷

باب سوم:

چینی نثری تراجم میں تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی

ادبی متون اپنی زبان کے ثقافتی اور سماجی پس منظر کے پرتو ہونے کے باعث اپنی معاشرت کے نقیب تصور کیے جاتے ہیں۔ الفاظ کی بنت اور ان کی ساختیاتی تفہیم کا پہلا موقع اسی زبان کے جاننے والے بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ترجمہ کاری کو عام طور پر دوسرے درجے کی صنف تصور کیے جانے کے باعث ادبی متون کے تراجم کو ایک حد تک ہی اپنے اصل کا متبادل تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم اس تصور سے تراجم کی اہمیت کسی طور کم نہیں ہوتی۔ اگر اس تصور کو درست مان لیا جائے تو اب تک تراجم سے ہونے والی شعوری بیداری پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ بادی النظر میں فکری و نظریاتی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انسانی معاشروں کو ترقی کے سفر پر گامزن کرنے میں بھی تراجم کا کردار اظہر من الشمس ہے۔ تہذیبوں کے درمیان ہمیشہ سے رابطوں اور تعلقات کی صورت قائم رہی ہے۔ یہ تبادلہ دوطرفہ بھی ہوتا ہے اور یک طرفہ بھی۔ بعد ازاں ایک تہذیب انسانی مسائل کو حل کرنے میں بسا اوقات انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں سے ہم کنار ہو کر دیگر تہذیبوں کے لیے مشعل راہ کا کردار ادا کرنے کا قابل ہو جاتی ہے۔ یوں تہذیبوں کا مکالمہ نسلِ انسانی کے لیے ایک نعمت کی صورت میں اپنا کرداد ادا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

چینی ادب دنیا کے قدیم ترین ادبی ذخیرے میں شمار ہوتا ہے۔ اردو زبان میں چینی ادب کو ترجمہ کرنے کی روایت ایک صدی سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ تاہم اس روایت میں نمایاں اضافہ گزشتہ چند دہائیوں میں اس وقت دیکھنے میں آیا جب پاکستان اور چین کی حکومتوں کے مابین تجارتی، سفارتی اور دفاعی تعلقات کی طرح ثقافتی تعلقات میں دوطرفہ تعاون کے منصوبوں کا آغاز ہوا۔ خاص طور پر چینی زبان کی دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر لسانیات اور ادبِ عالیہ کے طالب علموں کی توجہ اس عظیم زبان کے ادبی ذخیرے کی جانب مبذول ہوئی۔ چینی ادبی تراجم کی ایک معقول تعداد اردو دان طبقے کے لیے میسر ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ اردو زبان کی نمایاں ادبی تصانیف کو بھی چینی زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ بھی تواتر اور تندہی سے جاری و ساری ہے۔

عالمگیریت کے عہدِ رواں میں مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کے مابین ہم آہنگی کا اعلیٰ انسانی وصف پیدا کرنے میں تراجم کا کردار متعین کرنا اہلِ علم و دانش کے ہاں ایک دل چسپ موضوع ہے۔ دورِ حاضر کو جہاں ایک طرف تہذیبوں کے درمیان تصادم کے تباہ کن تصور سے منسلک کرنے کی مربوط اور مذموم کوششیں کی جاتی رہی ہیں، وہیں عالمی طاقت ور حلقوں نے اس مذموم نظریئے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے سیاسی بساط کو اس انداز سے بچھایا ہے کہ خیالات کے تبادلے اور مکالمے کے بجائے مجادلے اور مسلح تصادم کو کسی قدر اثر انگیز حکمت عملی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ٹکراؤ اور الجھاؤ کے اس ماحول میں ذہنی خلفشار کو اطمینان میں بدلنے میں جہاں دیگر امور اہم ہیں، وہیں ادبیاتِ عالم کا ترجمہ ایک اہم ترین اور پر اثر محرک کے طور پر اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کردار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس امر پر توجہ کی جائے کہ ادبی متون اپنے تہذیبی عناصر کو کس حد تک سموئے ہوئے ہیں اور ان میں ایسے عناصر کی پیش کش کا کیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ تہذیبی مکالمے کے لیے ترجمے کی آفادیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر عابد حسین سیال یوں رقم طراز ہیں:-

> "ترجمے کی محدودیت کو تہذیبی مکالمے کی محدودیت سمجھنا درست نہیں۔ ترجمے میں زبان اور اس کے لوازمات کی کارفرمائی اگرچہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن ترجمے کی کلی مہارت کا انحصار لسانی مہارت پر نہیں۔ اس میں ایک بڑا حصہ تہذیبی عناصر کا ہے جو ترجمے کے ذریعے تفہیم و ترسیلِ معنی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید لسانیات متن کی تفہیم و تعبیر میں ثقافتی تناظر پر خاص طور پر زور دیتی ہے۔"[1]

چینی افسانوی ادب کے اردو تراجم میں جو اصنافِ ادب شامل ہیں، ان میں ناول، لوک ادب، افسانہ، سوانح عمری، ڈراما، سفرنامہ اور سائنس فکشن سمیت متفرق کہانیاں شامل ہیں۔ چینی ادبی تراجم کا یہ ذخیرہ اردو دان طبقے کے لیے چینی سماج اور تہذیب سے شناسائی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ان تراجم کی بدولت دو مختلف زبانیں بولنے والے افراد کے درمیان مکالمے کی فضاء پیدا ہو رہی ہے۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان ادبی تراجم کا اصناف کی بنیاد پر فرداً" فرداً" تعارف حاصل کیا جائے۔

۱۔ ناول

چینی ادب میں ناول ایک اہم ادبی صنف کے طور پر مقبول ہے۔ چینی زبان کے معروف افسانہ نگار اور ادیب لوشون کی ادبیاتِ چین کی تاریخ پر مبنی تصنیف سے اس امر کی گواہی ملتی ہے کہ دنیا کے دیگر خطوں کی مانند چین میں بھی داستان گوئی کا آغاز دیومالائی دور میں ہوا، جن میں مافوق الفطرت کرداروں، جنات، اور بھوت پریت کے عجیب وغریب واقعات شامل ہوتے تھے۔ تاہم اسکے ساتھ ہی ساتھ واقعہ نویسی اور حقیقت نگاری کی روایت بھی موجود رہی ہے۔ چینی ناول نگاری کی روایت حیران کن طور پر بہت قدیم ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعض چینی ناول انگریزی ادب کے اولین ناولوں سے بھی بہت پہلے لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر افتاب اقبال شمیم کا خیال ہے:-

> "چین میں فکشن کی ترویج واشاعت دنیا کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں زیادہ بھی اور پہلے بھی ہوئی۔ ممکن ہے مذکورہ روزنامچوں نے چین کے افسانوی ادب کی بڑھوتری میں کوئی کردار ادا کیا ہو۔ یہ بات قابلِ غور بھی ہے اور تاریخ ساز بھی کہ چین کا پہلا ناول "تین سلطنتوں کا رومان" چودھویں یا پندرہویں صدی میں لکھا گیا۔ مغربی دنیا میں سروانٹیز کے ناول ڈان کی ہوٹے Don Qixote کو دنیا کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ یہ ناول سترہویں صدی کے آغاز یعنی ۱۶۰۴ء یا ۱۶۰۶ء میں منظر عام پر آیا اور سروانٹیز نے بڑے تفاخر سے دعویٰ کیا کہ اس نے رومانوی داستانوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ ان "تین سلطنتوں کا رومان" تو دنیا کے اس پہلے ناول سے کم و بیش دو صدیاں پہلے لکھا گیا تھا۔"(۲)

اردو زبان میں اب تک چند ہی چینی ناولوں کا ترجمہ ہوا ہے۔ دستیاب دستاویزی شواہد کے مطابق سب سے پہلے جس چینی ناول کو اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا اس کا نام "چینی گاؤں" ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ظ انصاری، جن کا اصل نام سید ظلِ حسنین ہے، نے "چینی گاؤں" کے عنوان سے چینی ناول کا اردو ترجمہ کر کے اس روایت کی داغ بیل ڈالی۔ زیرِ نظر ناول مقبول چینی ادیب تیئن چن نے ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ لکھا تھا۔ ظ انصاری نے چینی ناول کے انگریزی ترجمے "VILLAGE IN AUGUST" سے اسے اردو زبان میں

منتقل کیا۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۰ء میں، اس ناول کو اردو دان قارئین کے استفادے کی غرض سے پیش کیا گیا۔ اس ناول کا بنیادی موضوع چین پر جاپان کے سیاسی اثر ورسوخ کے خلاف مقامی باشندوں میں پایا جانے والا اضطراب تھا۔ معروف امریکی ادیب، صحافی ایڈگر سنو کا کہنا ہے کہ یہ وہ اولین چینی ناول ہے جسے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

ظ انصاری ہی کا دوسرا چینی ترجمہ شدہ ناول "زلفوں کے سائے میں" اس روایت میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بھی انگریزی ترجمے کی مدد سے اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ چینی ناول نگار شہیہ ین نے اسے دوسری عالمی جنگ کے دوران لکھا تھا۔ اس زمانے میں جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ جنگی ماحول میں ایک دور افتادہ گاؤں میں رہ کر فوجی ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ شہیہ ین نے رومانوی ناول لکھ کر چینی ادب کو ایک نئی جہت سے متعارف کروایا۔ اس ناول کی کہانی بنیادی طور پر ایک ایسے سپاہی کے گرد گھومتی ہے جو دورانِ ملازمت زخمی ہوا۔ اس ناول کا انگریزی ترجمہ ‘‘IT HAPPENED AT WILLOW CASTLE’’ کے عنوان سے پیکنگ سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ جلد ہی اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ظ انصاری نے اس ناول کا ترجمہ "زلفوں کے سائے میں" کے عنوان سے کر کے ۱۹۵۳ء میں مکتبہ شاہراہ، دہلی سے شائع کروایا۔ اٹھاسی صفحات پر مشتمل یہ مختصر ناولٹ ایک خوب صورت چینی ادب پارہ ہے۔

چینی ناول نگار ژانگ زیان لیانگ کا لکھا گیا ناول "ادھورے مرد" بنیادی طور پر چین میں اس عہد کی عکاسی کرتا ہے، جب یہاں ثقافتی انقلاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ چینی سیاسی تاریخ میں ۱۹۴۹ء کی آزادی کے بعد نوزائیدہ مملکت کو بے پناہ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کا سامنا تھا۔ انقلابی حکومت نے سابقہ دورِ غلامی کی تمام یادگاروں کو مٹانے اور اپنے سماج کو زمینی حقائق سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بے پناہ اقدامات اٹھائے۔ ان امور میں ثقافتی معاملات بھی شامل تھے۔ اس دور میں سخت نامساعد حالات میں عوامی طبقہ کے ذہن کو فنکارانہ مہارت سے اس ناول میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ انور غالب نے کیا ہے، جب کہ ادارہ مشعل پبلی کیشنز، لاہور نے ۱۹۹۶ء میں اسے شائع کیا۔ فلیپ پر موجود تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں ثقافتی انقلاب کے دوران ایک نوجوان کو باغیانہ شاعری کرنے کے جرم میں لیبر کیمپ بھیج دیا جاتا ہے۔ زندگی

کی اس اندھیری رات میں اسے وہاں ایک عورت کی شکل میں روشنی کی ایک نئی کرن نظر آتی ہے۔ لیکن کئی سال کی جبری مشقت کے بعد جب وہ اسے شادی کرتا ہے تو زندگی کے اس حصے میں پہنچ چکا ہے کہ اب اس رشتے سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ برق رفتاری سے تبدیلی کے عمل سے دوچار معاشرے میں ایک فرد کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کو اس ناول میں فن کارانہ مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔

چینی ادب کے تراجم میں اکادمی ادبیات کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ۲۰۲۲ء میں اکادمی کی سرپرستی میں چینی ادب کے ایک اہم ناول DECODED کا اردو ترجمہ "افشائے راز" کے نام سے پیش کیا گیا۔ معروف مترجم اور ادیب ڈاکٹر محمد عاصم بٹ نے اسے انگریزی متن کی مدد سے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ناول کا موضوع اپنی نوعیت کا منفرد اور دل چسپ ہے۔ اس میں خفیہ نگاری کے اہم دفاعی شعبے کے اسرار و رموز کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ چینی ادیب مائی جیا کا لکھا گیا یہ ناول فوجی حکمت عملی کو ترتیب دینے اور مادرِ وطن کے دفاع کو مضبوط و ناقابلِ تسخیر بنانے میں ایک عسکری اہلکار کے جذبات کی زبردست عکاسی ہے۔ مذکورہ ناول جہاں ہمیں ایک جانب چین کی ثقافت اور عوامی رجحانات کی تصویر پیش کرتا ہے وہیں وہاں کی حکومت کی بھرپور دفاعی قوتوں اور اس بارے میں کیے جانے والے خصوصی اقدامات سے متعلق قارئین کی آگاہی میں اضافہ کرتا ہے۔ پاک چین بے مثال دفاعی تعاون کے پس منظر میں اس ناول کی اہمیت میں اضافہ دوچند ہو جاتا ہے۔

چینی ناولوں کے تراجم میں سب سے اہم نام چین کے مشہور زمانہ تاریخی ناول "تین سلطنتوں کی داستان" کا ہے۔ دیگر چینی ادب پاروں کی مانند اس ناول کو بھی انگریزی زبان کے ترجمے سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس تاریخی ناول کو چینی کلاسیکی ادب کے چار اہم ترین اور مقبول ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چینی زبان میں لکھے گئے اس ناول کا دنیا کی تمام اہم زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس ناول کو ترجمہ کر کے سب پہلے انگریزی میں ۱۸۲۰ء میں پیش کیا گیا۔ جب کہ ۲۰۱۵ء میں اس ناول کا اردو ترجمہ ظہور احمد نے پیش کیا۔ تاحال اس ترجمے کے دو ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ادارہ ترجمہ و تالیف، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ جب کہ دوسرا ایڈیشن نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام ۲۰۲۱ء میں انتہائی نفاست اور دیدہ زیب شکل میں شائع کیا گیا۔ ۴۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل اس ترجمے کے مترجم کا تعلق

فارن سروس آف پاکستان سے ہے۔ فاضل مترجم کو اپنے پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی کی غرض سے دارالحکومت بیجنگ میں لگ بھگ تین برس تک قیام پذیر ہونا پڑا۔ اس دوران ترجمہ کاری کی اس اہم سرگرمی کو سرانجام دیتے ہوئے سماجی اور تہذیبی پس منظر سے بخوبی آگاہی میسر آتی رہی۔ فاضل مترجم نے اس ترجمے کو پاک چین دوستی کے نام کرتے ہوئے اپنے والدین کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے دوستی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس اہم کاوش کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کتاب کی ابتداء میں پاکستان میں تعینات چین کے سفیر عزت مآب جناب یاؤجنگ کا خصوصی پیغام پیش کیا گیا ہے۔ اس پیغام میں انہوں نے اس ترجمے کو پاکستان اور چین کے درمیان ثقافتی روابط کے فروغ میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا۔ معروف چینی ادیب لوگوان چھونگ کے چودھویں صدی عیسوی میں لکھے گئے اس تاریخی ناول میں بنیادی طور پر ہان سلطنت کے چینی سیاسی منظرنامے کو پیش کیا گیا ہے۔ تاریخی طور پر چین میں ہان سلطنت کا دور ۲۰۶ قبل مسیح سے ۲۲۰ عیسوی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر نثار ترابی یوں رقم طراز ہیں:-

> "چین کے اس مقبولِ عام قدیم کلاسیکی ناول (جسے داستانوی طرز پر تخلیق کیا گیا ہے) کے سات حصے تاریخی اور تین حصے افسانوی ہیں۔ مذکورہ ناول کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے جبکہ اردو میں اسے پہلی بار ترجمے کی شکل میں پیش کرنے کا سہرہ ڈاکٹر ظہور احمد کے سر جاتا ہے جو ناصرف یہ کہ ایک اچھی شہرت رکھنے والے سفارت کار ہیں بلکہ انہیں چین کے عظیم ثقافت و ادب سے بھی خصوصی لگاؤ ہے۔"(۳)

"تین سلطنتوں کی داستان" عوامی جمہوریہ چین کے نہ صرف ادبی حلقوں میں مقبول ہے بل کہ عوامی حلقوں میں بھی اس ناول کو بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی ناول نے چینی کے ہمسایہ ممالک جاپان اور کوریا کے ادبی منظرنامے پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ چینی بچوں میں اس کی مقبولیت ہی کے پیشِ نظر اس کی کہانی اور کرداروں پر مبنی ٹی وی ڈرامے، ویڈیو گیمز، فلمیں اور کتب تیار کی گئی ہیں۔ اس ناول میں دکھائی گئی اخلاقی اور انسانی اقدار کو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پیکنگ یونیورسٹی، بیجنگ میں قائم شعبہ اردو کے صدر نشین پروفیسر تھانگ منگ شنگ کا مختصر تبصرہ بھی اس ترجمے کی ابتداء میں موجود ہے۔ انہوں نے چینی ادب کے اس شاہکار ادب پارے کی اردو زبان میں پیش کش کا زبردست خیر مقدم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

اس ترجمے سے اردو زبان جاننے والے افراد میں چینی ثقافت کو سمجھنے کا سنہری موقع میسر آئے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ "تین سلطنتوں کی داستان" ایک تاریخی ناول ہے جس میں چینی معاشرے اور چین کے لوگوں کی زندگی، سیاست اور جنگی حکمت عملی کے بارے میں سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ عظیم ناول چینی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

زیرِ نظر ناول میں کرداروں کے حوالے سے اگر توجہ کی جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اس میں کرداروں کا ایک جمِ غفیر موجود ہے۔ چند ایک مرکزی کرداد ضرور موجود ہیں، مگر کسی ایک کردار کو ہیرو کے طور پر پیش کیا جانا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ چینی زبان میں ناموں کی تشکیل ایک خاص ترتیب سے مکمل ہوتی ہے۔ خاندانی نام کا حصہ ابتداء ہی میں ہوتا ہے جب کہ شخصیت کا ذاتی نام خاندانی نام کے بعد آتا ہے۔ بسا اوقات چینی ناموں کے ساتھ ساتھ معروف نام یا صفاتی نام بھی موجود ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی دوسری زبان کے قاری کو دونوں ناموں میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو اگر ہم اپنی تہذیب اور سماج کے تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی لوگوں کے نام میں خاندانی ناموں کو اولیت دی جاتی ہے۔ بعد ازاں شخصیت کا ذاتی نام شامل کیا جاتا ہے۔ عرفیت کی بنیاد پر مقبول ہونے والے ناموں کا سلسلہ بھی ہمارے ہاں عام ہے۔ فاضل مترجم نے اس ترجمے میں اردو قارئین کو الجھن سے بچانے کے لیے بنیادی معلومات بھی فراہم کیں ہیں جس کے مطابق چینی ناموں کی ترتیب مغربی ناموں سے الٹ ہے۔ یہاں خاندانی نام پہلے آتا ہے اور ذاتی نام بعد میں۔ مثال کے طور پر چوگے لیانگ کا خاندانی نام چوگے تھا اور ذاتی نام لیانگ۔ اسی طرح ناول کے ایک اور اہم کردار لیو بے کا خاندانی نام لیو تھا جب کہ اس کا ذاتی نام بے تھا۔ عہدِ قدیم میں مشاہیر کو قومی خدمات کے اعتراف میں سرکاری طور پر خطابات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ اہلِ علم کی فضلیت کے باعث قدیم چین میں علماء کو القابات سے یاد کیے جانے کی ایک خوب صورت روایت موجود رہی ہے۔ ایسی ہی تابندہ روایت ہند اسلامی تہذیب میں اپنے پورے تزک و احتشام کے ساتھ موجود ہے۔

فاضل مترجم ڈاکٹر ظہور احمد بنیادی طور پر ایک سفارت کار ہیں۔ مقبول چینی ناول کو اردو زبان میں پیش کرنے کا خیال انہیں چین میں اس وقت آیا جب وہ اپنے پیشہ وارانہ فرائض کی بجا آوری کی غرض سے عوامی جمہوریہ چین میں پاکستانی سفارتی اہلکار کے طور پر وہاں مقیم تھے۔ یوں انہیں چینی تہذیب و ثقافت کو

قریب سے دیکھنے کا ایک سنہری موقع میسر آیا۔ اگرچہ آپ کا تعلق سفارتی امور سے تھا، مگر ادبی ذوق کے باعث ان کے ترجمے میں ایک خاص قسم گہرائی اور ادبی چاشنی کا خوب صورت مرقع موجود ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ رواں، سلیس اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے جس کی بدولت ایک کم پڑھے لکھے شخص کے لیے بھی اس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ پروفیسر تھانگ بنگ شنگ اسی وجہ سے کتاب کے پیش لفظ میں یوں لکھتے ہیں:-

> "مجھے اس کتاب کا خیر مقدم کرنے میں تہہ دل سے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ پاکستانی عوام اور اردو شناس طبقے کو چین کی ثقافت، حکمت اور معاشرت سے متعارف کروائے گا۔۔۔ اس کتاب کا شائع ہونا نہایت خوش آئند قدم ہے اور اس سے پاکستان اور چین کے عوامی اور ثقافتی تعلقات کے فروغ میں مدد ملے گی۔۔۔ اس کا ترجمہ کرنے کے لیے چینی روایت اور تاریخی پس منظر سے شناسائی ضروری تھی۔ ظہور احمد صاحب نے چین میں قیام کے دوران چینی ثقافت اور اندازِ فکر پر تحقیق کی ہے جس سے وہ اس داستان کو عام فہم انداز میں اردو دان طبقے تک پہنچانے میں کام یاب ہوئے ہیں۔"(۴)

چینی نژاد اردو شاعر چانگ شی شوان، جنہیں اردو ادبی حلقوں میں انتخاب عالم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک زبردست شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پاک چین دوستی کے سفیر بھی ہیں۔ "گلبانگِ وفا" کے نام سے اپنا اولین اردو شعری مجموعہ ۱۹۹۸ء میں پیش کر کے ادبی ناقدین کو ورطہ حیرت میں ڈال چکے ہیں۔ انہوں نے بھی اس ناول پر اپنا نقطہ نظر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کتاب کے ترجمے کے آئینے میں پاکستانی عوام سمیت اردو بولنے والے تمام قارئین کو اس دور کی چینی تاریخ اور ثقافت کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔

> "ظہور صاحب نے چینی کلاسیکی ناول "تین سلطنتوں کا رومانس" کا اردو ترجمہ کر کے پاکستان اور چین کے درمیان ثقافتی تبادلے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب ظہور احمد کی لائی ہوئی بادِ مشرق کے زیرِ اثر چینی سے اردو اور اردو سے چینی میں ترجمے کہ بہار جلد آ ہی جائے گی۔"(۵)

زیر نظر ترجمے کی ابتداء میں فاضل مترجم نے ایک تفصیلی اور بھرپور مقدمہ قلم بند کیا ہے، جس میں انہوں نے ترجمے کی غرض وغایت کو پیش کیا ہے۔ ترجمے کے دوران درپیش مسائل کو بھی منفرد انداز میں زیرِ

بحث لایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چینی ناول کی درست تفہیم کو یقینی بنانے کے لیے بنیادی نوعیت کی اہم معلومات بھی فراہم کیں ہیں۔ مختلف کرداروں کے عمومی مزاج، چینی تاریخ کے اہم سنگِ میل، ثقافتی عناصر، میل جول اور رہن سہن کے امور کو داخلِ مضمون کر کے قارئین کی تشنگی کی خوب تسکین کی گئی ہے۔ چین میں مختلف ادوار میں اثر و رسوخ رکھنے والے مذہبی عقائد و نظریات، معتبر مذہبی شخصیات اور ان کے افکار کی ایک گہری چھاپ ناول کے مختلف مقامات پر واضح ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے تعارفی تحریر میں ان کے بارے میں بھی بنیادی معلومات فراہم کر کے مناسب کام کیا گیا ہے۔

ناول کے باقاعدہ ترجمے کے آغاز سے قبل ناول میں پیش کیے گئے دور کو قابلِ فہم بنانے کے لیے اس زمانے کے اہم واقعات کو بڑا عرق ریزی اور اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ ناول کے مختلف واقعات کو معروف چینی مصوروں نے اپنی فنی مہارت سے تصویری شکل میں بھی پیش کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی ابتدائی صفحات میں ایسی ہی چند تصویر پیش کی گئی ہیں۔

زیرِ نظر ترجمے کی چند اہم ترین باتوں میں سے ایک خاص بات یہ ہے کی اس میں جابجا شاعری کو بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ کہانی کے تقریباً" ہر اہم موڑ پر کسی نا کسی نظم یا شعر سے بات کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ادبی متون میں نثری متن کا ترجمہ کرنا نسبتاً" آسان اور سہل تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شعری متن کو ترجمہ کرنا انتہائی دشوار سمجھا جاتا ہے۔ فاضل مترجم نے شعری متن کے اس قدر خوب صورت اور دل کش ترجمے کیے ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ناول کی ابتداء میں ہی ایک شان دار نظم کا ترجمہ کیا گیا ہے جو بلاشبہ عظیم چینی ادبی شاہکار کے شایانِ شان ہے:۔

مشرق کو بہتا دریا

ہے پیہم رواں دواں

یہ دلیر جری سب فنا سب فانی

کیا گل اور کیا گلستاں

ڈھلتے سورج کی تپش میں

یہ سبز پہاڑ ہیں مگر جاوداں

کیا بہار کیا خزاں
تھکے ہارے محنت کش
مچھیرے اور باغ باں
دیکھ چکے کتنی بہاریں کئی خزاں
بیٹھ کر جام سرشار کے ساتھ
سناتے ہیں ایک دوجے کو
بیتے ہوئے سموں کی ایک انوکھی داستاں (۶)

چینی شاعری کے اس مرقع اور دیگر نمونوں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس کا مزاج ہماری ہاں کی شاعری سے قدرے مختلف ہے۔ اردو، فارسی اور عربی میں شعری روایت ایسے عناصر سے مزین ہے جس میں مابعد الطبعیاتی امور کا خاصا دخل ہے۔ اس کے برعکس چینی شاعری میں ارضی عناصر کو ہی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ تاریخی شخصیات کا تذکرہ بھی جابجا چینی شعری متون میں نظر آتا ہے۔ ایسی شخصیات کے تذکرے کو سمجھنے کے لیے چینی تاریخ سے واقف ہونا ازحد لازمی اور ضروری ہے۔

"تین سلطنتوں کی داستان" کا پہلا باب اس ازلی حقیقت سے شروع ہوتا ہے کہ کائنات ہمہ وقت ایک مسلسل تبدیلی کے عمل سے دوچار ہے۔ کائنات کی یہ تبدیلی انسانی سماج میں بھی رواں دواں ہے اور اسی کے باعث ہر کمال آخر کار زوال سے دوچار ہوجایا کرتا ہے۔ جب کہ ہر زوال کے بعد عروج بھی یقینی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں بھی ایک نہ ایک دن زوال کا شکار ہو کر نابود ہو جاتی ہیں۔ اسی آفاقی سچائی کی بنیاد پر چین کے تین اہم خاندانوں چو خاندان، ہان خاندان اور چھن خاندان کی باہمی لڑائیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال میں تین بہادر سورماؤں کی ایک ساتھ جینے مرنے کے اس عہد سے ہوتا ہے جس میں وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ہر حال میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

کتاب کے پہلے باب میں سلطنت کے خلاف زرد چادروں والے گروہ کی بغاوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس گروہ کا مقصد یہ دکھائی دیتا ہے کہ سلطنت کی شیرازہ بندی کو غیر مستحکم کر کے لوٹ مار کا ماحول پیدا کیا جائے۔

اس باغی گروہ کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شامل عوامی طبقہ کی بڑی تعداد ملک میں بدترین مالی ابتری کے باعث اس گروہ میں شامل ہوئی۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں جب اپنے عوام کی بنیادی ضروریات بہم فراہم کرنے میں ناکام ہو جاتیں ہیں تو عوامی طبقے کی حمایت سے محروم ہونا لازمی امر ہے۔ باغی گروہ کی جو پہچان اس ناول میں پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں پیلا رنگ نفرت کی علامت کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں کے ہاں پیلا رنگ ناآسودگی اور غمی کے حوالے سے خیال کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر باب میں سلطنت کے تین ایسے سورماؤں کے میثاقِ حریت کو پیش کیا گیا ہے جو بغاوت پر آمادہ گروہ کو کچلنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ ان تین کرداروں میں پہلا کردار چھنگ چان کے شہزادے شنگ کی اولاد کا ایک فرد تھا، جس کا اصل نام لیو بے تھا تاہم اسے شوان وے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک مفلوک الحال خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اپنے آباؤ اجداد کی اعلیٰ ظرفی اور نیک نامی کا امین بھی تھا۔ اس کا والد بدقسمتی سے اس کے لڑکپن میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ اسے اپنی ماں سے بے حد پیار تھا اور اس کی خدمت میں دل و جان سے حاضر رہتا تھا۔ شہنشاہ کی جانب سے زرد چادر والے باغی گروہ سے نمٹنے کے لیے سرکاری حکم کو جابجا سنا دیا گیا تھا، جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ عوام میں سے باصلاحیت لوگ اس مشکل صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بادشاہ کی دفاعی حکمت عملی میں شامل ہو کر ارضِ وطن کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیں۔ ایسے میں لیو بے کی ملاقات ایک ایسے ہم خیال شخص سے ہو گئی جو دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ حیران کن صلاحیتوں سے مالا مال یہ شخص چنگ فے تھا۔ ان دونوں کی ملاقات اپنے ہی ہم خیال شخص گوایو سے ہو جاتی ہے۔ یہ تینوں افراد ایک نقطہ پر متفق تھے کہ اپنے ملک کو باغیوں کی یلغار سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی ہے۔ "تین سلطنتوں کی داستان" کے اس آغاز سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ چینی قوم قدیم دور سے ہی بیرونی تسلط کو قبول کرنے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے۔

ناول میں پیش کی گئی صورتِ حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹ء میں شہنشاہ لنگ کے انتقال کے بعد مملکت میں سیاسی عدم استحکام کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ عمومی طور ہماری تاریخ میں بھی بسا اوقات ایسا ہوتا رہا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے واضح قانون کے نہ ہونے کے سبب نئی حکومت مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ بسا

اوقات ایسے ماحول میں جنگی حالات بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ شہنشاہ لنگ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو پر کرنے کے لیے شہنشاہ شیاؤ کو تخت نشین کیا گیا۔ شہنشاہ شیاؤ ایسی صورت حال کو قابو کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے سیاسی مخالفین انہیں اقتدار سے الگ کرنے کے لیے اندر ہی اندر منظم ہو رہے تھے۔ ایسے میں دنگ جو نامی سردار نے شہنشاہ کو اپنے مصاحبین کی مدد سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ شی ان کو شہنشاہ کے منصب پر فائز کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ شہنشاہ کی تخت نشینی سے بھی سیاسی صورت حال میں خاطر خواہ استحکام پیدا نہ ہو سکا۔ بل کہ سیاسی محاذ آرائی اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی جب شہنشاہ کو اپنے مخالفین کی چالوں سے بچنے کے لیے چھنگان نامی علاقے میں مقیم ہونا پڑا۔ ایسی صورت حال ہماری تاریخ کے مختلف بادشاہوں کے ساتھ بھی درپیش رہی۔ عظیم مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شیر شاہ سوری نے اپنے مختصر دورِ اقتدار میں ہندوستان کے طول و عرض میں بے پناہ ترقیاتی منصوبوں کی بنیاد ڈالی۔ بعد ازاں ظہیر الدین بابر نے دوبارہ اقتدار حاصل کر کے مغلیہ سلطنت کو وہ مضبوط بنیاد فراہم کی جس نے ہندوستان کی تاریخ پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر مغلیہ سلطنت نے انتہائی گہرے نقوش مرتب کیے۔

"ناول میں بنیادی کشمکش کاؤ کاؤ اور اس کے جانشینوں اور جنوب مغرب کی سلطنت شو کے لیوبی (Liu Bei) اور اس کے حلیفوں کے درمیان ہے، جس میں سلطنت کے وو (Wu) حکمران جنگ کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہوئے کبھی اول الذکر اور کبھی موخر الذکر کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیوبی، جو ہان خاندان کے سلاطین کو دور پار کا رشتہ دار ہے، ناول کے آغاز میں ایک تعلیم یافتہ لیکن غریب جولاہا تھا جو دریاں اور جوتے بناتا تھا۔ اس کے مسندِ اقتدار تک پہنچنے کا حال بیان کرتے ہوئے مصنف لیوبی کو مصنف ایک مثالی حکمران کے روپ میں پیش کرتا ہے جو اپنی رعایا کی خوش حالی اور اعلی اقدار کا قدردان ہے اور اپنے برتاؤ میں فیاض اور منصف ہے۔ اس کی عزتِ نفس کی حس اس قدر بیدار ہے کہ اکثر اوقات وہ متذبذب دکھائی دیتا ہے اور ہر اس قدم پر سوچتا نظر آتا ہے جو اسے شو (Shu) سلطنت کے تخت کی طرف لے جاتا ہے۔"[۷]

زیرِ نظر ناول سے چینی دفاعی میدان میں زیرِ استعمال ہتھیاروں اور اس شعبہ سے وابستہ دیگر آلات سے بھی بخوبی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یوں تو پانچویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی چینی مصنف سن زی کی کتاب "فنِ حرب وضرب" انتہائی خاصے کی چیز ہے۔ اس کتاب میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ عہدِ قدیم میں چینی سپاہی کس انداز سے اپنی سرزمین کا دفاع کیا کرتے تھے۔ اس اہم کتاب کے تراجم دنیا کی کئی ایک زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اردو زبان میں بھی اس کے اب تک دو تراجم سامنے آئے ہیں۔ "تین سلطنتوں کی داستان" میں بھی جابجا اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ برسرِ پیکار سلطنتوں کے اس مشکل دور میں جنگی سازو سامان کس نوعیت کا ہوتا تھا۔ زرد پگڑیوں والا باغی گروہ اپنے ہمراہ گھوڑے، تلواریں، نیزے اور آگ لگانے والے سامان کی فراوانی سے لیس ہونے کو اپنی کامیابی میں بنیادی اہمیت کا حامل تصور کرتا تھا۔ افرادی قوت کی اہمیت کے پیشِ نظر بڑی تعداد میں سپاہیوں اور معاون اہلکاروں کی دستیابی کو بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ ناول کے ابتدائی مراحل ہی سے جنگی سازو سامان کی مختلف نوعیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

"اگلے دن تینوں بھائیوں نے ہتھیار جمع کیے اور پانچ سو نوجوانوں کا ایک جتھہ تیار کیا۔ شوان وے نے اپنے لیے جڑواں دھاتی تلواریں بنوائیں اور سردار گوان کے لیے ایک سبز ہلالی خنجر جس کا وزن ۱۴ کلو گرام تھا۔ چنگ فے کے لیے ایک اٹھارہ ہاتھ لمبا نیزہ اور سب کے لیے زرہ بکتر۔"(۸)

چینی ہتھیاروں کی تفصیلات بہت دل چسپ بھی ہیں اور منفرد بھی۔ مارشل آرٹ میں ہتھیاروں کے بناء ہی اپنے ذاتی دفاع کو ممکن بنانے کی صلاحیت کو سکھایا جاتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ چند ہتھیاروں کے استعمال کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ عام طور پر قدیم جنگوں میں جو ہتھیار استعمال کیے جاتے رہے ہیں ان کی بنیادی طور پر تین اقسام ہیں، جن میں لمبے ہتھیار، چھوٹے ہتھیار اور نرم ہتھیار شامل ہیں۔

"لمبے ہتھیاروں میں برچھی، تلوار اور ڈانگ شامل ہیں۔ چھوٹے ہتھیاروں میں چاقو، خنجر اور ہکس (Hooks) کا شمار ہوتا ہے۔ نرم ہتھیاروں میں چابک، ننچاقو وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام ہتھیاروں میں تلوار سب سے مقبول ہے۔ چینی تلواریں چھوٹی، ہلکی اور

ان کی نوک ترچھی ہوتی ہے۔ تلوار کے دستے میں پھندنا بھی بندھا ہوتا ہے۔۔۔چے
مے گوئن ایک لمباساڈنڈا یاڈانگ ہے، جسے شاؤلین مندر کے بھکشو کنگ فو کے دوران
استعمال کرتے۔۔۔نرم ہتھیار کا استعمال سب سے کھٹن ہوتا ہے۔اس کی مدد سے مدِ
مقابل پر حملہ کرنا اور اسے چت کرنے کے لیے سرعت، مہارت اور بے حد مشق
چاہیے۔"(۹)

"تین سلطنتوں کی داستان" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی سماج میں علمِ نجوم کے ماہرین کی ایک خاص اہمیت ہے۔ امرااور عمائدینِ حکومت اپنے اہم امور کو ترتیب دینے سے قبل نجومیوں سے باہم گفت وشنید کیا کرتے تھے اور اس بات کا خاص خیال کیا کرتے تھے کہ کہیں ایسے وقت میں کسی کام کی ابتداءنہ کریں جس کے بارے میں نجومیوں نے منع کیا ہو۔ بادشاہِ وقت کے دربار میں نجومی کو خصوصی طور پر جگہ دی جاتی تھی۔ناول کے اہم کردار تھاؤ تھاؤ کو ایک نجومی نے ہی کہا تھا کہ ملک اس وقت نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا ادراک کرنا انتہائی درجے ضروری ہے۔ سلطنت تباہی کے دہانے پہنچ چکی ہے۔ عوام میں مایوسی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ انہیں اپنا مستقبل مخدوش دکھائی دے رہا ہے۔ان حالات میں ایک مدبر اور دوراندیش حکمران کی اشد ضرورت ہے۔ بقول نجومی کہ تھاؤ تھاؤ ہی ان مخدوش حالات میں قوم کو اس بحران سے نکال کر استحکام سے مالامال کر سکتا ہے۔ تھاؤ تھاؤ نے نجومی کی ان باتوں سے خوش ہو کر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا تھا۔ درحقیقت تھاؤ تھاؤ کی کامیابی میں اس کی موثر جنگی حکمت عملی کا بہت کلیدی کردار تھا۔ تھاؤ تھاؤ نے اپنی سیاسی بساط کو اس انداز سے ترتیب دیا تھا کہ مضبوط دفاعی حصار اور جاسوسی کے انتہائی معتبر نظام کو تشکیل دے کر اپنے دشمنوں کی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ چین میں جنگ کو ایک فن کے طور پر متعارف کروانے میں سن زو کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ سن زو کا تعلق پانچویں صدی قبل مسیح کے زمانے سے ہے۔ سن زو کی کتاب The Art of War کو جدید دور میں بھی دنیا کی بہترین افواج میں زیرِ تربیت کیڈٹس کو پڑھایا جاتا ہے۔ سن زو نے جنگ کے بارے میں دس اصول دیئے تھے۔ جن میں مقصد کا حصول اور اس پر کاربند رہنا، حوصلے اور مورال کو برقرار رکھنا، جارحانہ عمل، اپنی حفاظت، دشمن کو حیرت میں ڈالنا، فوجی قوت ایک جگہ ارتکاز، مناسب اور متوازن قوت کا استعمال، حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے لچک کا مظاہرہ کرنا، فوجی

اہلکاروں میں تعاونِ باہمی اور اپنی قوت کے ناگزیر معیار کو ہر ممکن حد تک بر قرار رکھنا ہے۔(۱۰)" تین سلطنتوں کی داستان" کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اس میں پیش کیے گئے ماحول میں سن زو کے دیئے ہوئے اصولوں کو ہی عملی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ناول کے پندرہویں باب میں ایک اہم کردار سُن تھہ کی ایک جنگی مہم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس جنگ میں وہ سراپا ترغیب بننے کے لیے بذاتِ خود سپاہیوں کے ہمراہ شانہ بشانہ لڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں اترا۔ اسی کردار کی جنگی حکمتِ عملی کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مترجم یوں رقم طراز ہیں:۔

> "وہ جنگی حکمتِ عملی میں اپنے جدِ امجد سُن زے کا صحیح معنوں میں وارث تھا۔ سن زے جنگی حکمت عملی پر مشہور کتاب "فنِ حرب" کے مصنف تھے۔۔۔اس نے کہا ہمارے بزرگوں نے کہا ہے کہ جس چیز کی دشمن کو امید نہ ہو وہ کرو اور اس جگہ سے حملہ کرو جہاں وہ تیار نہ ہو۔"(۱۱)

شہنشاہی نظام میں خواجہ سراؤں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے بیشتر خطوں میں جہاں جہاں مطلق العنان حکومتیں قائم رہی ہیں، ان میں کاروبارِ مملکت کو چلانے والے امراء کے گھروں میں خواجہ سراؤں کو اہم ذمہ داریاں تفویض کی جاتی تھیں۔ قدیم چین میں بھی قائم سلطنتوں کے حاکموں کی گھریلو زندگی میں ایسے افراد کو خصوصی توجہ حاصل رہی ہے۔ لوگوان چھونگ نے اپنے تاریخی ناول میں اس طبقے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ناول نگار نے جو اہم معلومات فراہم کیں ہیں اس کے مطابق خواجہ سراؤں کو محل میں اس قدر اثر ورسوخ حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اہم عہدوں پر تعیناتیاں کر دیا کرتے تھے۔ بادشاہ سے اس سلسلے میں مشاورت کو بھی گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ خواجہ سراؤں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں اس حد تک بڑھ چکیں تھیں کہ بادشاہ کے قریبی مشیران اور وزراء بھی ان کے خلاف کوئی اقدام اٹھانے سے کتراتے تھے۔ خواجہ سراء اپنے طبقے کی اجارہ داری اور اثرورسوخ کو قائم رکھنے میں قتل وغارت گری سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی شاہی حکومتوں کے چند ادوار میں خواجہ سراؤں نے سیاسی معاملات میں بے جا مداخلت کے شواہد ملتے ہیں۔ جس سے اس طبقے کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

درحقیقت خواجہ سراؤں کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جنہیں اکثر و بیشتر بنیادی انسانی حقوق بھی پوری طرح میسر نہیں ہوتے۔ ایسے افراد کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست نہ ہونے اور ان کے سرپرستوں کی جانب سے عدم توجہ کے باعث ان کی شخصیت کی تعمیر میں نقائص شامل ہو جاتے ہیں۔ قدرتی طور پر چند جسمانی تغیرات کے باعث مرد و زن میں گھلنے ملنے کی پابندی کے باعث ایسے لوگ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شہنشاہی نظام میں امراء اور بااثر افراد اپنے گھروں کے کام کاج، اپنی خواتین اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے انہیں اپنے محلات میں کل وقتی خدمت سرانجام دینے کے لیے اپنی کفالت میں لے لیتے تھے۔ چینی بادشاہ بھی ایسے افراد کو محل میں امورِ خانہ داری کی بجاآوری کے لیے شاملِ حرم کرتے تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کاروبارِ ریاست میں ان کی دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے باقاعدہ گروہ کی شکل میں اپنی سیاسی قوت کو تسلیم کروالیا۔ تھاؤ تھاؤ کے سرپرستوں میں بھی اسی خواجہ سرا گروہ کا نام آتا ہے جنہوں نے اپنی مرضی کا حاکم تخت نشین کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ناول میں زیرِ بحث خواجہ سراؤں نے مختلف اوقات میں مختلف کردار ادا کیا ہے۔ طاقت ور طبقات کی باہمی رقابت میں اس طبقے نے اپنے مفادات کے پیشِ نظر مختلف گروہوں کا ساتھ دیا ہے۔ بسا اوقات خواجہ سرا کسی ایسے فرد پر غداری کا الزام لگا کر بادشاہ کے عتاب کا شکار کیا کرتے تھے، جو ان کی منشا کے برعکس کوئی کام سرانجام دینے کی کوشش کرتا تھا۔

> "زوال کے اس دور میں محلاتی سازشوں اور خواجہ سراؤں کا کردار خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ایک طرف شہنشاہ کی حرم سرا میں مختلف خواتین اور اس کے خاندان طاقت کی جنگ میں مشغول تھے تو دوسری جانب خواجہ سرا اپنی بدعنوانی اور ظلم و ستم سے شاہی خزانے کو خالی کر رہے تھے اور عوام کی بے چینی میں اضافہ کر رہے تھے۔"(۱۲)

چینی خواتین کی قومی معاملات میں شمولیت اور مشکل حالات میں بہترین کردار ادا کرنے کی روایت نہایت قدیم ہے۔ "تین سلطنتوں کی داستان" کے مطالعہ سے اس حقیقت کی نقاب کشائی ہوتی ہے کہ چینی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کر رہی ہیں۔ تھاؤ تھاؤ کے مخالفین میں مادرِ ملکہ اور لیو بے کا نام اہم شمار کیا جاتا ہے۔ مادرِ ملکہ کے بیٹے سن چھوان کو لیو بے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس نے اپنی

حقیقی ہمشیرہ بیگم سُن کا رشتہ لیوبے سے طے کرنے کا ایسا منصوبہ بنایا، جس کا بنیادی مقصد اسے اپنے راستے سے ہٹانا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کرنے سے اس کی والدہ اور بہن کے دل میں لیوبے کے بارے میں نفرت پیدا ہو گی۔ شومئ قسمت حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ سن چھوان کا منصوبہ خود اس کے گلے پڑ گیا۔ اس سارے معاملے میں مادر ملکہ اور بیگم سُن نے زیرک اور معاملہ فہم خواتین ہونے کا واضح ثبوت دیا۔ شادی سے قبل مادر ملکہ نے اپنی دوراندیشی سے اپنے ہونے والے داماد لیوبے کو پرکھ لیا تھا۔ اگرچہ بیگم سُن کا مزاج سخت تھا لیکن اپنے شوہر کے معاملے میں اس نے ایک وفاشعار اور مخلص بیوی کا کردار بخوبی نبھایا۔ ایک موقع پر لیوبے نے اسے کہا کہ وہ اسے کسی مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا وہ اسے برضا رخصت کی اجازت دے۔ اس وقت بیگم سُن کا جواب سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ میں کسی بھی صورت آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں ہر مشکل میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑی رہوں گی۔ میں آپ کی محض بیوی ہی نہیں بل کہ آپ کی خادمہ بھی ہوں۔ زندگی کے یادگار دن بھی آپ کے ساتھ گزرے ہیں تو اب مشکل دنوں میں بھی آپ کے ہمراہ رہوں گی۔ دوسری جانب سن چھوان اپنی بہن کو لیوبے سے بیاہ کر سخت پریشانی کا شکار تھا۔ اپنے بہن سے بے حد انس ہونے کے باوجود اپنے بہنوئی کو ختم کرنے کے مذموم منصوبے بناتے ہوئے اسے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تاہم بیگم سُن ایک وفاشعار بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی وفادار ہی رہی۔ ایک موقع پر اس نے اپنے شوہر کو ایسا جواب دیا جو ایک بلند کردار کی عورت کے شایانِ شان تھا۔

"میں آپ کی خادمہ ہوں، جہاں آپ جائیں گے، میں بھی ساتھ ہی جاؤں گی۔۔۔ میرا بھائی یہ کیسے بھول گیا کہ میں اس کی بہن ہوں۔"(۱۳)

چینی اور پاکستانی ثقافت میں خواتین کو سماجی تشکیل میں خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ ملکی سماجی ترقی میں خواتین کی سرگرم شمولیت کو بنیادی اور اساسی اہمیت حاصل ہے۔ خواتین کا طبقہ کسی بھی معاشرے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں مردوں کے شانہ بشانہ اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیبوں کے مکالمے میں خواتین کی شمولیت سے کسی بھی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف تہذیبوں کے مابین اشتراکِ عمل کو ممکن بنانے میں خواتین نے اپنی بساط سے بڑھ کر کردار ادا کیا ہے۔ جب ایک معاشرے کی خاتون کسی دوسرے ماحول اور معاشرے میں بیاہی جاتی ہے تو وہ درحقیقت دو تہذیبوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ایسی خاتون اپنے میکے کی روایات کو بھی اپنے ہمراہ رکھتی ہے اور ساتھ ساتھ ہی ساتھ اپنے سسرال کی روایت کو بھی نئی نسلوں تک پہنچانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔"تین سلطنتوں کی داستان" کا مطالعہ اس جانب متوجہ کر رہا ہے کہ چینی خواتین بھی دنیا کی دیگر اقوام کی خواتین کی مانند اعلٰی انسانی روایات کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ محافظ بھی ہیں۔ ملکۂ مادر اور دیگر نسوانی کرداروں سے اس امر کی واضح دلیل میسر آتی ہے۔

شادی بیاہ کی رسومات کے حوالے سے ناول میں پیش کی گئی معلومات سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ممالک کے ہاں شادی کی رسومات میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔خواتین کے عروسی ملبوسات اور شادی کی تیاریوں میں روایتی جوش و خروش کو دونوں ممالک کی تہذیبی روایت میں خاص مقام حاصل ہے۔

مکتوب نگاری بھی اس ناول کا ایک خاص وصف ہے۔ناول میں کئی ایک مقامات پر مختلف کرداروں کے مابین خطوط کے تبادلے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں تھاؤ تھاؤ کے خطوط اہم ہیں، جن میں وہ حصول اقتدار سے قبل اور بعد میں درپیش معاملات پر بڑے نپے تلے انداز میں اپنے مخاطبین کو اپنا معافی الضمیر پہنچاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سردار گوان کے خطوط بھی اپنے اندر ادبی چاشنی کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ مثلاً" شوان وے کو لکھے گئے ایک خط مین سردار گوان یوں رقم طراز ہے۔

> "میری حقیر رائے میں کوئی چیز عزت و وقار سے زیادہ اہم نہیں اور وفاداری کا راستہ تو موت بھی نہیں روک سکتی۔ عہدِ جوانی سے میں نے چین کے کلاسیکی ادب کو نہایت غور سے پڑھا اور اپنی روایات کے بارے میں جانا۔۔۔ اگر میرے دل میں ذرا سی بھی بدنیتی ہو تو خدا اور بنی نوع انسان کی مجھ پر لعنت ہو۔ میں آپ سے اپنے دل کی بات لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ قلم اور ریشم کا کاغذ میری وفاداری اور خلوص کو بیان نہیں کر سکتے۔"[۱۴]

انسان کی قدر و منزلت اور اولعزمی کو چینی روایت میں بہت دل چسپ انداز میں سمجھا جاتا ہے۔ چینی لوگ زندگی کو اس شکل میں قبول کرتے ہیں، جس شکل میں وہ ہے۔ گویا چین میں زندگی کو ان ظاہری مظاہر کی بنیاد پر ہی گزرا جاتا ہے جو کہ مادی وجود کی حامل ہیں۔ مابعد الطبعیاتی امور کو باوجوہ اس قدر قبولیت میسر نہیں جس کے باعث مافوق الفطرت عناصر کو تشکیک کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ چینی فلسفے اور دانائی پر ایک اہم

کتاب لین یو تانگ نے لکھی تھی۔ اس کتاب سے حاصل ہونے والی معلومات سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ انسان کی سرشت میں جو عناصر شامل ہیں وہ سب مادی دنیا سے متعلق ہیں۔ لین یو تانگ لکھتے ہیں:-

"میں نے عرض کیا کہ انسان کی عظمت میں ایک آوارہ گرد کی فطرت کے چار عناصر شامل ہیں۔ اسی آوارہ گرد کو چینی ادب نے آسمان پر چڑھا رکھا ہے۔ آوارہ گرد کے چار عناصر یہ ہیں۔ ہر دم جواں تجسس، خواب دیکھنے کی صلاحیت، زندہ دلی اور ظرافت، جو ان خوابوں کی اصلاح کر سکے اور آخری عنصر یہ ہے کہ مزاج میں تلون ہو۔۔۔ یہ وہ عنصر ہے جو مل کر فرد کے بارے میں چینی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔"(۱۵)

"تین سلطنتوں کی داستان" بظاہر حصولِ اقتدار کے لیے برسرِ پیکار مختلف گروہوں کی جنگوں کی ہی عکاسی نہیں کرتی بلکہ ایک پورے سماجی، سیاسی اور تہذیبی منظر نامے کو بڑی عمدگی سے پیش کرتی ہے۔ شاہی محلات میں ہونے والی مختلف سرگرمیوں، اندازِ نشست و برخاست، امورِ سیاست، خارجہ تعلقات اور سفارتی وفود سے ہونے والی گفت و شنید سے اس دور کے رویوں اور طرزِ زندگی کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک تہذیبی ناول ہے جو چینی سماجی اقدار کو بڑی عمدگی اور فن کارانہ مہارت سے پیش کرتا ہو دکھائی دیتا ہے۔ یوں ایک تہذیب اپنی جیتی جاگتی صورت میں ایک دستاویز میں سمٹ کر سمو گئی ہے جو آنے والی نسلوں کو ایک عظیم ثقافتی ورثے سے جوڑ رہی ہے۔

ب۔ لوک ادب

اردو زبان میں منتقل ہونے والی چینی ادبی کتابوں میں شفیع عقیل کی کتاب "چینی لوک کہانیاں" ایک اہم ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی معاونت سے چھپنے والی اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں اس کا دوسرا اور ۲۰۱۷ء میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ تیسرے ایڈیشن میں پروفیسر سحر انصاری کے قلم سے کتاب کے آغاز میں ابتدائیہ کے عنوان سے ایک تحریر پیش کی گئی ہے۔ جس میں پاکستان اور چین کی مثالی دوستی کی تاریخ کا اختصار سے احاطہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر ترجمے میں چینی لوک ادب کی نمائندہ پندرہ لوک کہانیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ان کی تعداد دس تھی۔ اس ترجمے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ انجمن ترقیِ اردو پاکستان کے معتمد اعزازی

جناب جمیل الدین عالی کے قلم سے لکھا گیا ایک پر مغز مقالہ ہے۔ دراصل یہ تحریر پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت کتاب کے تعارف کے طور پر لکھی گئی تھی۔ جمیل الدین عالی لکھتے ہیں:۔

> "پاکستان اور چین ایک دوسرے کے قریب تو آ چکے ہیں مگر گہری مفاہمت کے لیے ایک دوسرے کی زندہ روایات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہ کام صرف حکومتوں کا ہی نہیں دونوں ملکوں کے عام آدمیوں کا بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چین میں پاکستانی مزاج کو سمجھنے کے لیے بہت کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں چینی عوام کا مزاج جاننے کے لیے، ان کے جدید انقلابی خیالات و عمل کو جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی لوک کہانیوں سے واقفیت بھی لازمی ہے۔"[۱۶]

زیرِ نظر کتاب کو محض ترجمے تک ہی محدود نہیں کیا گیا، بل کہ اس میں تہذیبی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ جناب شفیع عقیل نے اس کتاب کی ابتدا میں "پہلی بات" کے عنوان سے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ اس تحریر میں وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب میں شامل چینی لوک کہانیوں کو انگریزی ترجمے کی مدد سے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ دراصل لوک ادب اصناف ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو صدیوں کی اجتماعی دانش کے بعد سینہ بہ سینہ آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتا ہے۔ اس عمل میں ہر دور کے ثقافتی اور تہذیبی اثرات بھی ان داستانوں پر مرتب ہو جاتے ہیں۔ یوں ایک جانب یہ لوک کہانیاں اپنے سماج کی تہذیبی نمائندگی بھی کرتی ہیں تو دوسری جانب ان کی وجہ سے تہذیب بھی محفوظ ہو کر نئی نسلوں تک بھی بخوبی منتقل ہو جاتی ہے۔

فاضل مترجم کا کہنا ہے کہ انہوں نے کسی وقتی جذبے یا فوری رجحان کی بنیاد پر چینی لوک ادب کی معروف کہانیوں کو اردو میں ترجمہ نہیں کیا ہے بل کہ اس کے پیچھے دہائیوں پر محیط سوچ کار فرما ہے، جس کا بنیادی محرک عالمی سطح پر مختلف اقوام کے لوک ادبی روثے سے استفادہ حاصل کرنے کی بے غرض لگن تھی۔ اول اول یہ کہانیاں موقر اخبار روزنامہ جنگ میں ۱۹۶۶ء میں چھپا کرتی تھیں۔ بعد ازاں ان کہانیوں کو کتابی شکل میں منتقل کرنے کی طلب ہونے پر اسے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا۔ چینی لوک کہانیوں کے مختلف کرداروں کو مقامیت سے ہم آہنگ کرنے کی غرض سے ان میں بقدر ضرورت تبدیلی بھی کی گئی ہے۔ فاضل

مترجم نے اپنے اس عمل کی تائید میں مشہور مستشرق اور محقق سر رچرڈ ٹمپل کی کتاب "لیجنڈس آف پنجاب" کے دیباچے میں درج اس بات سے کی ہے کہ "کوئی وجہ نہیں کہ انھیں ادبی لحاظ سے تا حدِ امکان دل چسپ نہ بنایا جائے بشرطِ ان کرداروں کی بنیادی شخصیت پر کوئی فرق نہ آنے پائے۔"(۱۷) کتاب میں درج کہانیوں کے لفظی ترجمے کے بجائے سلیس اور رواں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں پیش کی گئی وضاحت سے اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ ترجمے میں ثقافتی مظاہر کو قارئین تک پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مترجم نے محض ترجمہ کہنے کے بجائے ترجمہ اور تہذیب قرار دیا ہے۔

> "یہ تمام کہانیاں چین میں صدیوں سے کہی سنی جا رہی ہیں اور ان کا سفر سینہ بہ سینہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا ثقافتی اور تہذیبی ورثہ ہے جو ہر دور میں زندہ رہتا ہے۔ لوک کہانیوں ہوں یا لوک گیت، وقت ان میں تبدیلیاں تو لا سکتا ہے مگر ختم نہیں کر سکتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوک ادب کسی ایک آدمی کی تخلیق نہیں ہوتا۔ اس میں نسلوں کے جذبات و احساسات اور صدیوں کے تجربات سموئے ہوتی ہیں۔ یہ تمام انسانوں کی مشترک تخلیق ہوتی ہے اور اسے تمام انسان مل کے اپنے دلوں اور ذہنوں میں زندہ رکھتے ہیں۔"(۱۸)

اس کتاب کی پہلی لوک کہانی "سرخ چشمہ" کے عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی FOLK TALES FROM CHINA نامی کتاب سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں چینی لوک کہانیوں کو پیش کرنے کے لیے ۱۹۶۲ء میں فارن لینگویجز پریس پیکنگ سے شائع کی گئی۔ اس چینی لوک کہانی میں دو بنیادی کردار ہیں۔ پہلا کردار شی تن کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شخص ایک بہادر، جفاکش، محنتی اور نیک نیتی سے زندگی گزارنے پر یقین رکھتا ہے۔ دوسرا نسوانی کردار جیڈے فلاور کا ہے۔ ضمنی کرداروں میں شی تن کی سوتیلی ماں اور سرخ چہرے والا شیطان شامل ہیں۔ اس لوک کہانی کا پلاٹ عام طور پر ہماری لوک کہانیوں سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ جس میں مافوق الفطرت عناصر کہانی کو نئے نئے موڑ دیتے ہوئے آگے بڑھاتے ہیں۔

اس کہانی میں تہذیبی اعتبار سے ہماری کہانیوں سے بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شی تن کی سوتیلی ماں اس بات کی خواہش مند ہوتی ہے کہ اپنے گاؤں کی سب سے خوب صورت لڑکی کو اپنے بیٹے کی دلہن بنا کر گھر لائے۔ مگر شادی کے فورا" بعد ہی روایتی ساس کی طرح اپنی بہو پر بے جا سختی کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ہر اچھے کام کو بھی تنقید کے نشتر چلا کر مایوس کرنا اس کا وطیرہ بن چکا تھا۔ ایسی ہی صورت حال اکثر اوقات ہماری لوک کہانیوں میں بھی سامنے آتی رہتی ہے، جس میں ساس اپنی بہو کو تگنی کا ناچ نچاتے ہوئے نظر آتی ہے۔ معروف چینی مفکر لین یو تانگ اپنی کتاب میں بھی میاں بیوی کے باہمی رشتے کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کی جانب توجہ دلاتے ہیں کہ:-

> 'میرے نزدیک کسی تہذیب کو پرکھنے کا فیصلہ کن امتحان یہ ہے کہ اس تہذیب نے کس قسم کے شوہر، کیسی بیویاں اور کیسے ماں باپ دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں؟ یہ سوال بے حد سادہ ہے لیکن اس کی اہمیت کے سامنے باقی تمام کارنامے، آرٹ، فلسفہ، ادب، مادی ترقی سب کے سب ماند پڑ جاتے ہیں۔"(۱۹)

"سرخ چشمہ" نامی اس کہانی میں ساس کی بے جا ظلم و زیادتی سے جیڈے فلاور کا شوہر بھی بری طرح پریشان تھا۔ آخر کار اس جہنم جیسی زندگی سے جان چھڑاتے ہوئے دونوں ایک روز گھر چھوڑ کر شمال کی جانب ایک طویل سفر کا آغاز کر دیتے ہیں۔ کہانی کے اس اہم موڑ پر بھی ایک خاص بات سامنے آتی ہے کہ ظلم جب حد سے گزرتا ہے تو مظلوم کے لیے بغاوت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کہانی میں بھی شی تن اور اس کی بیوی جیڈے فلاور روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر اپنے گھر کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے وہ اپنے اصطبل سے دو پھرتیلے اور تیز رفتار گھوڑے بھی ساتھ لے گئے۔ مظاہرِ فطرت کو بہت عمدہ اور خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہوئے فن کارانہ مہارت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں یہ سطور اپنی مثال آپ ہیں۔

> "وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں چاروں طرف پہاڑ تھے۔ یہاں کوئی آبادی دکھائی نہ دیتی تھی البتہ بہار کا موسم ہونے کی وجہ سے ہر طرف ہری ہری گھاس کا تختہ بچھا ہوا تھا۔ خود رو پھول پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور ان کی خوشبو نے فضا میں عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔ دور دور تک بچھے ہوئے سبزے میں رنگا رنگ پھول بڑا دل کش منظر پیش کر رہے تھے۔ آسمان پر کونجوں کی قطاریں خوشی میں بڑی سبک رفتاری سے

پرواز کرتی نظر آرہی تھیں اور درختوں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے پرندے چہچہا رہے
تھے۔"[۲۰]

چینی لوک کہانی "سرخ چشمہ" کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں انسانی عظمت کی برتری کو تسلیم کیا گیا ہے۔ سرخ چہرے والا شیطان اپنے تمام تر حیلے بہانوں اور سازشوں کے باوجود انسان کو مات دینے میں ناکام رہتا ہے۔ اگرچہ وہ جیدے فلاور کو اپنے جادو کے زور سے اس وقت قید میں لے لیتا ہے جب وہ اس کے سرخ چشمے کا پانی پی لیتی ہے۔ قید کرنے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ محل میں لے جا کر جھوٹ موٹ کی کہانیاں سنا کر اپنے دامِ محبت میں گرفتار کرنے کی بھی مذموم کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی شکل کو بھی تبدیل کر کے دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ مگر اپنے مکر و فریب کے باوجود ایک بہادر انسان شی تن کی ہمت کا مقابلہ کرنے سے محروم رہتا ہے۔ یوں اس سادہ سی کہانی میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ انسان کو کسی بھی موقع پر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کی قربانی دینا انسانی عظمت کی درخشاں مثال ہے۔

جناب شفیع عقیل کی ترجمہ کی گئی کتاب "چینی لوک کہانیاں" میں شامل دوسری کہانی کا عنوان "سورج کا سفر" ہے۔ یہی کہانی رشید بٹ نے بھی ترجمہ کی اور "سورج کی تلاش" کے عنوان سے اپنی کتاب میں شامل کی۔ یہ کتاب نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد کے تعاون سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی۔ جناب رشید بٹ کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کہانی کا تعلق چین کی چوانگ قومیت سے ہے۔ چین میں آباد سرکاری طور پر ۵۶ قومیتوں میں سے چوانگ قومیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چین میں مقامی قومیتوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جن میں لوک ادب کی ایک عظیم روایت موجود ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان لوک کہانیوں کے کرداروں میں خواہ عوامی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں یا امراء میں سے، سب میں ایک قدر مشترک دکھائی دیتی ہے کہ وہ سب اپنی سرزمین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان لوک کہانیوں کے اندر عوام کا بے لوث، جفاکش اور مخلص ہونا بہت فن کارانہ مہارت سے دکھایا گیا ہے۔

"ان لوک کہانیوں میں مرکزی کردار خواہ وہ عام لوگ تھے یا شہزادے، بادشاہ تھے یا
شہنشاہ، سب عوام کی فلاح و بہبود کے لیے دکھ اٹھاتے تھے۔ ان کہانیوں میں عوام کی

بے لوثی، دانائی اور جفاکشی جھلکتی ہے اور ظالموں کا، خواہ وہ اعلیٰ عہدے دار تھے، شہزادے بادشاہ یا شہنشاہ تھے، برا انجام دیکھنے کا آتا ہے۔ کہانیوں کا اندازِ بیاں بے حد دلکش ہے۔"(۲۱)

"سورج کا سفر" بنیادی طور پر انسانی عزم و ہمت کی خوب صورت داستان ہے جس میں ایک بہادر عورت اپنی قوم کو درپیش مشکل ترین صورت حال کو بدلنے کی غرض سے اپنی پوری زندگی کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔ یہی نہیں وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی اس عظیم مشن کے لیے تیار کرتی ہے۔ یوں وہ اپنی زبانِ حال سے یہ پیغام دے رہی ہے کہ وہی انسان تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جو بے غرض ہو کر دوسروں کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ زندگی بھر مشکلات سے دوچار ہو کر اپنی عمر گزار دیتے ہیں، مگر آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہترین معاشرہ چھوڑ جاتے ہیں۔

"سورج کا سفر" میں مرکزی کردار مالہے نامی خاتون کا ہے، جو ایک ایسے ملک میں مقیم ہے جہاں کئی صدیوں سے تاریکی اور اندھیرے کا راج تھا۔ سورج کا طلوع ہونا شاید ان پر موقوف کر دیا گیا تھا۔ ہر وقت روشنی کی عدم دستیابی کے باعث وہ سخت ترین اذیت کا شکار تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جنگلی جانور اور درندے بھی آدم خوری میں پیش پیش تھے۔ ایسے ماحول میں ہر روز کوئی نہ کوئی انسان لقمۂ اجل بن کر اپنے ساتھی انسانوں کے سامنے عبرت کا نشان بن جاتا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے اور مسئلے کے حل کے لیے تمام لوگ جمع ہوئے۔ اجتماعی سوچ بچار کے نتیجے میں وہ اس بات پر متفق ہوئے کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے سورج کے سامنے اپنی درخواست رکھی جائے کہ وہ اس علاقے پر بھی اپنی کرنیں بکھیرا کرے تاکہ طویل مدت سے جاری تاریکی کے ساتھ ساتھ جنگلی جانوروں کے خوف سے نجات کی صورت نکل سکے۔ چناں چہ اس فیصلے کے بعد اس بات کو طے کرنا انتہائی دشوار ہو گیا کہ سورج کی بارگاہ میں کس کو بھیجا جائے جو وہاں پہنچ کر اپنی قوم کی نجات کی کوئی صورت پیدا کر سکے۔

سورج کو ایک دیوتا کے طور پر اس چینی لوک کہانی میں پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کے زندہ رہنے میں جن چیزوں کا بنیادی کردار ہے ان میں سورج کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دی چنگ کے لوگ خود پر سورج کے طلوع نہ ہونے کو سورج دیوتا کی جانب سے ایک عذاب کے طور پر دیکھتے

تھے۔ زرعی معاشروں میں جہاں زندگی کا دارومدار زمین سے ہونے والی پیداوار سے منسلک ہے، ایسی صورت حال بہت بڑی آزمائش سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

فی زمانہ اس کیفیت کو موسمِ سرما میں ہونے والی موسمیاتی آلودگی (سموگ) کی تباہ کاریوں سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ صنعتی سرگرمیوں کے باعث ہوا میں مضرِ صحت گیسوں کے اخراج سے فضا میں آلودگی کی ایک تہہ بن جاتی ہے۔ سموگ کی اس کیفیت سے کئی کئی دن سورج طلوع نہیں ہوتا۔ وبائی امراض کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ فضا میں کثافتیں اس قدر بڑھ جاتیں ہیں کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ سانس لینے میں دشواری کے سبب نومولود اور بزرگ افراد کی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں تعلیمی سرگرمیوں کو بھی بری طرح نقصان پہنچتا ہے۔ تدریسی اوقاتِ کار میں کمی کر دی جاتی ہے۔ بسا اوقات سکول اور دیگر تعلیمی ادارے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ دفتری اوقات بھی تبدیل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ الغرض کاروبارِ زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ گو کہ یہ شدید موسمی کیفیت ایک مختصر مدت تک ہی باقی رہتی ہے مگر انسانوں کی مجموعی سماجی اور انفرادی زندگی پر انتہائی منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ دی چنگ قبیلے کے لوگوں کی اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ہونے والی سوچ بچار سے وہ ایک خاص نتیجے تک پہنچے۔

> "صرف سورج ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اگر ہم نے اس کی مدد نہ چاہی تو اس طرح ایک روز ہم سب موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔"(۲۲)

سورج کو اپنا نجات دہندہ تصور کرنے والے اس قبیلے کے افراد نے اپنا ایک نمائندہ مقرر کرنے کے لیے میدان میں اجتماعِ عام کا انعقاد کیا، تاکہ کسی قابل اور مناسب فرد کو اس مقصد کے لیے اپنا سفیر مقرر کیا جا سکے۔ جذبہِ حب الوطنی سے سرشار اس قبیلے کے ہر فرد میں اس بات کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی قوم کا نجات دہندہ بن کر اس عذاب سے چھٹکارا دلانے میں اپنی سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ نوجوان، بچے، بزرگ الغرض ہر فرد ہی اپنے تئیں خود کو اس نیک مقصد کے لیے اہل تصور کرتا تھا۔ نوجوان طبقے میں جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ تاہم بزرگ افراد نے اس نازک صورت حال میں اپنی ذمہ داری کا احساس

کرتے ہوئے معاملے کی سنگینی کی طرف متوجہ کیا۔ تاہم نوجوان طبقہ ان کی کسی بات سے متاثر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ اسی کش مکش میں ایک خاتون جس کا نام مالہے تھا، آگے بڑھی اور یوں مخاطب ہوئی۔

"بہتر یہ ہے کہ تم لوگ مجھے اس سفر پر جانے کی اجازت دو۔۔۔۔۔؟ میں اس لیے اس سفر پر جانا چاہتی ہوں کہ میں تنومند ہوں، باہمت ہوں۔۔۔۔۔نہ پہاڑ میرا راستہ روک سکتے ہیں اور نہ خوف ناک سانپ مجھے ڈرا سکتے ہیں۔۔۔۔نہ میں جنگلی درندوں سے ڈرتی ہوں اور نہ دوسری رکاوٹ میرے راستے میں حائل ہو سکتی ہے۔۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے پیٹ میں ایک ماہ کا بچہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے میں اپنی منزل پر پہنچنے میں ناکام ہو گئی تو میرا بچہ یقیناً" سورج تک پہنچ جائے گا۔"(۲۳)

چینی لوک کہانی کے اس کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی سماج کو ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے کے لیے از حد ضروری ہے کہ مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کو بھی امورِ زندگی میں شامل کیا جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی سماج خواتین کو مرکزی دھارے میں شامل کیے بغیر کامیابی کے راستے پر گامزن ہو سکے۔ مالہے کا کردار ان دقیانوسی افکار کے منہ پر طمانچہ ہے جو خواتین کو انسان سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ مالہے کی اپنی قوم کی فلاح کے لیے کی جانے والی جدوجہد ستر برس تک جاری رہی۔ اسی مہم کے دوران اس نے ایک خوب صورت بیٹے کا جنم دیا جو اس کے مشن میں معاون بن کر ہمراہ رہا۔ دونوں ماں بیٹا لاتعداد جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں، آبادیوں اور صحراؤں سے ہوتے ہوئے اپنی منزل سے قریب ہوتے گئے۔ اپنی عظیم جدوجہد کے منطقی انجام سے قبل ہی مالہے نے داعی اجل کو لبیک کہتے وقت اپنے بیٹے سے ہر حال میں اپنے مقصد کی تکمیل کا عہد لیا اور راہی ملک عدم ہو گئی۔ ماں کی جدائی کا صدمہ بلاشبہ بہت بڑا تھا، مگر اس قابلِ فخر سپوت نے ذاتی جذبات پر قومی مفاد کو مقدم تصور کرتے ہوئے دکھی دل سے اپنی مہم کا دوبارہ آغاز کر دیا۔ تنِ تنہا اس سفر کے ہر قدم پر اسے ماں کی محبت اور رفاقت رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ بلاخر وہ اس سفر کے نوے برس مکمل ہونے پر اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تاریخ ساز سنگِ میل کو عبور کرنے کے ساتھ ہی دی چنگ قبیلے میں خوشی و شادمانی کا عالم تھا۔ اس ہدف کے حصول کا علم اس وقت ہوا جب حیران کن طور پر ہر طرف روشنی اور شادمانی چھا گئی۔ سالوں سے راج کرنے والی عفریت سے آزادی کا دن بہت ہی روشن اور چمک دار تھا۔

"سب لوگ دھڑکتے دلوں کے ساتھ مشرق کی جانب نظریں جمائے ہوئے تھے۔ اچانک انہوں نے دیکھا، مشرق کی طرف آسمان پر ایک بہت بڑا شعلہ بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی سارے آسمان پر خون جیسی سرخی پھیل گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سونے جیسی سنہری کرنیں بکھیرتا ہوا سورج آہستہ آہستہ طلوع ہونے لگا اور ساری دنیا کے کونے کونے میں روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا، جہاں وی چنگ لوگ اندھیرے میں رہ رہے تھے، وہاں ہر جانب اجالے بکھر گئے تھے۔ صدیوں کے اندھے اندھیرے پلک جھپکتے میں غائب ہوگئے اور تاریکی چھٹنے کے ساتھ ہی دھاڑتے ہوئے خون خوار شیر، چنگاڑتے ہوئے چیتے، پھنکارتے ہوئے اژدھے، غراتے ہوئے بھیڑیئے اور دوسرے تمام خوف ناک درندے اس طرح غائب ہوگئے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ موت کا ہر روپ ختم ہو چکا تھا اور زندگی سورج کی روشنی بن کر ہر طرف رقص کر رہی تھی۔"[۲۴]

مالہے اور اس کے بیٹے کا کردار کسی بھی سماج کے لیے ایک زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔ ہر زندہ زبان کے لوک ادب میں اس نوع کے کردار درحقیقت اس سماج کی اقدار کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں اور دکھوں سے نجات ملنا انسان کی سرشاری کا سب سے خوب صورت اور انمول لمحہ ہوتا ہے۔ یہ خوشی اور مسرت اس وقت دائمی شکل اختیار کر لیتی ہے جب اس کا دائرہ کار اجتماعی مفاد اور قومی ترقی کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ آج تک مالہے اور اس کے بیٹے کی اپنی قوم کے لیے دی گئی قربانی کو اس کی قوم ہر روز خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔ وہ علی الصبح اپنے گھروں سے نکل کر سورج کی کرنوں کو اپنے چہروں اور جسموں پر محسوس کرتے ہیں اور مالہے اور اس کے بیٹے کو یاد کرتے ہیں۔ اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے وہ اپنی تھکن کو بھول جاتے ہیں۔ سورج کے غروب ہونے تک وہ اسی کیفیت میں سرشار ہو کر اپنی قوم کے لیے اناج اگاتے ہیں اور سورج کی اس تپش کو اپنے لیے رحمت تصور کرتے ہوئے اپنے گھروں کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔ یوں چینی لوک ادب کا یہ دل کش مرقع ہر تہذیب اور ثقافت کے محنتی لوگوں کی قدر دانی کی روایت کو مزید تقویت فراہم کرتے ہوئے اس آفاقی سچائی کی جانب توجہ دلاتا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔

شفیع عقیل کی ترجمہ کی گئی چینی لوک کہانیوں میں تیسری کہانی کا تعلق انسانی اوصاف میں سے نمایاں وصف بہادری اور انسان دوستی سے متعلق ہے۔ اس لوک کہانی کا مرکزی کردار شیگار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ

ایک نیک سیرت، خدا ترس اور مخلص انسان ہے جو ہر حال میں مخلوقِ خدا کو عافیت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے کسی بھی صورت یہ قبول نہیں ہے کہ کوئی انسان دکھ درد میں زندگی بسر کرئے۔ وہ ہر حال میں انسانوں کے دکھوں کو ختم کرکے انہیں آسودہ حال دیکھنے کا متمنی ہے۔ شیگار کی خدا ترسی کی صفت کا اظہار صرف انسانوں ہی تک محدود نہ تھا، بل کہ وہ چرند پرند، حیوانات، نباتات اور جمادات تک کو خیر بانٹنے کا خوگر تھا۔

اس لوک کہانی کے مطابق شیگار کا تعلق اس دور سے ہے جب آسمان پر سات سورج اور سات چاند نمودار ہوا کرتے تھے۔ ان کی بدولت دنیا بھرپور گرم اور روشن رہتی تھی۔ ہر طرف امن وچین کا دور دورہ تھا۔ ظلم کرنے کا چلن کسی کے ذہن میں بھی نہ تھا۔ اسی زمانے میں اس نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کر لیں۔ اپنی خوش گوار ازدواجی زندگی میں بھی اسے ایک ہی سوچ کی فکر تھی کہ جیسے وہ خود آرام وسکون کی زندگی بسر کر رہا ہے کیا ایسی زندگی کا تصور پوری دنیا میں بھی پایا جاتا ہے یا کہ اس کے برخلاف صورت پائی جاتی ہے۔

> "شیگار یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا ساری دنیا میں انسان اور جانور، چرندے اور پرندے، خدا کی مرضی کے مطابق ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں یا نہیں؟ سب ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا برتاؤ کر رہے ہیں یا نہیں۔۔۔سب کو خوشحالی حاصل ہے یا نہیں۔۔۔اس کے دل میں یہی ایک خیال سمایا ہوا تھا کہ خدا یہی چاہتا ہے۔، ہر انسان اور جانور ایک دوسرے کے برابر اور سکون سے زندہ رہے۔ کوئی کسی کو نقصان نہ پہنچائے، کوئی دوسرے کو دکھ نہ دے اور کوئی کسی کا سکھ نہ چھینے۔"[25]

شیگار اس بات کا خواہش مند تھا کہ دنیا کی سیر کو نکلے اور خود جا کر اپنی آنکھوں سے اس بات کا مشاہدہ کر سکے۔ درحقیقت وہ عظیم چینی حکیم کنفیوشس کے اس قول کو دل وجان سے قبول کرتا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا" تمام انسان برابر ہیں، ایک دوسرے کے دوست ہیں، دشمنی بے معنی ہے۔"[۲۶] اپنی اس معصوم خواہش کی تکمیل کی غرض سے اس نے اپنے دو پروں والے حیران کن خوبیوں والے گھوڑے کو اپنا ہم سفر بنایا اور مہم پر نکل گیا۔ جلد ہی اسے ایک ایسے مقام سے گزرنا پڑا جہاں بڑی تعداد میں پرندے موجود تھے۔ تاہم وہ سب کے سب بڑی مشکل اور دکھ کا شکار تھے۔ شیگار نے اس مقام پر رک کر حقائق دریافت کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیگار کی دلچسپی کو دیکھ کر اول اول تو پرندوں نے کوئی خاطر خواہ توجہ نہ دی، مگر جلد ہی شیگار ان کا اعتماد جیتنے

میں کامیاب ہو گیا۔ شیگار کے استفسار پر پرندوں کے نمایندے نے بتایا کہ ان کی آبادی میں ایک بہت بڑے اژدھے نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

دنیا کے لوک ادب کی مانند چینی لوک ادب کی اس معروف کہانی میں بھی مرکزی کردار اپنی غیر معمولی طاقتوں کے بل بوتے پر جنگل کی مختلف مخلوقات کو مظالم سے نجات دلاتے ہوئے دراصل انسانی سرشت کی اس حقیقت کی جانب توجہ دلا رہا ہے کہ ظلم کو انسانیت کسی بھی شکل میں قبول نہیں کرتی۔ انسان چاہے جس دور میں بھی ہو، جس خطے سے بھی تعلق رکھتا ہو، بنیادی انسانی فطرت کے خلاف ہونے والا ہر عمل اسے مزاحمت پر اکساتا ہے۔ شیگار بھی دراصل ایسا ہی کردار ہے جو خدا کی مخلوق پر کسی بھی زیادتی کا روادار نہیں ہے۔ شیگار کا کردار اس کہانی میں اپنے زمانے کے مظالم کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انسان چونکہ ایک فانی وجود کا حامل ہوتا ہے، اس کا اس دنیا میں قیام ایک مخصوص مدت تک کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کو آگے بڑھانے میں ہر زمانے میں ایسے کردار سامنے آتے رہتے ہیں۔

لوک کہانیوں کی سب سے دلچسپ بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں کہانی کا منطقی انجام بے حد سبق آموز اور قابل رشک ہوتا ہے۔ اس کہانی میں بھی شیگار کا انجام بھی بہت افسوس ناک بر آمد ہوا۔ دراصل جب شیگار نے دنیا کی سیاحت اس سوچ کے ساتھ شروع کی تھی کہ وہ ظلم کا مقابلہ کر کے عدل کو غالب کرے گا، تو اس سفر میں اسے کافی مدت گزارنی پڑی۔ اس دوران اس کی دونوں بیویوں کو اپنے شوہر کی یاد رہ رہ کر آتی رہی۔ سفر کی تکمیل کے بعد جب شیگار اپنی پہلی بیوی کے ہاں پہنچا تو بیوی نے اس کی آمد پر پر خلوص خیر مقدم کیا۔ تاہم اسے یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کہیں شیگار دوبارہ اس مہم پر نہ نکل جائے۔ چنانچہ اس نے رات کے پچھلے پہر اپنے شوہر سے نظر بچا کے اس مقام کا قصد کیا، جہاں شیگار کا اڑنے والا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ پہلی فرصت میں ہی اس عورت نے گھوڑے کا ایک پر اس نیت سے کاٹ ڈالا کہ کہیں شیگار دوبارہ سابقہ مہم پر نہ روانہ ہو جائے۔ گھوڑے کا پر کاٹ کر اپنے تئیں وہ عورت خوش تھی کہ اب شیگار زیادہ دور دراز علاقوں کا سفر نہیں کرے گا۔ یہی عمل اس شیگار کی دوسری بیوی نے بھی کیا اور دوسرا پر بھی کاٹ ڈالا۔

دونوں بیویوں کی جانب سے یک بعد دیگرے ہونے والے اس عمل سے شیگار کا طاقت ور گھوڑا اپنی بساط کھو بیٹھا اور بجائے ہوا میں اڑنے کے سمندر میں گر کر مر جاتا ہے۔ اس کہانی کی سب سے منفرد بات یہ ہے کہ اس

میں کہانی کا ہیرو شیگار بھی موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر اپنی زندگی میں مخلوقِ خدا کے لیے کیئے گئے اچھے کاموں کی وجہ سے اسے ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔ یوں اس سادہ سی چینی لوک کہانی میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ بھلے انسان کا اس دنیا میں قیام محض چند روزہ ہے، اسے بہت ہی محدود مدت کے لیے یہاں پر بھیجا گیا ہے، تاہم یہاں پر کئے جانے والے اچھے کام انسان کو امر کر دیتے ہیں اور اس کے جانے کے بعد بھی اس کا نام زندہ و جاوید رہتا ہے۔ یوں انسانوں کو اس کہانی کی بدولت نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کا آفاقی سبق سکھایا گیا ہے۔ شیگار کا یہ مکالمہ جو وہ مختلف مقامات پر دُہراتا ہے، بلاشبہ اپنے اندر معنویت کا بہت بڑا جہاں سمائے ہوئے ہے:-

"خدا کو یہی بات پسند ہے کہ اس دھرتی پر رہنے والا ہر جان دار امن اور سکون سے زندگی گزارے۔ خدا کی اس پسند اور مرضی کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔"[27]

در حقیقت چینی ادب کی یہ لوک کہانی اِی قومیت کے ادب میں مقبول ہے۔ اس کہانی کا ترجمہ اردو زبان میں دوسری بار رشید بٹ نے بھی کیا تھا۔ ان کے ترجمے کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے ہاں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ لوک کہانی کے پس منظر کو بھی واضح کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ زیرِ نظر کہانی کا تعلق چین کی کس قومیت سے ہے۔ یوں اختصار کے باوجود زیادہ مفید معلومات کا حامل ہونے کے باعث رشید بٹ کا ترجمہ بہتر ہے۔ اس ترجمے کو نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد کے تعاون سے ۲۰۱۸ء میں شائع کیا گیا تھا۔

شفیع عقیل کی زیرِ نظر کتاب "چینی لوک کہانیاں" کی اگلی لوک داستان (OLIVE LAKE) کے نام سے موسوم ہے۔ مترجم نے اس عنوان کا ترجمہ "جھیل کا پانی" کے عنوان سے کیا ہے۔ اسی کہانی کو جناب رشید بٹ نے اپنی کتاب "مینڈک گھڑ سوار" میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ تاہم انہوں نے اسی لوک کہانی کا عنوان "زیتون جھیل" کے نام سے کیا ہے۔ ان کی فراہم کردہ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوک کہانی چین کی ہان قومیت کا ادبی ذخیرہ ہے۔ ہان قومیت کا شمار چین کی اکثریتی قومیتوں میں ہوتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق چین کی کل آبادی کا ۹۳ فیصد حصہ ہان قومیت پر مشتمل ہے، جب کے باقی سات فی صد آبادی دیگر قومیتوں پر مشتمل ہے۔ چینی ادب کی ان لوک کہانیوں کے مختلف کرداروں کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:-

"ان لوک کہانیوں میں مرکزی کردار خواہ وہ عام لوک تھے یا شہزادے، بادشاہ تھے یا شہنشاہ، سب عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مصیبتیں اور دکھ اٹھاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں عوام کی بے لوثی، دانائی اور جفاکشی ملتی ہے اور ظالموں کا، خواہ وہ اعلی عہدے دار تھے، شہزادے یا بادشاہ یا شہنشاہ تھے، برا انجام دیکھنے میں آتا ہے۔ کہانیوں کا اندازِ بیاں بے حد دلکش ہے۔"(28)

ہان قومیت کے لوک ادب سے ترجمہ کی گئی اس کہانی "جھیل کا پانی" کے نمایاں کرداروں میں ایک نوجوان کا کردار ہے۔ یہ نوجوان بے غرضی اور دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دینے والا ہے۔ یہ اپنی مفلوک الحال ماں کے ہمراہ ایک ایسی جھیل کے قریب مقیم تھا جہاں ہر وقت تعفن اٹھتا رہتا تھا۔ باوجود محنت کے اسے خاطر خواہ فائدہ میسر نہ آتا تھا۔ اپنے وسائل کو بہترین انداز میں بروئے کار لانے کے باوجود مسائل کے ختم کرنے میں ناکامی کا منہ دیکھنے کی صورت میں اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اس غیر معمولی مسئلے کو حل کرنے کی جستجو میں وہ ایک دانا کے مشورے پر مغرب کے دورے پر نکل گیا۔ اپنی بوڑھی ماں سے اجازت لیتے ہوئے اس کا انداز ایسا تھا جیسے پاکستانی معاشرے میں کوئی فرد گھر سے رخصت ہوتے ہوئے اختیار کرتا ہے۔ خاندانی نظام کی اہمیت کو ان لوک کہانیوں میں جا بجا واضح کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں اس بات کو بطورِ خاص پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ سماجی تشکیل میں خاندان کے وجود کو ایک نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد امین اپنی کتاب "کنفیوشس اور چین کی ثقافت: ایک تعارف" میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"اہلِ چین خاندان کی بنیادی اکائی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ماں باپ سے محبت اور احترام بنیادی قدر ہے۔ اس میں قرابت داری بھی شامل ہے۔ خاندان سے وفاداری چینی اخلاقیات کی محور ہے۔ بزرگوں کے احترام اور چھوٹوں سے محبت کے رویئے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اساتذہ اور تعلیم کا احترام بھی بنیادی اقدار کا حصہ ہے۔ اخلاقیات میں سچ بولنا، وعدہ وفا کرنا اور کسی کو دھوکہ نہ دینا جیسی چینی اقدار پر عمل کیا جاتا ہے۔"

(۲۹)

"جھیل کا پانی" نامی اس کہانی میں نوجوان کے کردار کے علاوہ اس کی ماں، جنگل میں اپنی گونگی بیٹی کے ہمراہ رہنے والی بڑھیا، دور دراز بیابان میں رہنے والا باغ کا مالی اور اژدھا شامل ہیں۔ نوجوان اپنی مشکلات کا حل

دریافت کرنے کی نیت سے گھر سے نکلتا ہے تو راستے میں اسے تین مقامات پر تین کرداروں سے کل تین سوالات ملتے ہیں جو اسے اس لیے بتائے جاتے ہیں کہ وہ جب مغرب کے دیوتا کے پاس پہنچے تو ان کا جواب معلوم کرے۔ سفر کی مشکلات اور وسائل کی کمیابی کے باوجود وہ اپنا سفر برابر جاری رکھے ہوئے تھا۔ آخر کار وہ اپنی منزل پر پہنچا تاکہ اپنے مسائل کو ساتھ ساتھ تین اور افراد کے مسائل کا حل بھی دریافت کرے۔ مگر اسے اس وقت انتہائی دشواری کا سامنا کرنا پڑا جب اسے دیوتا نے یہ جواب دیا:۔

> "اے نوجوان! ہمارا یہ اصول ہے کہ ہم صرف طاق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ تم ایک سوال پوچھ سکتے ہو، دو کا نہیں، تین سوال کر سکتے ہو چار نہیں۔ اسی طرح تم صرف طاق سوالوں کا جواب پوچھ سکو گے جفت کا نہیں۔۔۔ تمھارے چار سوال ہیں اور ہم صرف تین کے جواب دے سکتے ہیں۔۔۔ اب یہ فیصلہ تم خود کر لو کہ کون سا سوال تمھیں چھوڑنا ہے اور کون سے تین سوال تمہیں کرنے ہیں۔۔۔؟"[۳۰]

ایسی صورت حال میں بیشتر انسان سمجھوتا کر بیٹھتے ہیں اور اپنی ذات کو دوسروں پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ اس نوجوان نے بھی ایک لمحے کے لیے سوچا کہ میں کئی ہزار کوس کا سفر طے کرنے، بھوک پیاس کی شدت برداشت کرنے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ دوسرا یہ کہ میری ماں بھی گھر میں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اگر میں نے اپنے سوالوں کا جواب نہ پایا تو اپنے گھر کیا منہ دکھاؤں گا۔ لہذا مجھے سب سے پہلے اپنے سوالوں کا جواب معلوم کرنا چاہیے۔ تاہم اگلے ہی لمحے اسے یہ خیال بھی رہ رہ کر ستانے لگا کہ اس نے گونگی لڑکی کی ماں، مفلوک الحال بوڑھے اور نیک صفت اژدھے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کے سوالوں کا جواب لازمی حاصل کرے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی ذات کی قربانی دینے کا فیصلہ کر کے وفاداری اور ایفائے عہد کی پاسداری میں اپنے عیش و عشرت کی قربانی دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور اپنے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے بجائے دوسرے کرداروں کے سوالوں کا جواب جاننے کی درخواست دیوتا کے حضور پیش کی جسے منظور کر لیا گیا۔

مغرب کے دیوتا نے اس بہادر اور عظیم نوجوان کو اس کی جانب سے دریافت کیے جانے والے تینوں سوالوں کے جواب مرحمت کیے تو وہ اجازت لے کر اپنے واپسی کے سفر پر روانہ ہوا۔ پہلی ہی منزل پر اسے اژدھے نے

روک کر پوچھا تو اس کے سر میں موجود قیمتی نگینے کو اس کی ترقی کے سفر میں رکاوٹ کا باعث قرار دیا گیا۔ اژدھے نے وہ نگینہ نوجوان کی مدد سے اپنے سر سے نکال باہر کیا اور اسے نوجوان کو بطور تحفہ عنایت کر دیا۔ یوں ایک طرف تو اژدھا اپنی مراد کو پا گیا تو دوسری طرف غریب نوجوان کی غربت بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ سفر کے اگلے مرحلے میں جب یہ نوجوان اس باغ کے پریشان حال مالی کے پاس پہنچا تو اسے جو جواب دیا تو اس کے نتیجے میں اسے سونے چاندے کا ایک بڑا ذخیرہ میسر آ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا باغ بھی پھلوں سے بھر گیا۔ یہاں سے اجازت لیتے وقت اسے مالی نے سونے چاندی کے بڑے ذخیرے سے نوازا۔ یوں وہ نوجوان غیر ارادی طور پر اپنی گھریلو مسائل کو حل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تاہم اپنے سفر کے آخری پڑاؤ پر اسے اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے جنگل میں اپنی گونگی بیٹی کے ساتھ مقیم بڑھیا کو جواب دیا تو وہ گونگی لڑکی بولنے لگ پڑی۔ بڑھیا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ بے اختیار ہو کر فرطِ جذبات سے آبدیدہ ہو گئی۔ اپنی گونگی بیٹی کی برسوں بعد آواز سن کر اس کا دل خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا۔ اپنی بیٹی کی انکھوں میں نوجوان کے لئے محبت کے جذبات دیکھ کر اس نے ان دونوں کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ جسے دونوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

بیابان جنگل میں دونوں کی شادی طے پا جانے کے چند روز بعد اس نوجوان نے اپنی بوڑھی عورت سے اجازت لے کر اپنی ماں کی جانب جانے کا ارادہ کیا۔ مال واسباب، سونے جواہرات اور حسین و جمیل بیوی کے ہمراہ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ اس کی بوڑھی ماں تو اس کی جدائی میں رو رو کر نابینا ہو چکی ہے۔ تاہم اگلے ہی لمحے اس نے اژدھے سے ملنے والے موتی کو ہاتھ میں رکھا اور ماں کی بینائی لوٹ آنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس اپنی انکھوں پر یقین نہ آیا کہ اس کی ماں کی بینائی واپس لوٹ آئی تھی۔ یوں اسے اس موتی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ آخر کار اس نے اپنے گاؤں کے دیرینہ مسئلے کے حل کی تمنا کی تو اگلے ہی لمحے گاؤں کے تمام ظالم زمیندار جاں بحق ہو گئے۔ یوں یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچ کر اپنے قارئین کو اعلیٰ انسانی اقدار کے جانب متوجہ کرتی ہے۔ ظلم و استبداد کے خاتمے کے لیے بلاشبہ مشقت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ ہی ساتھ قوم کو آزادی دلانے والے جانبازوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اجتماعی منفعت کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیں۔ اگر قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دے دی جائے تو پھر ایسے آلہ کار عناصر قوم پر اپنا استبدادی پنجہ مضبوط سے مضبوط تر کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان اور چین کے مشترکہ تہذیبی مظاہر میں جہاں مشترکہ خاندانی نظام کی قدر یکساں ہے وہیں اس سے جڑے ہوئے چند ایک امور بھی باہم ملتے جلتے ہیں۔ روایتی خاندانی نظام میں ساس بہو کے رشتے کی ایک خاص اہمیت ہے۔ بسا اوقات یہ رشتہ ماں بیٹی کے رشتے ہی کی ایک صورت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے تاہم بعض اوقات اس کے ہیت بدل بھی جاتی ہے۔ چنانچہ شفیع عقیل کی لوک چینی کہانیوں میں اگلی کہانی کا تعلق بھی ساس بہو ہی کے رشتے سے ہے۔ جس میں ایک روایتی ساس اپنی سگھڑ بہو کو بات بے بات کوستی رہتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی بہو کی زندگی کو اجیرن بنانے پر تلی ہوئی ہے وہیں وہ اپنے فرمانبردار بیٹے کو بھی اس بات پر قائل کرنے کی متمنی ہے کہ وہ بھی اپنی بیوی کو آڑے ہاتھوں لے کر اپنی ماں کا دل خوش کرے۔

"سدا بہار درخت" کے عنوان سے شامل یہ لوک کہانی اپنے اندر بہت سے تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک طرف جہاں یہ ساس بہو کے روایتی رشتے کی نوعیتوں کو واضح کرتی ہے، وہیں یہ نند اور بھابی کے رشتے کی مختلف جہتوں کو بھی بے نقاب کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ شوہر اور بیوی کی لازوال محبت کو بھی اپنے اندر سموتے ہوئے اس لوک داستان میں بہن بھائی کے رشتے کی کیفیت کو بھی بڑی دیدہ دلیری سے پیش کیا گیا ہے۔ چین میں کنفیوشس کی تعلیمات کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے افکار میں پانچ فرائض کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان پانچ فرائض میں سے دوسرا فرض والدین اور اولاد کے باہمی تعلقات پر مبنی ہے۔ اسی سلسلے کی اگلی کڑی میاں بیوی کے باہمی معاملات ہیں۔ کنفیوشس تعلیمات میں ان امور کو بنیاد اور اساسی اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان میں بھی والدین اور اولاد کا تعلق ایک جذباتی اور دینی فریضے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ والدین کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنی نومولود اولاد کی صحت و سلامتی، خوراک اور علاج معالجے کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بہترین تعلیم و تربیت سے بھی مزین کریں، تاکہ وہ معاشرے کا ایک مفید فرد بن کر سماجی خدمت کے امور کو بڑھ چڑھ کر سرانجام دے سکے۔ "سدا بہار درخت" نامی یہ لوک کہانی دراصل ایک ایسے سماجی مسئلے کی جانب توجہ دلاتی ہے جو کہ پاکستان اور چین کے معاشرے میں یکساں طور پر موجود ہے۔ "چین شناسی" میں اس بارے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اس کے مطابق:-

"خاندانی اکائی کے سب سے مرکزی اداروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے ان کا خاندان، انہیں شناخت احساس اور حمایت کا ایک مضبوط نیٹ ورک فراہم کرتا ہے۔ چین میں یہ خاندان بڑی حد تک کنفیوشس کے خیالات کے ذریعے سمجھا جاتا ہے۔ کنفیوشس کی سوچ میں یہ خاندان افراد کے لیے سب سے اہم تعلقات کا حامل ہوتا ہے اور تمام سماجی تنظیم کی بنیادیں بناتا ہے۔"[۳۱]

چینی فلسفے اور دانش پر مبنی کتاب "جینے کی اہمیت" کے مصنف لین یو تانگ بھی چینی سماج میں خاندانی نظام کی اہمیت وضرورت پر خاصی تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چین میں کنبہ داری کا نظام ایسا ادارہ ہے جو بچے اور بوڑھے دونوں کے لیے اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا ضامن بن جاتا ہے۔ جوانی کا زمانہ تو ہر انسان کی زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ ہوتا ہے، لیکن عہدِ شیر خوارگی اور بڑھاپے میں انسان کا دوسروں پر انحصار کرنا ازبس لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ بچپن میں تو والدین اپنی اولاد کو پالتے ہیں تاہم بڑھاپے میں وہی اولاد اپنے بوڑھے ماں باپ کی دیکھ بھال کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ زیرِ نظر کہانی میں ایک دلچسپ اور منفرد صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کی مرکزی کردار لین شی نامی ایک عورت ہے جو اپنی ساس کے امتیازی اور غیر انسانی سلوک کے باعث اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عورت اپنے شوہر اور اس کی بہن یعنی اپنی نند کو اپنی سلیقہ شعاری کے باعث متاثر کرنے میں تو کامیاب ہو جاتی ہے، مگر اس کی ساس اپنی بہو کی ہر اچھی کوشش اور کام میں مین میخ نکالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھی۔ اس کا شوہر اپنی ماں کی اس روش پر بہت نالاں تھا۔ ماں کے ظلم وستم بڑھنے پر ان دونوں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔ ان کی بے غرض محبت کے انجام کو لوک کہانی میں اس انداز پیش کیا گیا ہے:۔

"لین شی اور چونگ چنگ کی خودکشی کی خبر چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ان دونوں نے سچے پیار کی خاطر جان دی تھی۔ لوگ ان کی محبت کے دل سے قائل ہو گئے تھے۔ انھوں نے عقیدت کے طور پر دونوں کی لاشیں ایک ساتھ سرو کے درخت کے نیچے دفن کر دیں تاکہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ وہ دن اور آج کا دن سرو کا درخت ہمیشہ کے لیے پیار کا استعارہ بن گیا۔ دنیا کے کونے کونے میں

پھیلے ہوئے سرو کے ان گنت سر سبز درخت آج بھی لین شین اور چونگ چنگ کے پیار کی گواہی دے رہے ہیں۔"(32)

تہذیبوں کے مابین مکالمے کے پس منظر میں اگر اس چینی لوک کہانی کا مطالعہ کیا جائے تو بجا طور پر اس بات کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت میں بھی ایسے مرقع بارہا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دنیا کی ہر تہذیب میں انسانی رشتوں کے مابین پائے جانے والے تنوع کو ایک تہذیبی قدر کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان کے مقامی زبانوں کے لوک ادب میں ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی ماہیوال جیسی بہت سی لوک کہانیوں موجود ہیں، جن میں پائے جانے والے عناصر کو ان چینی کہانیوں سے مماثل کیا جا سکتا ہے۔

شفیع عقیل کی مترجمہ کتاب میں شامل اگلی کہانی کا تعلق خاندانی نظام سے جڑا ہوا ہے۔ بسا اوقات خاندان کا کوئی فرد اپنی مکاری اور عیاری کے سبب پورے خاندان کی ناک میں دم کرتا ہے۔ بزرگوں کے انتقال کے بعد خاندانی وارثت کی منصفانہ تقسیم سماجی تشکیل کی شیرازہ بندی کے لیے از حد ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر تہذیب میں متفرق قسم کے طریقہ ہائے کار موجود ہیں۔ تاہم بعض عاقبت نااندیش عناصر ایسا کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ زیرِ نظر کہانی دراصل چین کی تھونگ قومیت کے لوک ادب سے اخذ کی گئی ہے۔ تھونگ قومیت بھی چین کی دیگر قومیتوں کی مانند اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کو شفیع عقیل کے علاوہ رشید بٹ نے بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ دونوں تراجم چین کے غیر ملکی زبانوں کے مرکز کی جانب سے پیش کردہ انگریزی متن کی مدد سے تیار کیے گئے ہیں۔ انگریزی ترجمے میں اسے HOW THE BROTHERS DIVIDED THEIR PROPERTY کا عنوان دیا گیا ہے، جب کہ شفیع عقیل نے اس عنوان کو اردو زبان میں "دو بھائی" کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ رشید بٹ کے ترجمے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ اس کہانی کا تعلق چین کی کسی قومیت سے ہے۔ مزید یہ کی انہوں نے اس کا عنوان "جائیداد کا بٹوارہ" کے نام سے قائم کیا ہے۔(۳۳)

اس کہانی میں دو بھائیوں کے درمیان وراثت کی تقسیم کے حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں بنیادی طور پر دو کردار ہیں۔ اول الذکر کا نام بڑا لانگ اور دوسرے کا نام چھوٹا لانگ تھا۔ بڑا بھائی سست، قائل، لالچی اور محنت سے جی چرانے والا تھا، جب کہ چھوٹا بھائی محنتی، جفاکش اور دوسروں کا خیال رکھنے

والا تھا۔ دونوں کی زندگی میں اسی بنیاد پر اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ چھوٹا بھائی تو اپنی محنت و مشقت کے بل بوتے پر پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیتا تھا۔ مگر بڑا بھائی ہمیشہ کی طرح چاپلوسی اور مکاری کے باعث چھوٹے بھائی سے کچھ نہ کچھ نکلوا کر اپنا الو سیدھا کر لیتا تھا۔ آخر کار اپنی بدنیتی کے باعث عبرت ناک انجام سے دوچار ہو کر ماضی کا حصہ بن گیا۔

بادی النظر میں اس کہانی کے کرداروں کے بجائے اگر ہم اپنے سماج کے کرداروں کو سامنے رکھیں تو روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایسے کرداروں کا تعلق ہمارے ہی معاشرے سے ہے۔ ہمارے ہاں بھی طاقت ور اپنی طاقت کے نشے میں مست ہو کر کمزوروں کے حقوق کو پامال کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ آخر کار اندوناک انجام سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ یوں پاکستان اور چین کے ثقافتی پس منظر میں اچھائی کی آفاقیت اور بدی کی نحوست کو ایک ابدی سچائی کے طور پر اس کہانی میں پیش کر کے تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی دعوتِ فکر دی گئی ہے۔

چینی لوک ادب کی ایک اور خوب صورت کہانی "سوتیلی ماں، سوتیلی بہن" کے نام سے اردو زبان میں شفیع عقیل نے ترجمہ کی ہے۔ اس دل چسپ کہانی میں ایک ماں اپنی سوتیلی بیٹی پر بے جا ظلم و زیادتی کرتی ہے اور اپنی حقیقی بیٹی کے عیش و آرام کے لیے اسے تختۂ مشق بنا کر ہر طرح کا ظلم و ستم روا رکھتی ہے۔ بسا اوقات اس سوتیلی ماں کا ظلم اس قدر تجاوز کر جاتا تھا کہ معصوم بیٹی کو جان جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ ایسی ہی ناخوشگوار صورت حال کو ہمارے ہاں بھی بعض اوقات دیکھا یا سنا جاتا ہے، جس میں سوتیلی اولاد کو ایک بوجھ سمجھ کر سر سے اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم کائنات میں موجود بھلائی کی طاقتیں ہمیشہ ان لوگوں کا ساتھ دیتی ہیں جو حق پر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اس کہانی میں ہوا، جس میں مرکزی کردار ایک نوجوان دوشیزہ کا ہے، جسے ڈیکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ڈیکا اپنی سوتیلی ماں کے ظلم اور سوتیلی بہن ڈیلن کے امتیازی سلوک سے تنگ تھی۔ خوش قسمتی سے ایک نیک دل نوجوان سے اس کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے گھر میں ہنسی خوشی زندگی کے خوب صورت ایام گزارنے لگی۔ سوتیلی ماں اور بہن سے دور ہو جانے کے بعد بھی وہ ان کے عتاب کا شکار رہی اور یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ تاہم چینی اساطیری قصوں اور روایات کے تحت وہ دوبارہ زندہ ہو گئی اور

اپنی دانش مندی سے اپنی سوتیلی بہن جو اس کی سوکن بنی بیٹھی تھی، سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔اس کہانی کے اخلاقی سبق کو اختتام میں یوں بیان کیا گیا ہے:-

> "کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ڈیلن اور اس کی ماں کی روحیں دو پرندوں میں تبدیل ہو گئیں تھیں۔ یہ پرندے چیو اور چیاؤہیں جو آج بھی رات دن گاتے رہتے ہیں کہ۔۔۔دوسروں کو نقصان پہنچانا دراصل اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے۔"(۳۴)

چین کے تاریخ میں عظیم دیوارِ چین کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ دیوار چھن سلطنت کے حکمران شی ہوانگ ٹی نے دفاعی حکمتِ عملی کے تحت تعمیر کروائی۔ آج بھی اس دیوار کو انسانی محنت اور ہنر مندی کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔اس دیوار کی تعمیر بلاشبہ ایک عظیم انسانی کارنامہ ہے۔زمانہ قبل از مسیح میں تعمیر ہونے والی اس دیوار کی تعمیر کے ساتھ بہت سی لوک کہانیاں بھی مشہور ہیں، جو مختلف قومیتوں کے لوک ادب میں آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ SEEKING HER HUSBAND AT THE GREAT WALL کے عنوان سے چینی کی ہان قومیت میں موجود لوک کہانی اپنے اندر تاریخی اہمیت کو سمونے کے ساتھ ساتھ انسانی محبت کے عظیم جذبے کو بھی زندہ جاوید کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اس لوک کہانی کو بھی رشید بٹ اور شفیع عقیل نے ترجمہ کیا ہے۔اول الذکر نے اس کا ترجمہ "وفا کی پتلی" کے عنوان سے کیا ہے، جب کہ موخر الذکر نے اسے "وفادار بیوی" کا عنوان دیا ہے۔اس کہانی میں جہاں محبت کے عالمگیر جذبے کو خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے وہیں ایک چینی عورت کی وفاداری اور اوالعزمی کی بھی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چینی ہنر مندوں کے فنِ تعمیر کی صناعی اور انفرادیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ہزاروں سال پہلے شروع ہونے والی دیوارِ چین کی تعمیر میں بیش بہا سرمایہ، افرادی قوت اور وقت صرف ہوا تھا۔عابد علی عابد اپنی کتاب "مشاہیر چین" میں اس دیوار کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "اس کو چینی زبان میں "وان لی چانگ چنگ" WAN LICHANG CHING کہتے ہیں۔یہ دیوار دس ہزار میل لمبی ہے اور اتنی چوڑی ہے کہ اس پر تین گھوڑے ایک وقت میں دوڑائے جاسکتے ہیں۔۔۔جان گنتھر نے کہا ہے کہ دنیا کی تمام تعمیرات

میں یہی ایک ایسی دیوار ہے جو مریخ سے نظر آتی ہے۔ آج اس دیوار کا شمار عجائباتِ عالم میں ہوتا ہے۔"[35]

روایات کے مطابق اس دیوار کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب سلطنت پر شمالی سمت سے حملہ آوروں کا خطرہ تھا۔ ملک کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنانے کی غرض سے اس دیوار کو لازمی قومی خدمت کے اصول کے تحت تعمیر کرتے ہوئے عوامی شمولیت کو ضروری تصور کیا گیا۔ شہنشاہ کے حکم سے ملک بھر سے نوجوانوں اور صحت مند افراد کو پکڑ پکڑ کر اس دیوار کی تعمیر کے کام میں شریک کیا گیا۔ "چینی ثقافت کے تابندہ نقوش" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۷۰۰ کلومیٹر طویل یہ دیوار انسانی ہنر کی قدیم ترین نشانی کے طور پر آج بھی سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز ہے اور چین آنے والا ہر سیاح اسے دیکھنے کی خواہش ضرور دل میں لے کر آتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں اقوامِ متحدہ کے ادارے یونیسکو نے اسے عالمی ثقافتی ورثے میں بھی شامل کیا تھا۔[۳۶]

اسی عظیم دیوار کی تعمیر کے پس منظر میں زیرِ نظر کہانی کے مرکزی کرداروں وان ہسی لیانگ اور اس کی وفا شعار بیوی مینگ چیانگ نو کی داستان بھی شروع ہوتی ہے۔ ابھی ان کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سرکاری حکم کی تعمیل کی غرض سے وان ہسی لیانگ کو مملکت کے شمالی حصے میں بادلِ نخواستہ روانہ ہونا پڑا۔ ادھر اس کی بیوی اس کی جدائی کے غم میں حسرت و یاس کی تصویر بنی اپنی زبانِ حال سے یوں کہتی پھرتی تھی:۔

"مارچ کے مہینے میں شفتالو کے درخت پھولوں کے لباس پہن لیتے ہیں۔
ابابیلیں اپنے گھونسلے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔
وہ جوڑوں کی صورت میں خوشی میں پرواز کرتی ہیں۔
لیکن میں اکیلی ہوں، آہ! میں کس قدر اداس ہوں[۳۷]

موسمِ برسات کے بعد سردی کی شدت میں اضافہ ہوتے ہی اِس کی بیوی کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ کہیں اُس کے پاس گرم پوشاک اور ملبوسات موجود ہیں کہ نہیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے شوہر کے لیے رات دن ایک کر کے اون سے کپڑا بُن کر ایک گرم لباس تیار کر لیا۔ لیکن اب ایک اور پریشانی در پیش تھی کہ اس لباس کو وان ہسی لیانگ تک کیسے پہنچایا جائے۔ مینگ چیانگ نو نے آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود اپنی شوہر تک یہ چیزیں پہنچانے کے لیے تنِ تنہا سفر اختیار کرے گی۔ ایک اکیلی جوان عورت کے لیے اس موسم میں ایسا پر خطر

سفر کرنا، جان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ تاہم اس نے اپنے شوہر کی خاطر یہ صعوبتیں برداشت کرنے کا عزمِ مصمم کیا ہوا تھا۔

دشوار گزار گھاٹیوں، جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں سے تنِ تنہا گزرتے ہوئے وہ عبادت گاہ کے پاس پہنچی تو تھکاوٹ کے باعث اس کے اندر جا کر آرام کرنے کے لیے ایک چٹان پر سستانے لگی۔ لیٹے لیٹے اسے نیند آ گئی۔ اس دوران اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کا شوہر دیوارِ چین کی تعمیر میں بے گار مشقت کرتے کرتے مر گیا ہے تو وہ بے قرار ہو کر بیدار ہو گئی۔ اس ڈراؤنے خواب کو وہ اپنا وہم قرار دے کر مزید تیزی سے دیوارِ چین کے مقام کی جانب گامزن ہو گئی، تاکہ شدید سردی سے بچنے کے لیے اسے گرم ملبوسات مہیا کر سکے۔ دورانِ سفر اسے شدید برف باری کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر وہ عزم و ہمت کا پہاڑ بن کر اپنی منزل کی جانب رواں رہی۔ آخر کار دشوار گزار پہاڑی راستوں سے اسے عظیم دیوارِ چین کو وہ حصہ دکھائی دیا جو مکمل ہو چکا تھا تو گویا اس کے دل میں ایسے جذبات پیدا ہوئے جیسے چینی نژاد اردو شاعر چانگ سی شوانگ المعروف انتخاب عالم نے زبان دی:-

تُو کہ ہے فخرِ زمیں اپنے جاہ و جلال میں
کوئی شے جچتی نہیں تجھ بن نگاہِ ماہ میں
گو بنی ہے خاک سے تُو، ایستادہ خاک پر
عکس اپنا ڈالتی ہے تُو مگر افلاک پر
ارض کو تُو نے ملایا آسماں کے تاج سے
بادِ صحرائی کو جوڑا بحر کی امواج سے
پیراہن تیرا شفق، قوسِ قزح، ابر و سحاب
تیرے زیور ہیں نجوم و ماہتاب و آفتاب
ہے کہاں دنیا میں تجھ سا دیو پیکر شاہسوار
اسپ تیرے ہیں سوئے افلاک اٹھتے کوہسار
تُو طویل و دائمی شیرازہء تاریخ ہے
ایک خشتِ نیلگوں، اک صفحہ ء تاریخ ہے (۳۸)

ابھی وہ عظیم دیوارِ چین کو دیکھ کر اس کے سحر میں گرفتار تھی اور ان ہنر مندوں و کارکنوں کے ہمت کو داد دے رہی تھی جنھوں نے اس دیو ہیکل دیوار کی تعمیر کو ممکن بنایا تھا۔ بلاشبہ اس نے اپنی زندگی میں اس سے بلند دیوار نہیں دیکھی تھی۔ اسے دل ہی دل میں اپنے شوہر کی یاد بھی رہ رہ کر ستانے لگی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس کا شوہر بھی اس دیوار کو تعمیر کرنے میں ضرور شامل رہا ہو گا۔ جلد ہی وہ دیوار کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ ہر نظر آنے والے چہرے کو تلاش کرتی کہ کہیں اسے اپنا پیارا شوہر مل جائے، مگر وہاں تو دنیا ہی اور تھی۔ شہنشاہ کے حکم سے بے گار میں مزدوری کرنے والے مزدور اور کاریگر غم و غصے کی مجسم تصویر بنے بیٹھے تھے۔ تاہم وہ مایوسی سے دور ہو کر آگے سے آگے بڑھتی رہی اور شوہر کو تلاش کرتی رہی۔

ایک مقام پر پہنچ کر اسے کسی نے ایسی دلخراش خبر سنائی دی کہ وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا شوہر مزدوری کرتے کرتے ایک دن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اس مقام کی بھی نشاندہی کی گئی جہاں اس کی لاش کو بے گور و کفن دفنا کر اوپر دیوار چن دی گئی تھی۔ مینگ چھینگ نو نے اپنے شوہر کی جائے وفات پر اس قدر گریہ کیا کہ اس کی آہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دیوار کا بہت بڑا حصہ زمین بوس ہو گیا۔ ارد گرد کے تمام لوگ اور سرکاری اہلکاروں کو جب اس غیر معمولی صورت حال کی خبر ہوئی تو یہ خبر بادشاہ تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے اس خبر کو سن کر فیصلہ کیا کہ خود جا کر موقع کا معائنہ کرئے گا۔ چنانچہ اپنے لاؤ لشکر کے ہمراہ جب وہ اس مقام پر پہنچا تو مینگ چھنگ کے شباب اور بے پناہ حسن و جمال کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا اور اپنے آنے کے مقصد سے غافل ہو کر اسے اپنے بیوی بنانے کا ارادہ کر لیا۔

تاہم مینگ چھنگ نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محبوب شوہر کی موت کا باعث بننے والے بادشاہ کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس پیش کش کو صرف اُسی صورت قبول کر سکتی ہے جب اس کے شوہر کی لاش کو سونے چاندی سے مرصع تابوت میں سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس شرط کو بادشاہ نے معمولی جان کر بخوشی قبول کر لیا تاہم وان ہسی لیانگ کی بیوہ نے اپنے شوہر سے لازوال محبت کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے دریا میں کود کر بادشاہ کے عتاب سے خود کو محفوظ کر لیا۔ یوں دیوارِ چین کی تعمیر میں شامل اپنے شوہر کی قربانی کو رہتی دنیا تک کے لیے امر کر دیا۔ ڈاکٹر خالد عباس الاسدی نے غالباً" اسی لوک کہانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک خوب صورت قطعہ اپنی کتاب "پاک چین دوستی" میں رقم کیا تھا:۔

عظیم لوگ تھے دیوارِ چین کے معمار
وہ اپنے بعد کی نسلوں کو دے گئے وقار
لہو سے بھرتے رہے ہیں فصیل کی بنیاد
فلک نے بھی تو سراہا ہے چین کا معیار(۳۹)

اگلی چینی لوک کہانی کا تعلق ہان قومیت کے ادب سے ہے۔ اس کہانی کو انگریزی زبان میں جو عنوان دیا گیا ہے ، وہ WIVES IN THE MIRRORS ہے۔ اس دلچسپ لوک کہانی کو شفیع عقیل نے "سرخ اور سبز پھول" کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے، تاہم رشید بٹ نے ترجمہ کرتے ہوئے "طلسمی آئینے" کا عنوان قائم کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی دو بھائیوں کے گرد گھومتی ہے جن کی والدہ ان کی جلد شادی کی متمنی ہوتی ہے، مگر وہ اس جانب توجہ دینے سے قاصر تھے۔ آخر کار ایک دیوتا اس ماں کی مدد کو آتا ہے اور کرشماتی آئینے دے کر جلد شادی کی پیش گوئی کرتا ہے۔

چینی ادب کی یہ کہانی اردو ادب کی ان کہانیوں کی مانند دکھائی دیتی ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر اپنی حیران کن صلاحیتوں کے بل بوتے پر خیر کی طاقتوں کے مددگار نظر آتے ہیں۔ پاکستانی لوک کہانیوں میں بھی ایسے کردار کثرت سے دکھائی دیتے ہیں جو جنات، پریوں اور دیوؤں سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسی کہانیاں دراصل اس سماج میں اس لیے مقبول ہوتی تھیں کیوں کہ ان میں نئی نسل کو اخلاقی اقدار سکھانے مقصود ہوتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بہادری، جواں مردی، اولعزمی اور پارسائی جیسی آفاقی سچائیوں کو ایک امانت کے طور پر منتقل کرنا بھی ان کہانیوں کا ایک مقصد ہوا کرتا تھا۔ اسی پس منظر میں شفیع عقیل کی ترجمہ کی ہوئی چینی لوک ادب کی کہانی بھی ان کے مجموعے کا حصہ ہے۔ اس کا عنوان "شہزادی کا رومال" ہے۔ نمایاں کرداروں میں سے ایک کردار چن نامی نوجوان کا ہے جو علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا۔ اپنی علمی فضیلت اور اخلاقی بلندی کے باعث قدرت اسے کامیابیوں سے سرفراز کرتی رہی۔ تاہم وہ اپنی خدا ترس طبیعت اور انسان دوستی کے جذبے سے سرشار رہنے کے باعث ہمیشہ خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ آخر کار انہی اوصاف کی بنیاد پر وہ ایک سلطنت کا شہزادہ بن گیا اور اپنے خاندان کی غربت کو امارت میں بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی طرح کی ہان قومیت کی لوک کہانی MALING AND HIS MAGIC BRUSH "طلسمی بُرش" کے عنوان سے ترجمہ کی گئی۔ اس کہانی میں بھی ایک جادوئی صفات کے حامل برش کو استعمال کرنے والے نوجوان مالینگ کا قصہ بیان کیا گیا ہے، جسے قدرت نے تصویریں بنانے کا خداداد ہنر عطا کیا تھا۔ اسے ایک دن کسی دیوتا نے جادوئی صفات والا بُرش عطا کیا۔ مالینگ اس کی مدد سے جو تصویر بناتا وہ اصل کا روپ اختیار کر لیتی۔ یوں وہ اپنے گاؤں کے غریب لوگوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں دینے لگا۔ آخر کار وہ ظالم بادشاہ کے عتاب کا شکار ہو کر قید ہو گیا۔ وہاں بھی اس نے اپنی تصویروں کی مدد سے اپنی مشکل کا حل نکال لیا۔ یوں نیکی کے فوائد اور بدی کی نحوست کو ان کہانیوں میں خوب صورت انداز میں پیش کر کے اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جنگلی انگور کی کہانی کی مرکزی کردار ایک نو عمر نیک دل لڑکی ہے، جو اپنے قریبی عزیز کے حسد کے باعث اپنی بینائی سے محروم ہو جانے کے بعد بینائی کے دوبارہ حصول کے لیے طویل اور دشوار سفر کرتی ہوئی اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ بعد ازاں وہ انسانوں سے اپنا وہی برتاؤ برقرار رکھتی ہوئی اس آفاقی سچائی کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ "کر بھلا، ہو بھلا۔"

دنیا کی ہر تہذیب میں موسموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چینی تہذیب میں بھی موسموں کی ایک خاص حیثیت ہے۔ ہر موسم کی آمد سے پہلے ہی اس کی تیاری کے لیے ضروری لوازمات کا اہتمام کر لیا جاتا ہے۔ پاکستان اور چین میں کئی ایک تہوار موسموں کے ساتھ منسوب ہیں، جو کہ اپنے مقررہ موسم اور وقت پر روائتی جوش و جذبے سے منائے جاتے ہیں۔ اسی پس منظر میں شفیع عقیل کی ترجمہ کردہ چینی لوک کہانی بھی بہت دل چسپ اور منفرد ہے۔ اس کہانی کا عنوان "HOW THE SEASONS BECAME FOUR" یعنی "چار موسموں کی کہانی" ہے۔ کرداروں کو تمثیلی انداز میں انتہائی خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں روئے زمین پر چار موسموں کے مربوط نظام کے قائم ہونے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

FLOUTING CLOUD "آوارہ بادل" کے عنوان سے شامل اگلی لوک کہانی ایک ایسے بادل کے بارے میں ہے جو اپنی تخلیق کے مقصد سے نا آشنا تھا۔ نیلگوں آسمان کے نیچے وہ بے مقصد اڑتا پھرتا رہتا تھا۔ تاہم جلد ہی اس نے انسانوں کو پریشانیوں اور دکھوں میں گرفتار دیکھا تو اس اسے یہ خیال آیا کہ کسی طرح انسانوں کے دُکھوں کو کم کرنے کی تگ و دو کروں۔ چنانچہ اس نے ایک ایسے مقام پر خود کو برسنے کے لیے تیار

کر لیا جہاں طویل عرصے سے خشک سالی کا راج تھا۔ آوارہ بادل جب اس قحط زدہ علاقے پر برس رہا تھا تو اسے انسانوں کی خوشی دیکھ کر جو مسرت اور اطمینان ملا، وہ اسکے لیے ایک انمول سوغات تھی۔ یوں ایک علامتی انداز میں خدمتِ خلق کے اعلیٰ ترین جذبے کو مہمیز دے کر انسانوں کو اس جانب متوجہ کیا گیا ہے۔

عجیب و غریب ہرن کی کہانی ایک ایسے کردار کے گرد گھومتی ہے جو مشکل کا شکار ہونے والے ذی روح کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اگر کوئی فرد یا قافلہ اپنے راستے سے بھٹک جائے تو اسے صحیح سمت کی طرف سفر کرنے کو یہ جانور اپنا فریضہ تصور کرتے ہوئے اپنی جان کو ہزار خطروں میں ڈال کر بھی دستگیری کے لیے سامنے آجاتا ہے۔ فاضل مترجم نے ان کہانیوں کو ثقافتی اور تہذیبی ورثہ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لوک کہانیوں اور لوک ادب کی جملہ اصناف میں وقت کا پہیہ تبدیلی تو لا سکتا ہے، مگر ان کو کسی بھی صورت ختم نہیں کر سکتا ہے۔ اس امر کا بنیادی سبب یہ ہے کہ لوک ادب کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہوتا بل کہ اس میں کئی نسلوں کے احساسات و جذبات اور صدیوں کے تجربات سموئے ہوتے ہیں۔ گویا کہ یہ اس سماج کے تمام انسانوں کی مشترکہ میراث ہوتی ہے اور وہ سب باہم مل کر اسے سینہ بہ سینہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرتے رہتے ہیں۔ شفیع عقیل اپنی اس ترجمہ کردہ کتاب کے کرداروں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

> "زیرِ نظر کتاب میں شامل لوک کہانیوں کے موضوعات مختلف ہیں۔ کہیں سوتیلی ماں کا ظلم ہے، کہیں ایک چالاک بھائی دوسرے بھائی سے دھوکہ کرتا ہے، کہیں بیوی کی بے لوث وفاداری ہے، کہیں کسی جابر بادشاہ کا ظلم ہے، کہیں نیکی کا صلہ ہے، کہیں دوسروں کے لیے ایثار ہے، کہیں کسی مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد ہے، کہیں شیطانی قوتوں سے مردانہ وار مقابلہ ہے اور کہیں دوسروں کی بھلائی کے لیے دُکھ جھیلے جاتے ہیں۔ ان میں ماں کی ممتا بھی ہے، دوسروں کی محبت بھی ہے، روایات کی فرسودگی بھی ہے اور ان فرسودہ روایات کو بدلنے کا عزم بھی ملتا ہے۔ اس طرح ان میں چاہت کی آگ بھی ہے، سماج کا جبر بھی ہے، مسلسل کوشش بھی ہے، نیک ارادوں کی تکمیل بھی ہے اور انتظار کے بعد وصال بھی ہے،۔ غرض ان کہانیوں میں وہ تمام انسانی دُکھ سُکھ ملتے ہیں، جن سے زندگی عبارت ہے۔ مگر ایک چیز ان تمام کہانیوں میں مشترک ملے گی۔۔۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد اور ظلم و جبر کے خلاف

نفرت۔۔۔ صرف نفرت ہی نہیں بلکہ اس کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کی ترغیب
اور اسے شکست دینے کا حوصلہ۔۔۔"(۴۰)

ج۔ افسانہ

چین میں افسانوی ادب کی روایت کے ابتدائی نقوش تو اُن لوک کہانیوں سے ہی واضح ہونا شروع ہوئے جو وہاں سینہ بہ سینہ نئی نسل تک منتقل ہو رہی تھیں۔ تاہم باقاعدہ طور پر افسانہ نگاری کا نقطہء آغاز چاؤ شورین سے ہوا، جنہیں ادبی دنیا میں لوشون کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۸۱ء میں شاؤلنگ میں پیدا ہونے والے لوشون جدید چینی ادب کو نئی فکری بنیادیں فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ نئی اصنافِ ادب متعارف کروانے میں بھی اساسی کردار کے حامل ہیں۔ چین میں سیاسی بیداری کے حوالے سے بھی ان کی جدوجہد اہمیت کی حامل ہے۔ شعبہ درس و تدریس سے وابستگی اور ادبیاتِ عالیہ کے براہِ راست مطالعہ کے سبب ان کی سوچ میں جدید افکار کی قبولیت اور نوجوان نسل میں مقبولیت کا خوشگوار توازن موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کی مقتدرہ کے ساتھ ان کے مراسم اتار چڑھاؤ کا شکار رہے۔ لوشون کے والد اور دادا کا انتقال اِن کی کم سنی میں ہی ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ابتداء ہی سے معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن کی والدہ دیہات میں رہنے کے باوجود علم و ادب سے گہری وابستگی رکھتی تھیں۔ اسی بنیاد پر لوشون کو ابتدائی زندگی میں ہی علمی و ادبی ماحول میں تربیت اور چینی کلاسیکی ادب کے مطالعے کا سنہری موقع میسر آیا۔

"لوشون کے لڑکپن کی نمایاں خصوصیات جو ان کی شخصیت اوراُن کے فن پر بہت اثرانداز ہوئی، ان کی دیہاتی زندگی سے محبت اور سادہ لوح کسانوں کے بچوں کے ساتھ دوستی اور رفاقت تھی۔ وہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ سمجھتے تھے۔"(۴۱)

لوشون نے اپنی ابتدائی تعلیم چین میں ہی رہ کر حاصل کی۔ خدمتِ انسانیت کے جذبے کے تحت انہوں نے طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پڑوسی ملک جاپان کا رخ کیا۔ دیارِ غیر میں اپنے ہم وطنوں کے بارے میں غیر مناسب رویہ دیکھ کر تعلیم ادھوری چھوڑ کر ہی واپس لوٹ آئے۔ بعد ازاں درس و تدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر علم و ادب کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اس عہد میں ملک میں جاری سیاسی عدم استحکام نے ان

کی سوچ پر قابلِ ذکر اثرات مرتب کیے۔ بیرونی طاقتوں کی بے جا مداخلت اور معاشی تنگی نے چینی عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اپنے سماج کی اس صورت حال سے انہیں سخت تشویش لاحق ہوئی۔ اسی عرصے میں انہوں نے سماجی تشکیل اور تمدن میں بہتری لانے کے لیے علمی نقطہ نظر سے غور و فکر کا آغاز کیا۔ اسی دوران انہوں نے اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے چینی عوام کی فکری رہنمائی کے فریضے کو ادا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

"لوشون نے چینی تہذیب و تمدن کے بارے میں بہت گہرا مطالعہ کیا اور قدیم کلاسیک کی تشریح و ترتیب کے سلسلے میں بھی بہت زیادہ کام کیا۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں ان کی پہلی کہانی "پاگل کی ڈائری" شائع ہوئی۔ اسی کہانی میں انہوں نے اپنا قلمی نام "لوشون" پہلی بار استعمال کیا تھا۔ اب انہوں نے عوام کے سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں انتہائی محاربانہ انداز میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں ان کی مختصر کہانیوں پر مشتمل کتاب "کال ٹو آرمز" شائع ہوگئی۔ جس میں "آہ کیو کی سچی کہانی"، جیسی شہرہ آفاق کہانی بھی شامل تھی۔ جلد ہی لوشون نئے چینی ادب کے بانی کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔"(42)

تہذیبوں کے مابین مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے قیام کے لیے جہاں اور اہم امور سرانجام دینے ضروری ہیں وہیں تراجم کا کردار بھی اظہر من الشمس ہے۔ چینی ادبی تخلیقات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی روایت بتدریج توانا ہو رہی ہے۔ اس روایت کا اہم پہلو معروف چینی ادیب لوشون کے افسانوں کا ترجمہ بھی ہے۔ اس ترجمے کی بدولت اردو زبان جاننے والے قارئین کو چینی سماج کی تاریخی ترقی اور ان تہذیبی پہلوؤں سے آگاہی مل رہی ہے جس کے باعث چینی سماج ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

"اپنی شروع کی زندگی میں لوشون انقلابی جمہوریت پسند تھے لیکن بعد ازاں پورے کیمونسٹ ہوگئے۔ اُن کی کہانیاں اپنے دور کی حقیقت کو عیاں کرتے ہوئے، سامراج اور جاگیرداری مخالف رویہ رکھے ہوئے ہیں، لیکن کہیں بھی وہ اپنے خیالات، اپنی کہانیوں کے کرداروں پر تھوپتا نظر نہیں آتے۔ وہ ادب کو جدوجہد کا ہتھیار کہتے تھے اور اسی لیے ان کا ادب اپنے دور کے عام آدمی تک پہنچا اور اُسے ذہنی، ثقافتی اور عقلی اعتبار سے اُس سطح تک لے گیا جہاں عام آدمی بھی معاشرے میں موجود غیر انسانی

قدروں کو پہچان گیا اور انسان دشمن طاقتوں کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار ہو گیا۔"(۴۳)

لوشون کے اولین افسانے "پاگل کی ڈائری" کے اب تک اردو میں دو تراجم ہو چکے ہیں، جن میں سے پہلا ترجمہ ۱۹۸۴ء میں نصری فاطمہ نے کیا۔ اس ترجمے کو "آج چاند روشن ہے" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس افسانوی مجموعے میں لوشون کے چھے افسانوں کے تراجم کیے گئے ہیں جن میں "پاگل کی ڈائری"، "کھونگ ای چی"، "ایک چھوٹا سا واقعہ"، "نئے سال کی قربانی"، "کل" اور شہرہ آفاق افسانہ "آہ کیو کی سچی کہانی" شامل ہیں۔ اس ترجمے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں لوشون کے حالاتِ زندگی اور انکی شخصیت و فن کے حوالے سے دو اہم مضامین بھی شامل ہیں، جس کی بدولت چینی ادب کے مزاج اور نوعیت کے بارے میں مفید معلومات میسر آتی ہیں۔ لوشون کے اس اولین افسانے کا اردو زبان میں دوسرا ترجمہ ۲۰۲۰ء میں خالد فتح محمد نے کیا۔ یہ ترجمہ فکشن ہاؤس لاہور نے شائع کیا۔ اس ترجمے میں لوشون کے کل پانچ افسانے شامل ہیں جن میں "ایک پاگل کی ڈائری"، "چارہ"، "درے سے روانگی"، "بیوہ کا بیٹا"، اور "سیلاب" شامل ہیں۔

> "چینی ادیب لوشون کی حیثیت ایک ذہنی رہنما کی سی ہے۔ انہوں نے دنیائے ادب میں اپنے فکر و فن کے جو چراغ روشن کیے ہیں وہ چین کی نوجوان نسل کے لیے ایک بڑے کاروانِ خیال کا نشانِ راہ بن چکے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی جستجو کے لیے سچی فنکارانہ تڑپ کے حوالے سے لوشون ادب میں ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں فن اور انسانیت کی اعلیٰ ترین قدریں آپس میں مل کر ہمیشہ زندہ رہنے والی سچائی بن جاتی ہے۔"(۴۴)

لوشون کا پہلا افسانہ "ایک پاگل کی ڈائری" جاگیر داری نظام کے خلاف ایک بھرپور اور توانا آواز کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس وقت اس افسانے کو لوشون نے لکھا، اُس دور میں چینی سماج جاگیر داری نظام کی گرفت میں تھا۔ طاقت ور انسانوں کا اپنے ہی جیسے انسانوں کو غلام بنا کر استحصال کی چکی میں پیسنے کو ایک معمول کی کاروائی تصور کیا جاتا تھا۔ ایسا طرزِ عمل ہمارے معاشرے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں ایک طاقت ور جاگیر دار اپنی قوت کے بل بوتے پر غلامی کی بدترین شکل کو بھی قائم کیے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ "ایک پاگل

کی کہانی" ایک ایسے انسان کی ڈائری ہے جو بظاہر اپنے ذہنی توازن کو کھو چکا ہے مگر حقیقت میں سماج میں موجود غیر منصفانہ نظام کا سخت ترین ناقد اور مخالف ہے۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کی دوسرے انسانوں پر بے جا اجارہ داری کا سخت ترین مخالف ہے۔

انسانی گوشت خوری کی ایک اچھوتی علامت کے پیچھے انسانوں پر قائم صدیوں پرانا استحصالی نظام ہی اصل میں انسانوں کے جسم سے ان کا گوشت نوچ رہا ہے۔ "ایک پاگل کی ڈائری" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں لوشون نے چینی سماج کی ہی عکاسی نہیں کی بلکہ پوری انسانیت کے ان مظلوم طبقات کے جذبات کو آواز دی ہے جو اپنی روح اور جسم کے رشتے کو قائم و دائم رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی سے بھی محروم ہیں۔ لوشون صرف مسائل کی ہی نشاندہی پر اکتفا نہیں کرتا بل کہ وہ ساتھ ساتھ علاج بھی بتلاتا ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رکھنا دانش مندی کے منافی ہے۔ عقل مند انسان وہی ہے جو اپنے مسائل کے ادراک کے بعد ان کے علاج کی جانب توجہ کرے۔ چنانچہ لوشون نوجوان طبقے کی اہمیت سے آگاہ ہو کر انہیں اُن کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تہذیبوں کی بقاء کے لیے از حد ضروری ہے کہ اُس تہذیب کے حاملین اِس تہذیب کے ثقافتی ورثے کو پوری دیانت داری کے ساتھ آنے والی نسلوں کو پہنچائیں۔ ہر مہذب معاشرے میں والدین کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ نئی نسل کو ایسا ماحول فراہم کریں جس میں وہ ایک بھرپور زندگی گزار سکیں اور ایک تابناک مستقبل کی بنیاد فراہم کر سکیں۔ لوشون نے اپنے اس افسانے میں نئی نسل سے شعوری سماجی تبدیلی کی امید وابستہ کی ہے، کیوں کہ نوجوان نسل ہی سماج کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی عظیم ذمہ داری سر انجام دے سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر نصری فاطمہ لکھتی ہیں:۔

> "پاگل کی ڈائری" لوشون کے فنی رویئے اور تحریر کی بہت صاف اور واضح تصویر ہے۔ یہ کہانی اس سماج کی آئینہ داری کرتی ہے جس میں اخلاق اور اقدار و روایات کا تار و پود بکھر چکا تھا اور منافقت، خود غرضی اور نفسا نفسی کے آسیب نے پورے چینی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ معاشرے کی یہ تلخ اور زہر آلود حقیقتیں کہانی کے مرکزی کردار "پاگل" کے عمل اور رد عمل کے نفسیاتی پس منظر میں اس طرح

کھینچ کر دکھائی گئیں ہیں کہ پڑھنے والا اس عمل اور رد عمل کی کوئی نہ کوئی توجیہہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جو ظاہری محرکات اور داخلی واردات کا نتیجہ ہوتی ہے۔"(۴۵)

تہذیبوں کے مابین تصادم کے تصور کی نفی کرتے ہوئے اس افسانے میں انسانیت کو وسیع تر انسانی مفاد میں ہوش کے ناخن لینے کی سبیل کی جارہی ہے۔ مرکزی کردار کا اپنے بڑے بھائی سمیت ماحول کے دیگر افراد کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ اُسے ہلاک کر کے کھا جائیں گے، اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ سماجی تشکیل میں طاقت ور کو اپنے جائز و ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے ہر طرح کی چھوٹ حاصل ہے۔ گویا کہ مثبت کام سرانجام دینا ناممکن بنا دیا گیا ہے، تاہم منفی سرگرمیوں میں خود کو شامل کرنا بہت آسان اور سہل بنا دیا گیا ہے۔ مرکزی کردار کے ان الفاظ سے اس امر کی گواہی مل جاتی ہے کہ لوشون نئی نسل کو اپنے سماج کی کمزور اور بوسیدہ بنیادوں کو ملیامیٹ کر کے نئے خطوط پر استوار کرنے کی دیرنہ خواہش کا ببانگِ دہل اعلان کر رہا ہے:-

"شاید یہاں ایسے بچے موجود ہوں جنہوں نے انسانوں کو نہیں کھایا! بچوں کو بچاؤ۔۔۔۔۔۔"(۴۶)

"کھونگ ای چی" افسانے میں لوشون نے ناقص نظامِ تعلیم پر زبردست تنقید کی ہے۔ اس افسانے میں ایک پڑھے لکھے نوجوان کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جو سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے ہونے والے امتحان میں کامیاب ہونے سے قاصر ہوتا ہے۔ ناکامی کے باعث اس میں مایوسی اور ناامیدی کی ایسی سوچ پیدا ہو جاتی ہے جو اسے نشے کی لت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حقیقت میں لوشون اربابِ بست و کشاد کو اس جانب متوجہ کر رہے ہیں کہ معاشرے کو ایسے نظامِ تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت ہے جو نوجوانوں میں امید اور حب الوطنی کے جذبات کو پروان چڑھائے، بصورتِ دیگر ایسے نوجوان ملک و قوم کے کندھوں پر ایک بوجھ بن کر بیٹھ جائیں گے۔

لوشون کے ادبی نظریے کو سمجھنے کے لیے ان کا افسانہ "ایک چھوٹا سا واقعہ" بہت مددگار ہو سکتا ہے، جس میں ایک رکشے والے غریب مزدور کے کردار کا سہارا لے کر معاشی طور پر کمزور لوگوں کی اعلیٰ ظرفی کا شاندار مظاہرہ کیا گیا ہے۔ رکشے والا مزدور اپنے رکشے سے ٹکرانے والی بوڑھی خاتون کو سہارا دے کر پولیس سٹیشن کی جانب لے جانے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ باوجود یہ کہ اسے اس عمل کا انجام بھی معلوم ہے کہ

پولیس اسے کسی نہ کردہ جرم میں پابندِ سلاسل بھی کر سکتی ہے۔ تاہم وہ اپنی اخلاقی تربیت کے باعث ایک مفلوک الحال خاتون کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہو کر اپنی اخلاقی فتح کا شان دار اعلان کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لوشون کے اس افسانے کا ایک ٹکرا اس کے تخیل کی گہرائی کا ثبوت پیش کرتا ہے:-

"اچانک مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ رکشا والے کا لمحہ بہ لمحہ دُور جاتا ہوا گرد آلود وجود بہت بلند نظر آنے لگا۔ دراصل وہ جتنا دور ہوتا جا رہا تھا، اُس لمحے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھ پر حاوی ہو کر میرے فر کے کوٹ کے اندر چھپی ہوئی "خود غرضی" کو مغلوب کر رہا ہو۔"(۴۷)

"نئے سال کی قربانی" لوشون کا ایسا افسانہ ہے جس میں خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو اجاگر کر کے اس کی شر انگیزی کو آشکار کیا گیا ہے۔ عورت کی ذات کو اپنی پہچان بنانے کے لیے سخت ترین تگ و دو کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ شیالنگ لِن کی بیوی کا کردار اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ جس کی بدولت پدر سری سماج کے حامیوں کی جانب سے رجعت پسند مذہبی تعبیر کی بنیاد پر استحصال کو روا رکھنے کو ایک عمومی بات تصور کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں تہذیبوں کے مذہبی تہواروں میں پائے جانے والے مشترکہ امور کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مسلمان ہر سال عید قربان کے موقع پر سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں جانور ذبح کرتے ہیں۔ اس تہوار کو مذہبی جوش و جذبے اور عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔ معاشرے کے کم زور طبقات کو قربانی کے گوشت کے ذریعے اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے کا بہترین موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ چرم ہائے قربانی سے غریب اور محروم المعیشت طبقات کی غربت کو دور کرنے کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر افسانے سے اس امر کی شہادت میسر آتی ہے کہ چین میں بھی مذہبی فریضہ کے طور پر جانور ذبح کر کے ان کے گوشت کو تقسیم کرنے کی ایک روایت موجود ہے۔

"کل" افسانہ ماں اور اس کی ممتا کے بے غرض جذبات کو بیان کرنے والا انتہائی فکر انگیز افسانہ ہے، جس میں لوشون نے ایک ایسی ماں کی کیفیت کو الفاظ کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا کم سن بیٹا موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا جاتا ہے۔ کپڑا تیار کر کے اپنا اور اپنے یتیم بچے کا پیٹ

پالنے والی اس عورت کی جدوجہد کا فن کارانہ خوب صورتی اور نفسیاتی کیفیات کو پیشِ نظر رکھ کر، جزیات کو پیش کرنا، بلاشبہ لوشون کے فکر و فن کا ایک نادر نمونہ ہے۔

> "ان کی کہانی "کل" اس حقیقت کی براہ راست ترجمانی کرتی ہے کہ انہیں معاشرے کے درد و کرب کا ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں بلند تر سطح پر انسانی ذہن کی پریشانی کا بھی احساس تھا۔ اس کی کہانی میں بیٹے کی شدید بیماری کے دوران ماں کے دل میں امید و بیم کی متضاد کیفیات اور ممتا کے جذبات و احساسات کی مصوری اتنی حقیقی اور اثر انگیز ہے کہ پڑھنے والا کہانی کے ساتھ ساتھ یاس و امید کی کیفیات میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے اور بیٹے کی موت کے بعد ماں جس کرب و اذیت سے گزرتی ہے اور جس طرح بے بسی کے عالم میں اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ان ساری کیفیات کو لوشون نے اپنے جذبات کی زبان دے کر ایک ادبی صداقت بنا دیا ہے۔"(48)

لوشون کا سب سے مقبول اور اثر انگیز افسانہ "ایہہ کیو کی سچی کہانی" ہے۔ اس کے اب تک اردو میں تین تراجم ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۸۴ء میں نصری فاطمہ نے کیا۔ ۱۹۸۹ء میں ارشد مسعود ہاشمی نے اسے ترجمہ کر کے اپنی کتاب "لوہ سوں کے شاہکار افسانے" کی زینت بنایا۔ بعد ازاں ۲۰۱۸ء میں رشید بٹ نے اس افسانے کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اس افسانے کا نا صرف طرزِ تحریر بھی منفرد ہے بل کہ جس فکر کو پیش کیا گیا ہے وہ بھی جداگانہ ہے۔ ایہہ کیو کا کردار ہمیں ۱۹۱۲ء کے چین کی منظر کشی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور کی ہے، جو تنِ تنہا زندگی بسر کر رہا ہے۔ روایتی دیہی ماحول میں رجعت پسند قوتوں کے رحم و کرم پر رہنے والے ایک مفلوک الحال مزدور کے لیے انقلابی قوتوں کا ہم رکاب بننے کی خواہش بھی اس حقیقت کی جانب توجہ دلاتی ہے کہ ۱۹۱۲ء سے قبل کا زرعی طبقہ ملکی زمام اقتدار سنبھالنے والے حکمران طبقے سے سخت نالاں ہے۔ ایہہ کیو اپنی پوری زندگی کا بڑا حصہ میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزار دینے کے باوجود اپنی زندگی میں کوئی آسائش پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی اس کے کردار میں ایک الگ نوعیت کی رمزیت دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کو وہ جس خوش دلی

سے قبول کرتا ہے، وہ اسی کا خاصہ ہے۔لوشون نے اس کردار کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ ایک خوب صورت ادبی مرقع بن کر سامنے آتا ہے۔افسانے کے ایک مقام پر لوشون لکھتے ہیں:۔

"بعض فاتح ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کے حریف شیروں یا عقابوں کی مانند غضبناک نہ ہوں تو انہیں اپنی فتح پر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔اُن کے مدِ مقابل بھیڑوں یا چوزوں کی مانند ڈرپوک ہوں تو وہ فتح کو بدمزہ سمجھتے ہیں۔ ایسے فاتح بھی ہوتے ہیں جو مکمل فتح حاصل کرکے، دشمن کو موت کے گھاٹ اتار کر یا اُس سے ہتھیار رکھوانے اور اطاعت قبول کروانے کے بعد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب اُن کو کوئی دشمن، مد مقابل یا حریف باقی نہیں رہا۔ صرف اُن کی ذات، برتری، تنہائی، اُداسی اور محرومی باقی رہ جاتی ہے۔ پھر انہیں احساس ہوتا ہے کہ ہماری فتح تو ایک المیہ ہے۔ لیکن ہمارا ہیرو اتنا کم ہمت نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ خوش رہتا تھا۔ غالبا" یہ بات پوری دنیا میں چین کی اخلاقی برتری کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔"(49)

لوشون کے پہلے ہی افسانے کو چینی افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ جدید افسانہ نگاری کے نقطہ ء آغاز کے طور پر اس کی اسلوبیاتی اور فکری سطح نے نئے ادیبوں کو بے حد متاثر کیا۔ تیزی سے تغیر پذیر سماج میں اعلیٰ ادبی اقدار کو نئے انداز سے متعارف کروانے کے باعث لوشون کو سخت مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ اپنے راستے پر پوری دلجمعی سے ڈٹے رہے۔ چینی افسانے کی مختصر تاریخ کو بھی قلم بند کرنے کے باعث ان کی شمار سنجیدہ ناقدین کے طور پر بھی ہونے لگا تھا۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے کے پس منظر میں دیکھا جائے تو لوشون کے افسانے ہر اس تہذیب کے پروردہ لوگوں کے لیے حضرِ راہ کا کام دے سکتے ہیں جہاں دقیانوسی جاگیرداری نظام آج بھی اپنی بقاء کے لیے انسانوں کا استحصال کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوشون کے افسانے اپنی اشاعت کے محض دو سال بعد ہی لگ بھگ تیرہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے حاملین کے مابین ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کرنے میں پیش پیش رہے۔ ایڈگر سنو نے اسے والیتئر کے "کاندید" کا ہم پلہ ہی نہیں بل کہ اس سے بھی زیادہ اہم تصور کیا ہے۔ شومووینگ نے لوشون کو وہ مقام عطا کیا ہے جو فرانسیسی روشن خیالی میں والیتئر کو حاصل ہے۔ بعض ناقدین نے

لوشون کے فکر و فن کا موازنہ چیخوف، گورکی اور پریم چند سے بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی اپنی کتاب "لوہ سوں کے شاہکار افسانے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"لوہ سوں جدید چینی ادب کا باوا آدم اور آبادکار کہلاتا ہے۔ چین کی ادبی تاریخ میں وہ ایک عظیم مصنف، مفکر اور انقلابی دانشور کی حیثیت سے معروف ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس قدیم آدم خور نظریاتی نظام کی بنیاد ڈھادی جس نے چین کو کئی ہزار برسوں سے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ عوام کو اس نے ایک نئی نظریاتی بنیاد اور تہذیب سے روشناس کروایا۔ قدیم چین کے تاریک دور میں لوہ سوں اپنے عقب میں موجود عوام کو زندگی کی نئی روشنی سے آگاہ کراتے ہوئے نظریاتی نظام سے متعلق مشعل کو لیکر آگے بڑھا۔ آدمی کی نجات اور آزادی اس کی منزل تھی۔"(50)

"معاصر چینی افسانے" کے نام سے نوجوان مترجم منیر فیاض نے جدید چینی افسانہ نگاروں کے فن پاروں کا ایک انتخاب اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے تعاون سے ۲۰۱۷ء میں پیش کیا۔ اس انتخاب میں بیس افسانوں کے تراجم شامل ہیں۔ فاضل مترجم کے بقول اس انتخاب میں دیہی معاشرت کی عکاسی کرنے والے افسانوں کی کثرت ہے۔ تاہم علامتی افسانوں کی چینی ادب میں کمیابی کے باوجود اس انتخاب میں ایک افسانہ شامل کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم نے تراجم کے اس انتخاب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے یوں صراحت کی ہے:-

"یہ منتخب افسانے معاصر ادیبوں کی تحریریوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ ان میں یہ بات بالخصوص قابلِ غور اور قابلِ ستائش ہے کہ چینی ادیبوں نے روایتی بیانیے میں ہی ایسی فنی جہتیں پیدا کر دی ہیں کہ فن پارے عالمی افق پر بھی کسی بھی زبان کے ادب کے ساتھ موازنے کے لیے رکھے جا سکتے ہیں۔ ان افسانوں کا مرکزہ انسان اور انسانیت ہے۔ چینی ادیب اپنے ارد گرد پھیلی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھتا ہے اور روزمرہ کے واقعات اور کرداروں سے ادب تخلیق کرنے کا ہنر جانتا ہے۔"(51)

زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا اولین افسانہ "تین ایکڑ قطعہ اراضی" جیاپنگ وا(Jia Pingwa) کا لکھا ہوا ہے۔ بنیادی طور پر اس میں دیہی اور شہری زندگی کے تنوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انسانی تہذیب کے اولین

مرکز کے طور پر دیہات کی اہمیت مسلمہ ہے۔ انسانی اقدار کی ابتدائی نشوونما گاؤں دیہاتوں میں ہی ہوئی تھی۔ تاہم فی زمانہ تہذیب کے یہ گہوارے مٹتے جا رہے ہیں۔ دیہاتی سماج میں جاگیرداری نظام نے جس انداز اپنے پنجے گاڑھے اور تہذیبی علامتوں کو ملیامیٹ کرتے ہوئے صنعتی شعبے کو بے لگام وسعت دینے کی کوشش کی تو اس سے سماج میں ایک ردعمل پیدا ہوا۔ اسی کیفیت کو ایک ہی خاندان کی مختلف نسلوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کے باعث سوچوں میں آنے والے تبدیلی کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ زمین کے ساتھ وابستگی دیہی معاشرت کے حامل افراد کے لیے ایک جزولاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل مترجم کا یہ کہنا بجا ہے کہ اس افسانے میں جیاپنگ وانے زمین کے ایک ٹکڑے کی کہانی بیان کرتے ہوئے جدید چین کے ارتقاء کی پوری تاریخ کو سماجی اور معاشرتی حوالوں کی مدد سے کھول کر رکھ دیا ہے۔ ایک ہی خاندان کی چار نسلوں میں ایک ہی قطعہ آراضی کے انتقال کی کہانی کو بیان کرتے ہوئے چینی دیہی معاشرت کو فن کارانہ مہارت سے پیش کیا گیا ہے اور تہذیب کے اندر بھی مختلف نسلوں کے درمیان مکالمے کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

شُومو کا دیہی پس منظر میں لکھا گیا افسانہ "بوڑھا شن جیانگ" ایک گاؤں میں بوڑھے شخص کی کہانی بیان کرتا ہے۔ زندگی کی تلخیوں کے باوجود وہ مفلوک الحالی میں ایک مطمئن زندگی گزار کر انسانوں سے نہ سہی مگر ایک کتے کا اعتماد جیت کر اپنی دریا دلی کا بے لاگ مظاہرہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیو شِن وُو کا افسانہ "کھانے کا تمغہ" دراصل تہذیبی اقدار کا ایک خوب صورت مرقع ہے جس میں بزرگ نسل کے لوگوں کا نوجوان نسل کے افراد کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے کے اہم کردار کو ایک باپ کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے جو اپنے بیٹے کو اپنی نوجوانی کے زمانے کی یادیں بتلاتے ہوئے، سماجی اقدار کی اہمیت باور کروا رہا ہے۔

> "پھر باپ نے دونوں نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں سے ایک ہے جس کا تجربہ ہماری نسل کو ہوا ہے۔ مگر تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اکٹھا کرتے ہو تو تاریخ مرتب ہوتی ہے۔" (52)

اُردو زبان میں فی الوقت چینی افسانوں کے چند ہی تراجم موجود ہیں۔ گو کہ ان تراجم سے چینی افسانہ نگاری کے تعارف کی حد تک واقفیت میسر آتی ہے۔ منیر فیاض کے مجموعے میں جدید چینی افسانوں کے مزاج اور ساخت سے بڑی حد آگاہی میسر آتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے چینی افسانوں کے مزید تراجم کو ممکن بنایا جائے، تاکہ پاکستان اور چین کے درمیان ادبی روابط کو مضبوط تر کیا جاسکے۔

د۔ سفر نامہ

اصنافِ ادب میں سفر نامے کو بھی خاص مقام حاصل ہے۔ سفر نامہ نگار دراصل کسی علاقے کی ثقافت کو بیان کرنے میں اپنے مشاہدے اور تجربے کے بل بوتے پر ایک ایسی دستاویز فراہم کرتا ہے جس کی بدولت جہاں قارئین کو مذکورہ مقام کا نہ صرف تعارف ملتا ہے بل کہ وہاں کی تہذیبی اقدار بھی جیتی جاگتی صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ چینی ادب کے وہ سفر نامے جو اردو زبان میں منتقل ہوئے ہیں، انتہائی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو ایسے ہیں جو زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔

چینی ادبی تراجم میں دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں سفر نامے کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں، جن میں سے سر فہرست یہ ہے کہ اس میں چین پر ہندوستانی تہذیب کے انمٹ اثرات کا سراغ ملتا ہے۔ چین پر بدھ مت کے اثرات کی ایک دلچسپ تاریخ موجود ہے۔ اسی پس منظر میں دو چینی مذہبی رہنماؤں کے سفرِ ہندوستان کی خاص اہمیت ہے، جو مذہبی فریضے کی غرض سے چین سے دشوار گزار راستوں سے گزر کر ہندوستان میں بدھ مت کے مراکز تک پہنچے تاکہ مذہبی تعلیمات کو خالص انداز میں سیکھ کر واپس چین جاکر عام کر سکیں۔ اس ضمن میں فاہیان کا سفر نامہ ہند خصوصیت کے ساتھ اپنی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سفر نامے کو چینی زبان سے انگریزی میں ۱۸۷۷ء میں ہربرٹ اے گیلیز (Herbart A. Giles) نے منتقل کیا جب کہ ۱۸۸۲ء میں جیمز لیگی (James Legge) نے اس کا دوسرا ترجمہ پیش کیا۔ اردو زبان میں فاہیان کے اس دلچسپ سفر نامے کا ترجمہ یاسر جواد نے کیا۔ اس ترجمے کو ۲۰۲۲ء میں تخلیقات پبلشرز، لاہور نے شائع کیا۔ اس ترجمے کی خاص بات یہ کہ چینی اصطلاحات کی بخوبی وضاحت کے لیے اس میں سیر حاصل حاشیے سے رہنمائی کی گئی ہے۔ کتاب کا نصف سے زائد حصہ اصل متن

کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ فاضل مترجم اس ترجمے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے "حرفِ آغاز" میں یوں رقم طراز ہیں۔

> "فاہیان نے چینیوں کو بدھ مذہب کی بنیادی کتب فراہم کرنے کی خاطر برفیلے پہاڑوں، سنگلاخ چٹانوں، کھلے میدانوں، بڑے بڑے شہروں، جنگلوں، سمندروں میں سفر کیا اور جن علاقوں سے گزرا وہاں کا حال مختصرا" پیش کرتا گیا۔۔۔ یہ سفر نامہ اور اس کے حاشیے پانچویں صدی کے ہندوستان کا سماجی، مذہبی، جغرافیائی، تہذیبی اور کچھ حد تک معاشی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔"(53)

فائیان (Faxian/Fa-Hein) کا تعلق چوتھی صدی عیسوی کے ایک چینی مذہبی خاندان سے تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق فائیان کی پیدائش ۳۳۷عیسوی میں ہوئی۔ چینی روایت کے مطابق ان کو خاندانی نام گونگ (Gong) اور پیدائشی نام سیہی (Sehi) تجویز کیا گیا۔ تاہم انہیں تاریخی طور پر فائیان کے نام سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ فاہیان نے بدھ مت کی تعلیمات، جو اس وقت چینی میں اپنی خالص شکل میں دستیاب نہ تھیں، کے حصول کے لیے ساٹھ سال کی عمر میں اپنے نو ہم خیال ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر کے دوران انہیں ہندوستان کے بہت سے تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اہلِ علم کی زبان سنسکرت میں غیر معمولی مہارت حاصل کی۔ اِس صلاحیت کی بدولت انہوں نے اصل ماخذات تک رسائی حاصل کی اور بدھ مت کے دینی لٹریچر کو اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ خَہ مئے لَین اپنی مترجمہ کتاب "چین پاکستان ثقافتی تبادلوں کی تاریخ" میں رقم طراز ہیں:۔

> "بدھ مت کے صحیفوں کی تلاش میں نکلنے والا پہلا چینی راہب مشرقی جِن سلطنت کے دور کا فاشیاں تھا۔ اس وقت چین میں کافی تعداد میں بدھ مت کے صحیفے موجود تھے لیکن مکمل وِنایا کی کمی تھی۔ ۳۹۹عیسوی میں خوئی جِنگ اور دیگر راہبوں کے ساتھ فاشیاں وِنایا کی تلاش کے لیے مغرب کے سفر پر گیا۔ اس نے قدیم پاکستان میں تقریبا" نو مملکتوں کا سفر کیا۔"(۵۴)

فاہیان نے اپنے طویل اور دشوار گزار سفر کو یادگار بنانے کے لیے سفر نامہ قلم بند کیا تاکہ اس دستاویز سے بھی آنے والی نسلیں فائدہ اٹھا سکیں۔ اس سفر کے دوران انہیں بے پناہ خطرات، پریشانیوں اور مصائب کا

سامنا کرنا پڑا۔ دورانِ سفر انہیں بدھ مت کی سر گردہ شخصیات سے ملنے کا بھی موقع میسر آیا۔ ان تمام باتوں کے لکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بنیادی کام یعنی خالص مذہبی لٹریچر تک رسائی کے مشن پر بھی کاربند رہا۔ چالیس ابواب پر مشتمل یہ سفر نامہ بنیادی طور پر پاک چین تاریخی روابط کی زندہ دستاویز ہے۔ قدیم ہندوستان کے وہ علاقے جو اس وقت پاکستان کا حصہ ہیں، تاریخی اعتبار سے چینی مذہبی طبقے کے لیے مقدس تصور کیے جاتے رہے ہیں۔ بدھ مت کے کہیں ایک مقدس مقامات انہی علاقوں میں موجود ہیں۔ ٹیکسلا اور پشاور کے علاقوں میں اب بھی بدھ مت کی تاریخی سائیٹس پر محققین اب بھی غور و فکر میں مصروف ہیں۔

فاہیان کے اس سفر نامے کی بدولت قدیم ہندوستان کی معاشرت کی بہت منفرد شکل سامنے آتی ہے۔ فاہیان نے مختلف شخصیات، مقامات، اہلِ سیاست اور تاریخی مقامات کا تذکرہ کر کے اس سفر نامے کو ایک خاصے کی چیز بنادیا ہے۔ یہ دستاویز محض ایک مذہبی سفر کی سرگذشت کے بجائے ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ تہذیبوں کے درمیان روابط کی ایک عملی صورت بڑے واضح انداز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ فاہیان کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں تحریر کو بانس کی مدد سے بننے والی ایک سطح پر لکھا جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ روشنائی کی تیاری بھی بہت محنت سے کی جاتی تھی، تاکہ اسے طویل عرصے تک کے لیے محفوظ بنایا جاسکے۔

فاہیان کے بعد چین میں بدھ مت کی خالص تعلیمات کو عام کرنے میں جس شخصیت کو اہم مقام حاصل ہے انہیں تاریخ میں ہیون سانگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعض تحریروں میں ان کا نام ہیون تسانگ، ہواین تسانگ یا یہون چانگ بھی ملتا ہے۔ تاہم مسٹر چاؤنیز اور پروفیسر ڈی لا کوپرے کی تحقیقات کی روشنی میں اول الذکر کو ہی اولیت حاصل ہے۔ ہیون ۶۰۰ عیسوی کے لگ بھگ چن لیو موجودہ کیفنگ کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اسے اس بات کی شدت سے احساس تھا کہ بدھ مت کی جو تعلیمات اس کے معاشرے میں رائج ہیں، وہ اپنی اصل سے کوسوں دور ہیں نیز اُن تعلیمات میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اساسی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہو گئیں ہیں۔ اس پس منظر میں اُس نے پختہ ارادہ کیا وہ خود بدھ مت کے اصل مرکز ہندوستان جاکر اصل بدھی تعلیمات کو بنفسِ نفیس سیکھے گا اور بعد ازاں انہیں اپنے ملک میں عام کرئے گا۔ اس بارے میں چینی ادبی تاریخ پر گہری نگاہ رکھنے والے ڈاکٹر ارشد مسعود اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:-

"بدھ مت کے عظیم شارح اور مترجم ہُوان تسانگ (۶۶۴ء تا ۵۹۹ء) کا تعلق بھی تھانگ سلطنت سے تھا۔ اس سلطنت کے دوران چین سے ہندوستان کا سفر کرنے والوں میں یہ ایک معروف شخص تھا۔ چھٹی صدی کی آخری دہائی میں اس کی پیدائش ہنان میں ہوئی تھی۔۔۔۶۲۹ء میں وسط ایشیا ہوتے ہوئے وہ ہندوستان کے لیے روانہ ہوا، ۶۳۳ء میں ہندوستان پہنچا اور دس برسوں تک بدھ سے وابستہ تمام مقامات کی سیاحت اور مطالعہ ومشاہدہ کے ساتھ ہی کتابیں بھی جمع کرتا رہا۔ ۶۴۵ء میں چین واپسی کے بعد اپنی بیس برس کی باقی ماندہ زندگی اس نے ان کتابوں کے تراجم اور اپنے مشاہدوں سے حاصل شدہ علم کی تبلیغ میں صرف کیے۔ اس کے سفر نامے کے مطابق وہ ہندوستان سے ۶۵۷ تصانیف اور مخطوطوں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ اس نے پچھتر متون کا چینی ترجمہ کیا اور یہ آج بھی سنسکرت کے معیاری چینی ترجموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مترجم اور شارح کی حیثیت سے اس نے یہ کاوش کی کہ اس عہد میں ہندوستانی بدھ مت کی تصویر کو من و عن چینیوں کے سامنے پیش کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں وشوبندھو اور دھرم پال کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں اور وہ چینی کے بجائے ہندوستانی جوہر کو پیش کرتی ہیں۔"(۵۵)

ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ تو بہت مدت قبل ہی ہو گیا تھا۔ مگر اردو زبان میں اس کا اولین ترجمہ بھی فاہیان کے ترجمے کی طرح یاسر جواد ہی نے کیا۔ اس ترجمے میں بھی چینی زبان اور سماج میں رائج اصطلاحات کی توضیح کے لیے حاشیے کی مدد لی گئی ہے۔ فاضل مترجم نے بڑی عرق ریزی سے اس ترجمے کو مکمل کیا ہے اور اردو زبان جاننے والے قارئین کے لیے ہندوستان کے بارے میں ایک منفرد نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی بنیاد پر فاضل مترجم ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"ہیون سانگ کی کتاب کا تاریخی وصف یہ ہے کہ اِس سے ہم اُس دور کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی آئین و قوانین معلوم کر سکتے ہیں، مگر ہم اس کے اور بھی زیادہ ممنون اس

لیے ہیں کہ اس نے قدیم روایات کو اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا۔ اگر ہیون سانگ یہ خدمت سر انجام نہ دیتا تو شاید یہ خزانہ ضائع ہو جاتا۔"(۵۶)

دیگر اصنافِ ادب کی مانند چینی سفر نامہ نگاروں کی جانب سے قدیم ہندوستان کے بارے میں پیدا ہونے والا تاثر بہت ہی منفرد اور خاصے کی چیز ہے۔ اس کی بدولت دونوں زبانوں کو بولنے والے افراد میں ایک ہم آہنگی اور مکالمے کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ تہذیبوں کے مابین روابط کو تراجم کی ہی صورت میں بہتر اور موثر بنایا جا سکتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب اپنے مخصوص ہیتی تقاضوں کے باعث ان تفصیلات کو فراہم کرنے سے قاصر رہتی ہیں جن کو ایک سفر نامہ نگار بڑی آسانی سے بیان کرنے کی قدرت وصلاحیت رکھتا ہے۔

ح۔ آپ بیتی

اصنافِ ادب میں آپ بیتی کو بھی ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ آپ بیتی غیر افسانوی ادب ایک ایسی صنف ہے جس میں کوئی نامور شخصیت اپنی زندگی کے بارے میں ان حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے، جن کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ عوام کو اس کی ضرورت ہے۔ عمومی طور پر آپ بیتی عمر کے اس حصے میں لکھی جاتی ہے جس میں بڑھاپا غالب ہوتا ہے۔ چینی ادب کے اردو تراجم میں ایک آپ بیتی بھی شامل ہے۔ یہ آپ بیتی چین کے آخری شہنشاہ کی ہے، جس میں وہ اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے ادوار پر محیط ہے۔ چین کے آخری شہنشاہ کی آپ بیتی سے نہ صرف اُن کی ذاتی زندگی اور اُن کو درپیش صورت حال سے آگاہی ملتی ہے بلکہ شہنشاہی نظام کے بارے میں بھی مفید معلومات میسر آتیں ہیں۔ برعظیم پاک وہند میں بھی ایک طویل عرصے تک بادشاہی نظام قائم رہا ہے۔ شہنشاہی نظام کے خاتمے کے بعد حکمران خاندان کے کسی اہم فرد کی جانب سے اپنی خود نوشت کو پیش کرنے کی یہ ایک منفرد کوشش ہے۔

تاریخ چین میں چینی بادشاہت و حکومت کا یہ خاصہ رہا ہے کہ بادشاہتیں بدلنے کے باوجود انتظامیہ کا سلسلہ ۲۱ صدیوں تک مسلسل مربوط رہا اور ۲۰۶ ق م سے ۱۹۱۲ء یعنی ۲۱ صدیوں تک یہ نظام بخوبی چلا۔ اس کا سہرا چین کے خاص اسکالر اور افسران کو جاتا ہے جنھوں نے اس روایت کو زندہ رکھا یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ چین کا نظم ونسق بھی ہمیشہ منظم اور مربوط رہا۔۔ اس خاص روایت کی وجہ یہ تھی کہ حکومت میں نوجوان، خطاطوں، مؤرخین، ادبا اور ماہر فلسفیوں کا انتخاب بڑے اہتمام اور سخت حکومتی امتحانات کے بعد کیا

جاتا تھا۔ چین کا سب سے آخری شاہی خاندان چنگ شاہی خاندان ۱۶۴۴ء تا ۱۹۱۲ء ہے۔ اس کے بعد چین میں جمہوری دور کا آغاز ہوتا ہے اور ۱۹۱۲ء تا ۱۹۴۹ء رہی۔ پھر عوامی جمہوریہ چین کی بنیاد پڑی جو ۱۹۴۹ء سے اب تک قائم ہے۔ چینی تاریخ کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں امن وسکون اور جنگ یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ کبھی سیاسی اتحاد دیکھنے کو ملتا ہے کبھی ناکام ریاستوں کا دور شروع ہوتا ہے اور ایک طویل عرصہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۷ء تک سیاسی اتحاد اور امن وسکون کے بعد چین میں خانہ جنگی کا دور شروع ہوا جو ۱۹۴۹ء تک چلا۔ فی الحال چین میں پھر سے سیاسی استحکام آگیا ہے اور امن وسکون کا ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔ چین میں وقتاً فوقتاً خانہ بدوشوں کی حکومت رہی ہے اور ان میں سے اکثر ہان چینی قومیت سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے ہیں۔ چین کے شاہی خاندانوں نے مختلف ادوار میں ملک کے ایک حصہ اور بعض دفعہ مکمل خطہ پر حکومت کی۔ ان میں سے کچھ حکومتیں سنکیانگ اور تبت تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چین میں مہاجرین اور تاجروں کے ذریعے مغربی اور ایشیائی تہذیبیں متعارف ہوئیں۔

چینی شہنشاہ کی آپ بیتی کا ترجمہ عوامی جمہوریہ چین میں قائم "غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر" بیجنگ سے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا گیا تھیا۔ اس آپ بیتی کو دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ حامد ہاشمی نے کیا ہے، جب کہ نظرِ ثانی رشید بٹ نے کی ہے۔ پہلی جلد پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں چینی شہنشاہ کے خاندان، بچپن اور سیاسی مصروفیات کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چینی شہنشاہ کا اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں تحلیل و تجزیہ بڑی حد تک بے لاگ اور کسی مصلحت کو پیشِ نظر رکھے بغیر ہے۔ اُن کی زندگی کے ابتدائی ادوار تو شاہی ناز و نعم میں گزرے تاہم چین میں سیاسی بیداری کے بعد بادشاہت کو ختم کر دیا گیا۔ اپنی زندگی کے کچھ عرصے میں وہ نظر بند بھی رہے، تاہم جلد ہی وہ نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت انہوں نے اشتراکی تعلیمات کو بغور پڑھنا شروع کر دیا اور پھر آخر کار اشتراکی فلسفے کو قبول کر لیا۔ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:-

> "میں ۷ فروری ۱۹۰۶ء کو پیچنگ میں شہزادہ چھون کے محل میں پیدا ہوا۔۔۔ میں شہزادہ چھون دوم کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۰۸ء کو جب بیوہ ملکہ چھی شی نے اچانک مجھے تخت و تاج کا وارث بنانے کا فیصلہ کیا تو میری عمر تین سال تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی

کہ وہ خود اور شہنشاہ تھونگ چی (عہد حکومت ۷۴-۱۸۶۲ء) کا لے پالک بیٹا اور اس کے عم زاد کوانگ شوی کا باضابطہ ولی عہد بن گیا۔ محل میں میری آمد کے دو دن کے اندر کوانگ شوی اور بیوہ ملکہ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ میں ۲ دسمبر کو چھینگ خاندان کے دسویں حکمران اور چین کے آخری حکمران کی حیثیت سے تخت شاہی پر متمکن ہوا۔"(۵۷)

کسی بھی تہذیب میں محبت کا جذبہ کسی نہ کسی صورت میں اپنی جلوہ گری دکھاتا رہتا ہے۔ یہ جذبہ کسی انسان سے بھی ہو سکتا ہے اور کسی مادی شے سے بھی۔ تہذیبی مکالمے کے لیے ضروری ہے کہ دوسری تہذیبوں کی ان چیزوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے جو مشترکہ انسانی اقدار میں شمار ہوتی ہیں۔ چینی شہنشاہ کی ابتدائی پرورش میں ایک آیا کا بنیادی کردار تھا۔ انہوں نے بادشاہ کو بچپن میں اپنی اولاد سے بڑھ کر خیال رکھا۔ آیا کے اس کردار کی بادشاہ ہمہ وقت قدر کیا کرتے تھے۔ اپنے بچپن کی اُن حسین یادوں کو یاد کر کے ان کا دل فرطِ جذبات سے آبدیدہ ہو جاتا اور وہ اپنی عظیم آیا کے کردار کو یاد کر کے ان کے لیے نیک جذبات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ شاہی محل میں ہونے والے مختلف امور اور رہائش پذیر مختلف شخصیات کے بارے میں انہیں جن خیالات کا سامنا کرنا پڑتا، وہ انہیں بے باک انداز میں قلم بند کرتے رہے۔ اپنی آیا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

"وہ بڑی حلیم الطبع تھی اور کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کرتی تھی۔ اس کے دلکش چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی اور اکثر چپ سادھے رہتی تھی۔ اگر بات کرنے میں دوسرا شخص پہل نہ کرتا تو وہ خاموشی سے صرف مسکرا دیتی۔ جب میں چھوٹا تھا تو مجھے اس کی یہ مسکراہٹیں کسی قدر عجیب لگتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا اس کی نگاہیں دور کسی شے پر ٹکی ہوں۔"(۵۸)

چینی شہنشاہ کی آپ بیتی اُن کے بچپن، لڑکپن، تخت نشین ہونے کے دور کے ساتھ ساتھ اس دور کی تہذیبی روایات کو بھی زیرِ بحث لاتی ہے۔ چینی ثقافت کے متنوع مظاہر کو اس آپ بیتی میں پیش کیا گیا ہے۔ لباس، زبان، طرزِ تعمیر، فنونِ لطیفہ، خوشی غمی کے مواقع اور پکوان وغیرہ کے بارے میں بھی مفید معلومات میسر آتی ہے۔ چینی شہنشاہ کے سیاسی حیثیت باوجوہ ایک علامتی عہدے دار کی سی تھی، اس لیے انہیں ریاستی

امور میں زیادہ مداخلت کا اختیار حاصل نہ تھا۔ اسی لیے ان کا زیادہ وقت خانگی امور میں صرف ہوتا تھا۔ چند سرکاری اہلکاران سے غیر رسمی امور پر تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ شہنشاہ پھوای اپنی روزمرہ سرگرمیوں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:-

> "چونکہ مجھے سیاست میں کوئی کردار ادا کرنے، اپنی مرضی سے باہر آنے جانے یا اپنے "وزراء" کو مشورے کے لیے بلا بھیجنے کی اجازت نہیں تھی، لہٰذا جب کوان تونگ فوج کی طرف سے کوئی برقی رو مجھ تک منتقل نہیں ہو رہی تھی تو میرے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میں صبح گیارہ بجے جاگنے اور آدھی رات کے بعد، بلکہ بعض دفعہ تین بجے سونے کی عادت بنالی تھی۔ میں دن میں دو دفعہ کھانا کھاتا۔ ناشتہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان، بعض اوقات اس سے بھی دیر میں کھاتا، کھانے اور سونے کے علاوہ میری زندگی مار پیٹ و گالی گلوچ، فال رمل، ادویہ اور خوف کھانے سے عبارت تھی۔"
> (۵۹)

چینی شہنشاہ جب اپنے عہدے سے معزول ہوئے تو اس دوران انہیں جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، وہ شاہی ناز و نعم میں پلے بڑھے انسان کے لیے ناقابل یقین تھا۔ گو کہ چین کی نئی عوامی حکومت نے سابقہ شہنشاہ اور ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ بہت مثالی سلوک کیا مگر چونکہ ان کی زندگی عیش و عشرت سے مزین تھی، اس لیے انہیں نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے میں بڑی دقت ہوئی۔ برعظیم پاک و ہند میں بھی ایک طویل عرصے تک بادشاہی نظام قائم رہا۔ اس نظام کے بدلنے کے بعد جو صورت حال بنی، اس میں ظلم و سفاکی کی انمٹ داستانیں رقم ہوئیں ہیں۔ انگریز حکومت نے مغلیہ خاندان کے افراد کو رنگون میں نظر بند کر دیا۔ یہاں تک کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا انتقال بھی وہیں ہوا اور انہیں دلی میں دفن کرنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ چینی حکومت نے سابقہ حکمران خاندان کے لیے مناسب انتظامات کیے تھے، مگر انہیں ایسی مراعات حاصل نہ تھیں جنہیں صرف مطلق العنان دورِ حکومت میں ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس دوران سابقہ چینی شہنشاہ کو نئی صورت حال میں خود کو ہم آہنگ کرنے میں جس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا، اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

"گذشتہ چالیس سال میں، میں نے کبھی اپنی رضائی تہہ نہیں کی تھی، اپنا بستر نہیں بچھایا تھا اور نہ ہی ہاتھ منہ دھونے کے لیے کبھی پانی انڈیلا تھا۔ میں نے تو بلکہ کبھی اپنے پاؤں بھی خود نہیں دھوئے تھے اور نہ ہی کبھی اپنے تسمے باندھے تھے۔ میں اپنے چاول نکالنے کے لیے کفگیر، اور چاقو یا قینچی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، کبھی سوئی دھاگے کو نہیں چھوا تھا۔ اب جب مجھے خود اپنی دیکھ بھال کرنا پڑی تو بڑی مشکل میں پھنس گیا۔" (۶۰)

تہذیبوں کے انہدام میں جو قدر مشترک ہے اس کا جوہر یہی آفاقی سچائی ہے کہ جن معاشروں میں رجعت پسندی اپنی پوری شدت کے ساتھ رچ بس جاتی ہے وہاں کا سماج بوسیدہ بنیادوں کے باعث جلد ہی اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ تہذیبیں اسی لیے شکست وریخت کا شکار ہو کر مٹ جاتی ہیں جب وہ دوسری تہذیبوں کے ساتھ مکالمے کے عمل سے پہلو تہی کرتی ہیں۔ جس زمانے میں چین میں بادشاہی نظام اپنی آخری عمر پوری کر رہا تھا، اس سے کہیں دہائیاں قبل دنیا جمہوریت کے تصور سے آشنا ہو چکی تھی۔ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ دیگر تہذیبوں کے حاملین کی ان مثبت اقدار کو قبول کیا جاتا جن کی بدولت انسانیت ترقی کی منازل تیزی سے طے کر رہی تھی، مگر عالمی سامراجی نظام کے آلہ کار کی حیثیت سے عوام پر غلامی کا شکنجہ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔ تہذیبی مکالمے کی صورت میں سماج غیر ضروری خون خرابے اور پر تشدد رویوں سے محفوظ رہتا ہے۔ چینی شہنشاہ کی آپ بیتی کے اردو ترجمے اور دیگر چینی ادبی تراجم سے جہاں تہذیبی مکالمے کی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے وہیں اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ بین الثقافتی ہم آہنگی انسانیت کی ایک اعلیٰ ترین قدر ہے، جسے بلا تفریق رنگ و نسل پوری انسانی نسل قبول کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔

و۔ ادبِ اطفال

چینی ادبی تراجم میں ادبِ اطفال کا بھی ایک نمایاں حصہ موجود ہے۔ ادبِ اطفال ایسا ادب ہے جس میں بچوں کے ذہنی معیارات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ادبی تخلیقات کو پیش کیا جاتا ہے۔ نئی نسل کو مطالعہ کی جانب راغب کرنے اور کتب بینی کی عظیم علمی روایت سے جوڑنے کے لیے ابتدائی عمر میں ہی بچوں میں کتابوں کی اہمیت پیدا کرنا ایک اہم ترین سرگرمی ہے۔ دورِ حاضر میں ادبِ اطفال کی اہمیت اس اعتبار سے بھی بڑھ گئی ہے کہ نسلِ نو کمپیوٹر، ویڈیو گیمز اور اس جیسے آلاتِ تفریح کے باعث کتاب سے دور ہو رہی ہے۔ اس صورت

حال میں ادبِ اطفال ایسے بچوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ایک مشہور چینی کہاوت ہے کہ اگر آپ ایک سال کا منصوبہ بنا رہے ہو تو کاشتکاری کرو، دس بیس سال کا منصوبہ بنا رہے ہو تو باغبانی (پھلدار درخت لگانے) کا منصوبہ بناؤ اور اگر آپ اس سے طویل مدت کا منصوبہ بنا رہے ہو تو اپنی نسلوں کو تیار کرو۔۔ اساتذہ اور والدین کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ باہم مل کر آنے مستقبل کے معماروں کو کتاب کے اہمیت سے روشناس کروائیں۔

اردو میں بچوں کے ادب کی ایک توانا روایت رہی ہے۔انیسویں صدی کے دوران محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے خوب صورت کتابیں تصنیف کی تھیں۔موجودہ زمانے میں لکھی جانے والی تمام تحریریں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی امنگوں، ان کی خواہشوں، دلچسپیوں اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔کتابیں پڑھنے کا شوق ویسے بھی کئی وجوہات کی بنا پر کم تھا، اور اب میڈیا کی بدلتی شکلوں نے کتابوں کے پڑھنے کے ذوق کو اور بھی کم کر دیا ہے۔بڑوں کا معاملہ بھی دگر گوں ہے۔اس کے اثرات بچوں پر بھی پڑتے ہیں۔والدین کا رویہ یہ ہے کہ جن کتابوں کا تعلق نصاب یا سکول سے ہے وہی کتابیں خریدیں گے۔نصابی کتب سے ہٹ کر دیگر لٹریچر ابھی اکثر والدین کے نزدیک فضول خرچی ہے۔اگر کوئی بچہ پڑھنے کا ذوق بھی رکھتا ہے تو والدین اس کی ہمت افزائی نہیں کرتے۔تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے زندگی کے جس شعبے میں مشترکہ کوششیں کی وہاں انہوں نے ترقی کی، مگر افسوس کہ بچوں کے ادب نے ترقی کے بجائے تنزلی ہی کا راستہ اختیار کیا ہے۔آج کل بچوں کا ادب جن حالات سے گزر رہا ہے وہ کسی اہل قلم سے ڈھکے چھپے نہیں۔ایک ادیب روشنی کو سیاہی اس لیے کہتا ہے کہ کیونکہ وہ معاشرے کی سیاہیوں کو سفید صفحے پر پھیلا کر معاشرے کے سفید اور سیاہ کو اجاگر کرتا ہے اور دور کرنے کی سعی کرتا ہے اور آج یہ سیاہی اسی ادیب پر الٹ دی گئی ہے۔اردو ادب کی کئی نامور شخصیات نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور ترجمہ بھی کیں۔

> "بچوں کا ادب، ادب کی ایک مشکل ترین صنف سمجھی جاتی ہے۔یہ ادب ایک مقصدی ادب ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے بچوں کو مسرت کی فراہمی کے ساتھ ساتھ، ان میں تخیل کی صلاحیت پیدا کرنے، جذبہ اور حوصلہ پروان چڑھانے، مختلف النوع تجربات

سے روشناس کروانے، دنیا اور لوگوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے، ان میں ثقافتی و تہذیبی ورثے کو منتقل کرنے اور اخلاقی اوصاف کے نشوونما کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس ادب کے ذریعے ان میں پڑھنے اور لکھنے کی مہارتیں اور مختلف میدانوں سے متعلق علم کو بھی پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔"[۶۱]

چینی ادبی تراجم کی روایت کو اس اعتبار سے اہم کہا جاسکتا ہے کہ اس میں ادبِ اطفال کا بھی ایک خاطر خواہ حصہ موجود ہے۔ اس روایت کے معروف مترجمین نے جہاں دیگر اصناف کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے، وہیں بچوں کے ادب کی کتب کو بھی اردو زبان میں منتقل کر کے تہذیبوں کے مابین مکالمے کو فروغ دینے کے عمل کو باہم تقویت فراہم کی گئی ہے۔ اس ضمن میں احفاظ الرحمن کو اس اعتبار سے اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے جہاں چینی زبان کی متنوع کتب کو اردو کا جامہ پہنایا وہیں بچوں کی کتب کو بھی خصوصی دل چسپی سے ترجمہ کر کے اردو پڑھنے والے ادبِ اطفال کے قارئین کو چینی سماج اور ثقافت سے روشناس ہونے کا سنہری موقع فراہم کیا۔ چینی بچوں میں مقبول "گوڈر شاہ کے کارنامے" اور "تین خود پسند بلونگڑے" نامی ناولوں کو احفاظ الرحمن نے ترجمہ کیا۔ اول الذکر ناول کی اشاعت ایک ہی بار ہوئی جس کے باعث اس تک رسائی از حد دشوار ہے۔ موخر الذکر ناول کو فرید پبلشرز لاہور نے ۲۰۰۹ء میں اُن کی دو دیگر کتب کے ساتھ جوڑ کر شائع کیا۔ "تین خود پسند بلونگڑے" نامی یہ ناول بنیادی طور پر پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اِن میں "آئندہ کی بندرگاہ"، "شہد کی مکھی اور کیچوا"، "ہوا چلتی ہے"، "کوا اور ننھا ہرن" اور "تین خود پسند بلونگڑے" شامل ہیں۔ ناول کا تعارف کرواتے ہوئے فاضل مترجم لکھتے ہیں:-

"مشہور ادیب یان ون چنیگ کی اس کتاب "تین خود پسند بلونگڑے" کا شمار مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مرکزی کردار بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے شوق میں انوکھے تجربات سے گزرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اچھے مستقبل کی جستجو کرتے ہیں۔"[۶۲]

اس چینی ناول میں انتہائی خوب صورت انداز میں بچوں میں جہاں ایک جانب علم حاصل کرنے کی لگن پیدا کی گئی ہے وہیں سخت محنت کو اپنا شعار بنانے پر بھی بھرپور زور دیا گیا ہے۔ مرکزی کردار ایک بلی کا

ہے، جو اپنے تین بچوں کو محنت کی عظمت از بر کروانے کے لیے انہیں ایک آزمائش میں ڈالتی ہے، تاکہ انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ کوئی بھی چیز بغیر محنت کے حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ محنت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اور آفاقی سچائی ہے۔ اسی اصول کو چینی تہذیب کی طرح دنیا کی ہر تہذیب نہ صرف قبول کرتی ہے بل کہ اس کی بنیاد پر تہذیبیں پنپتی ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا، اور اس میں کام کرنا، ہمیشہ اہم مگر نازک معاملہ رہا ہے۔ کیونکہ اس کے لیے جہاں بچوں کی نفسیات، رجحانات، اور معاشرت و ماحول کا دقیق علم درکار ہے، وہیں ان تمام چیزوں کو بچوں کی سطح پر اتر کر بیان کرنے کا، اور سمجھانے کا فن بھی نہایت ضروری ہے۔

تہذیبوں کے درمیان مکالمے کو فروغ دینے میں ادبِ اطفال کے تراجم بہت مفید و معاون ہو سکتے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان اور چینی ادارے فونکس پبلشنگ اینڈ میڈیا گروپ، چائنا کے مابین ہونے والے معاہدے کے تحت اردو اور چینی زبان کی سو سو کتب کو دونوں زبانوں میں ترجمہ کیا جائے گا۔ اس منصوبے کے تحت "میں ہوا مولان ہوں" کے نام سے ایک مختصر ناول کو اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول بچوں کے لئے ہے، جس میں چینی تاریخ کی بہادر جنگجو خاتون "مولان" کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ ادبِ اطفال کی صنف میں ایسے تراجم یقینی طور پر پاکستانی بچوں کو چینی تاریخ سے واقف کروانے میں اہم ہیں۔ اس ضمن میں کی جانے والی کاوشوں کی مزید حوصلہ افزائی پاک چینی ثقافتی تعلقات کو مزید بہتر بنانے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک زمانے میں بچوں کے رسالوں سے بچوں کی ذہن سازی کا کام بخوبی انجام دیا جاتا رہا۔ ان رسالوں کے ذریعہ بچوں کی دینی، اخلاقی، ذہنی و علمی تربیت کا کام بھی خوب ہوا، لیکن اب ان رسالوں کا زور مستقل ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ادب اطفال معاشرے کی ایک ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کسی دیوار کی تعمیر کے لیے گارے یا پتھر اور اینٹ کی ہے۔ کسی خوبصورت اور بلند دیوار کا منصوبہ ان بنیادی عوامل کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ ٹھیک ایسے ہی کسی بہتر اور معیاری معاشرے کی تشکیل کا خواب ادب اطفال کی بنیاد پر اٹھائے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے، اور ادب اطفال بھی ایسا جس کی تخلیق صالح اور تعمیری فکر اور جذبے کے ساتھ کی گئی ہو۔

ز۔ ڈرامہ

ڈرامے کی صنف بھی کسی بھی زبان میں پائے جانے والے ادب کی ایک اہم صنف کے طور پر تصور کی جاتی ہے۔ چینی ادب میں بھی ڈرامہ نگاری کی ایک باقاعدہ روایت موجود ہے، جو دن بدن پھلتی پھولتی جا رہی ہے۔ چینی ادبی تراجم کی روایت میں جہاں دیگر اصناف کا اردو ترجمہ کیا گیا وہیں ڈراموں کے تراجم کی بھی ایک قابلِ قدر روایت موجود رہی ہے۔ گو کہ باقی اصناف کے مقابلے میں ان کی تعداد کم ہے تاہم جو تراجم موجود ہیں ان سے تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کی فضا قائم کرنے میں خاطر خواہ مدد میسر آ رہی ہے۔اس روایت کی داغ بیل ڈالنے کا اعزاز جمیل الدین عالی کو حاصل ہے۔ انہوں نے سب پہلے "شنگھائی کی عورتیں" نامی ڈرامے کو اردو میں روزنامہ "امن" کے مدیر افضل صدیقی کی مدد سے ۱۹۷۲ء میں مکمل کیا۔اس ضمن میں وہ یوں رقم طراز ہیں:-

> "خود میں نے روزنامہ "امن" کراچی کے مدیر برادرم افضل صدیقی کے ساتھ مل کر چینی معاشرے سے متعلق ایک بہت مشہور ڈرامے کا ترجمہ ۱۹۷۲ء میں کیا تھا۔ اس کا مصنف سوئیڈش ڈراما نگار تورے زیتر ہولم TORE ZETTER HOLM اور ڈرامے کا عنوان تھا "شنگھائی کی عورتیں"۔ طویل نہ تھا اور اسٹیج کی بعض اس وقت بالکل نئی کہی جانے والی ٹیکنیک استعمال کی گئی تھی۔ وہ اس وقت کے ایک جریدے اور اشاعت گھر "الفتح" کے زیرِ اہتمام چھپا۔"(۶۳)

جمیل الدین عالی صاحب کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی ڈراموں کے اردو میں تراجم کا سلسلہ نئی بات نہیں ہے۔لگ بھگ پچاس برس پہلے اس سلسلے کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم دیگر اصناف کے مقابلے میں ڈراموں کے تراجم میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو سکا۔ اس سلسلے کی اگلی باقاعدہ کاوش ۱۹۹۹ء میں اس وقت دیکھنے میں آئی جب چین میں غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر سے وابستہ احفاظ الرحمن نے "سورج نکل رہا ہے" کے عنوان سے ایک چینی ڈرامے کا ترجمہ کیا۔

اس ترجمے کو ۱۹۹۹ء میں انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، کراچی کے زیرِ انتظام شائع کیا گیا۔ چار ایکٹ پر مشتمل اس ڈرامے کے کرداروں میں پائی لو ایک ۲۳ سالہ خاتون ہے، فانگ تاشنگ ۲۵ سالہ نوجوان، جارجی

چانگ مغرب سے تعلیم یافتہ ۳۱ سالہ نوجوان، مسز کو، ایک دولت مند ۴۴ سالہ بیوہ، شی نامی طوائف اور چھٹکی نامی ایک ننھی لڑکی جسے تین دن قبل زبردستی کلب میں شامل کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے کا پلاٹ اسی لڑکی کو گندگی کی دلدل سے بچانے اور ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کی جدوجہد پر مشتمل ہے۔

بنیادی طور پر یہ ایک ایسا ڈرامہ ہے جس کے تراجم دنیا کے اہم اور بڑی زبانوں میں ہو چکے تھے۔ چار ایکٹ پر مشتمل یہ فن پارہ چینی ادب میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چینی قوم آزادی سے قبل جن مسائل اور مصائب سے دوچار تھی ان کی فنکارانہ پیش کش کرتے ہوئے بہت مہارت سے غلامی کے لعنت کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ چین کی آزادی کی تحریک بلاشبہ ایک عظیم تحریک تھی جس نے دنیا کی سب سے بڑی آبادی کو ان کے بنیادی حقوق دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی دور کے حالات میں ڈرامے کی ہیروئن "پائی لو" اور اس کی دوست "چھٹکی" کے درمیان دوستی کے جذبے کے تحت اخلاقی برائیوں کے خلاف ہونے والے جدوجہد اس ڈرامے کا بنیادی موضوع ہے۔ فاضل ترجمہ نگار احفاظ الرحمن بتاتے ہیں کہ:-

> "اس ڈرامے میں چینی عوام کے اُن آلام و مصائب کی عکاسی کی گئی ہے، جن سے وہ آزادی سے قبل دوچار تھے۔ یہ وہ دور تھا، جب افلاس اور ناداری نے پورے چین کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، اور اس وسیع و عریض ملک کا گوشہ گوشہ فاقہ کشی اور بے بسی کی لرزہ خیز داستانیں سنا رہا تھا۔"(۶۴)

ترجمے کی ابتدا میں دیئے گئے پیش لفظ سے ڈراما نگار کے بارے میں فاضل مترجم نے بہت مفید معلومات فراہم کیں ہیں۔ اس چینی ڈرامے کے مصنف چھاؤیونی کو نہ صرف چین میں بلکہ دنیا میں بھی ایک محترم اور ممتاز ادیب کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اُن کا اصل نام وان چیاپاؤ تھا۔ ان کی پیدائش چین میں ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انہوں نے ڈراموں کے اندر دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ بسا اوقات وہ ایک اداکار کی حیثیت سے بھی اداکاری کے جوہر دکھانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ بعد ازاں فلم سازی اور درس و تدریس کو اپنا پیشہ بنا کر ادب کی خدمت کرنے میں سرگرداں رہے۔ اُن کے اہم ڈراموں میں "ویرانیاں" ۱۹۳۶ء، "کایا پلٹ" اور "پیکنگ مین" ۱۹۴۰ء، "خاندان" ۱۹۴۱ء، "تابانِ فلک" ۱۹۵۴ء، اور آخری ڈرامہ "وانگ چیاچیون" ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا۔ ان ڈراموں اور ان کی دیگر ادبی خدمات کے طور

پر آج بھی چینی ادب میں انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے تخلیق کیے گئے ادب میں انسانیت کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یوں وہ تہذیبوں کے درمیان مکالمے کے پہلو سے ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"سورج نکل رہا ہے" دراصل ایک ایسا ڈرامہ ہے جس میں چین کے اس دور کو پیش کیا گیا ہے جس میں دقیانوسی اور سامراج کا آلہ کار طبقہ چین پر قابض تھا، جو اپنے مفادات کے حصول کے لیے عوام کا استحصال دونو ں ہاتھوں سے کر رہا تھا۔ دنیا کی ہر تہذیب میں جو مشترکہ اخلاقی اقدار ہیں ان میں طہارت اور عفت کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ ہر انسان کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ خود بھی صاف ستھرا رہے اور اپنے گردوپیش کو بھی پاک صاف رکھے۔ تاہم غلط ماحول اور سیاسی جبر کے نتیجے میں انسان برائی کی جانب قائل ہو جاتے ہیں۔

چھاؤیونی نے اس ڈرامے میں اپنے دور کے سماجی مسائل کو بڑے بے لاگ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ ہر ریاست کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے بلا تفریق بنیادی ضروریات اور سہولیات کا اہتمام کرئے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں عوام اپنی ضروریات کی تکمیل غلط انداز سے پوری کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ چینی انقلاب سے قبل کا معاشرہ جہاں معاشی تنگی کا شکار تھا وہیں وہ اخلاقی حدود و قیود کے اعتبار سے بھی بے پناہ مسائل کا سامنا کر رہا تھا۔ ایسے ماحول کی منظر کشی کرتے ہوئے تہذیب کے خلاف ہونے والے کام پورے معاشرے کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے مترادف ہے۔

چھاؤیونی کے اس ڈرامے میں جہاں اخلاقی اقدار کی بحالی پر زور دیا گیا ہے وہیں اس حقیقت کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ معاشرے میں تہذیبی مظاہر کبھی بھی ختم نہیں ہو جاتے۔ برے ماحول میں بھی چند سلیم الفطرت انسان موجود رہتے ہیں جو ماحول کے برے اثرات سے نہ صرف خود کو بچاتے ہیں بلکہ دیگر لوگوں کے لیے بھی اس عمل کو اختیار کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ پائی لو اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ ایک غیر اخلاقی معاشی سرگرمی میں مصروف ہے اور اسے اپنے شوہر کو بھی اپنی کمائی میں سے حصہ دینا ہے۔ اس کا شوہر کسی بھی کام کو کرنے کے بجائے اپنی بیوی کو غیر اخلاقی کام پر مجبور کر کے اپنی آنے والی نسلوں کو بھی حرام کی لت میں مبتلا کر کے نقصان پہنچا رہا ہے۔ تاہم وہ خود اپنے سامنے ایک مجبور لڑکی کو اس گناہ کی دلدل میں اتر کر ناکام ہوتا ہوا دیکھنے کی تاب نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس مجبور

"چھٹکی" کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔ اس عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب میں دلیری اور مہمان نوازی کی اعلیٰ انسانی قدر مشترکہ میراث ہے۔ اس بنیاد پر دنیا کی تمام تہذیبیں آپس میں مکالمے اور ہم آہنگی کے لیے روابط استوار کر سکتی ہیں۔

دیگر اصناف کے مقابلے میں چینی ڈراموں کے تراجم کی تعداد محدود ہے۔ ناول، افسانہ، اور شعری متون کے تراجم کی ایک معقول تعداد اردو زبان میں منتقل ہو چکی ہے۔ لیکن ڈراموں کے بارے میں اس سلسلے کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ گو کہ چند ٹی وی ڈراموں کو ڈب کر کے اردو میں منتقل کیا گیا ہے لیکن ان کا تحریری وجود موجود نہیں ہے۔

ہ۔ سائنس فکشن

سائنس فکشن کو اردو ادب میں اس درجے میں مقبولیت اور پذیرائی میسر نہیں جو دیگر اصنافِ ادب کو حاصل ہے، تاہم مغرب میں سائنس فکشن کی مقبولیت کا عالم مبالغہ آرائی کی حد تک بہت زیادہ ہے۔ اردو ادب میں قصوں اور کہانیوں کی صورت میں ایک ایسا ادبی ذخیرہ موجود ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر کی فراوانی ہوتی ہے لیکن اس ادبی ذخیرے کو سائنس فکشن کی اصطلاح کی ذیل میں داخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر سائنس فکشن کا اطلاق اس ادب پر ہو گا جس میں نت نئی سائنسی تصورات پر مبنی ایجادات کو بنیاد بنا کر ادب تخلیق کیا گیا ہو۔ سائنس فکشن میں ان تصورات کو حقیقت کا روپ دے کر پیش کیا جاتا ہے جن پر جدید سائنس ابھی غور و فکر کے مراحل سے گزر رہی ہوتی ہے۔ تاہم ایسے تصورات میں سے بیشتر کچھ وقت گزر جانے کے بعد آفاقی سچائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

معروف امریکی سائنس فکشن نگار Forrest Ackerman نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس میں سائنس فکشن کے لیے Sci-Fi کی اصطلاح استعمال کی۔ یہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں زمانۂ مستقبل میں ہونے والی سائنسی ترقیوں اور انسانی زندگیوں پر ان کے ممکنہ اثرات کا تذکرہ ہو۔ اس ادب کے نمایاں موضوعات میں نت نئی سائنسی ایجادات، ماحولیاتی تغیرات، خلائی سفر اور زمین کے علاوہ دیگر سیاروں کی مخلوقات کا ذکر شامل ہے۔ چینی ادب میں سائنس فکشن کے لیے "کھائے شوئے ہُوان شیانگ" "Kexue Huanxiang" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین سیال کے مطابق چینی سائنس فکشن کی

تاریخ چنگ خاندان کے آخری دور سے شروع ہوتی ہے۔اس دور میں سیاسی و معاشی بحرانوں کے باعث تخلیق کاروں نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر ادبی محاذ پر عوامی رہنمائی کا فریضہ سر انجام دینے کا فیصلہ کیا تو اس پس منظر میں سائنسی تخلیقات کا ظہور ہونا شروع ہو گیا جو رفتہ رفتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو تا گیا۔ چینی سائنس فکشن کے ابتدائی نقوش کے بارے میں خورشید اقبال لکھتے ہیں:-

> "چین میں پہلا سائنسی ناول Huang Jiang Diao Sou نے ۱۹۰۴ء میں Yueqiu Zhimindi Xiaoshuo (قمری کالونی) کے نام سے تصنیف کیا۔اس ناول میں Long Meghua نامی شخص چاند پر پہنچ کر وہاں ایک کالونی بساتا ہے جہاں کا معاشرہ ظلم، بربریت اور ناانصافی سے پاک ہوتا ہے۔"(۶۵)

چینی ادب کی دیگر اصناف کی مانند سائنس فکشن بھی پاکستانی اور چینی تہذیبوں کے مابین مکالمے کی فضا کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ چینی سماج کے تاریخی ارتقاء پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اُس سماج میں بھی جاگیرداریت کے باعث رجعت پسندی کا غلبہ تھا۔ زرعی سرگرمیوں کو روائتی انداز میں آگے بڑھانے کے باعث پیداوار میں اضافے کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایسے میں ادب پر بھی اسی دیہی ثقافت کے گہری چھاپ تھی۔لوک ادب کی مقبولیت کے باعث دیگر اصناف کو اپنی جگہ بنانے میں کافی تگ و دو کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے میں سائنس فکشن کے تخلیق کاروں کو کئی گنا زیادہ محنت و لگن سے ادب تخلیق کرنے کی ضرورت تھی۔ چین میں آزادی کے بعد جدت کا سفر بہت تیز رفتاری سے طے ہونے لگا۔ ہر آنے والی دہائی میں نت نئی ایجادات اور سائنسی طرزِ عمل اختیار کرنے کے باعث عوامی حلقوں میں سائنس کی جانب مثبت رجحان پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس سماجی تبدیلی کو سائنس فکشن نگاروں نے اس ادب کے فروغ کے لیے خوب استعمال کیا اور چینی عوام میں سائنس فکشن کی روایت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

ایک زمانے میں جب ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۶ء کے دوران عوامی جمہوریہ چین میں ثقافتی انقلاب (Cultural Revolution) کا دور جاری تھا، ریاستی پالیسی کے تحت سائنس فکشن کی اشاعت پر قدغن عائد کر دی گئی تھی۔ ۱۹۸۳ء میں بھی سائنس فکشن کو "روحانی آلودگی" قرار دیتے ہوئے پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس

کے بعد سائنس فکشن خوب پھلنے پھولنے لگا۔ اردو زبان میں چینی سائنس فکشن کے تراجم کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ اب تک صرف ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کو اردو سائنس بورڈ کی تحریک پر ڈاکٹر عابد حسین سیال نے مکمل کیا۔ جس میں سائنس فکشن کی تین کہانیوں کو اردو میں منتقل کر کے چینی سائنس فکشن سے متعارف کروانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس ترجمے کی خاص بات فاضل مترجم کے قلم سے چین میں اس ادب کی صورت حال پر ایک مفصل مضمون بھی ہے۔ جس میں باریک بینی سے چینی سائنس فکشن کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

زیرِ نظر چینی سائنس فکشن کے ترجمے میں ایک ناولٹ اور دو افسانے شامل ہیں۔ یہ تراجم براہ راست چینی زبان کے بجائے اس کے انگریزی تراجم کو پیشِ نظر رکھ کر کیے گئے ہیں۔ "تہہ ہوتا بیجنگ" کے عنوان سے شامل ناولٹ میں فنِ تعمیر میں استعمال ہونے والی جدید ٹیکنالوجی کو زیرِ بحث لا کر اس جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ جس انداز سے سائنس دن بدن ترقی کر رہی ہے، ایسا ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں انسانوں کا طاقت ور طبقہ زیرِ دست انسانوں کو جدید ذرائع سے اپنا دستِ نگر بنائے گا۔ لاؤ تاؤ کا کردار اس ناولٹ میں مرکزی کردار ادا کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

چینی سائنس فکشن کے اس فن پارے میں زمین پر تین طبقات کا ذکر کیا گیا ہے، جو در حقیقت معاشی طور پر موجود تین طبقات کی نشاندہی کرتا ہے۔ امراء کا طبقہ، متوسط طبقہ اور زیر دست طبقہ کسی بھی معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔ متوسط طبقہ دراصل باقی دو طبقات کے درمیان ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ اگر کسی سماج سے متوسط طبقہ ختم ہو جائے تو باقی دو طبقات میں ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بیجنگ شہر میں ہونے والی ہوش ربا ترقی کے پیچھے انسانی محنت اور مشینوں کے استحصال سے پردہ اٹھاتے اس ناولٹ میں جدید تعمیراتی ٹیکنالوجی کے ان مظاہر کو پیش کیا گیا جن میں سے چند ایک تو زمانے نے دیکھ لیے ہیں جب کہ مزید مظاہر کو جلد ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً" ہوٹلوں میں انسانوں کے بجائے مشینوں یا روبوٹس کی مدد سے میزبانی کے فریضے کو ادا کیا جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح امراء کے طبقے کو اپنے کاموں کے لیے کمزور طبقے کے افراد میں سے بھی باصلاحیت افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ترجمے میں اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ محروم المعیشت افراد اپنی غربت کو مٹانے کے لیے جائز و ناجائز ذرائع سے بالائی طبقے میں شامل ہونے کے لیے بے

قرار رہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی جان کو ہر قسم کے خطرات میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لاؤ تاؤ کو جب اس کا دوست دوسرے طبق میں جانے کا راستہ بتاتا ہے تو وہ ان الفاظ میں گفت گو کرتا ہے:-

"سب سے پہلے میرے والی رہائشی عمارت سے جاتے ہوئے اخراجی پائپ کی مدد سے نیچے اترو۔ اس پر میں نے پاؤں رکھنے کے لیے اُن دنوں خفیہ پائیدان بنائے تھے۔ اگر تم بالکل دیوار سے چپک کر اترو گے تو کیمرے تمھیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ جیسے ہی تمھارے قدم زمیں سے لگیں، عمارت کے سائے کے ساتھ آگے چلتے جانا حتیٰ کے تم کنارے تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں تم دیوار کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی دیوار کو نہ صرف محسوس کر سکو گے بلکہ دیکھ بھی سکو گے۔"(٦٦)

"تہہ ہوتا بیجنگ" بنیادی طور پر چینی فکشن نگار ہاؤ جنگ فانگ (Hao Jingfang) کی تخلیق ہے جس کو ٢٠١٦ء میں چین کا بہترین ناولٹ قرار دیتے ہوئے "ہوگو ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا تھا۔ چینی معاشرے میں طبقاتی تقسیم کے خلاف پیدا ہونے والی سوچ کو اس فن پارے میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے کہ سماجی ترقی کا خواب اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک معاشرے کے کمزور طبقات کو بھی ترقی کے ثمرات سے مستفید نہ کیا جائے۔ یوں اس ترجمے کے ذریعے ہر تہذیب کا پروردہ شخص اپنے ارد گرد ہونے والے ظلم کو قبول کرنے سے انکار کا جذبہ حاصل کرتا ہے۔

زیرِ نظر چینی سائنس فکشن کے تراجم میں سے اگلے ترجمے کا عنوان "دائرہ" ہے۔ یہ سائنسی ادبی تحریر علم ریاضی کی بنیادی مہارتوں کو استعمال کرتے ہوئے اس حقیقت کی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ اگر حکمران طبقہ اپنی عیش و عشرت کو طول دینے کے لیے عوامی خدمت کے جذبے کو فراموش کر دے گا تو اس صورت میں تباہی و بربادی اُس کا مقدر قرار پائے گی۔ قدیم بادشاہی دور کے ایک بادشاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ ایک جابر اور ظالم بادشاہ اپنی سلطنت کو ایسے شعبدہ بازوں کی باتوں میں آکر گنوا دیتا ہے جو صرف اور صرف اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔

"دائرہ" سائنس فکشن کا ایک ایسا شاہکار ہے جو ابتدا ہی میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سائنسی علوم کے ایک خاص امتزاج نے اس کے اندر دلچسپی کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ ایک ہی نشست میں اسے پڑھنا دوبھر نہیں ہوتا۔ ۲۲۷ قبل مسیح میں ریاست چِن کے دارالحکومت شی آن یانگ میں اس وقت شاہی محل میں عجیب کشمش کا عالم تھا جب پڑوسی حریف ریاست کا ایک ماہر جنگجو چِنگ کھا، شہنشاہ کے سامنے اسے قتل کرنے کے منصوبے کا راز فاش کرتا ہے۔ تاہم وہ اپنی چرب زبانی اور شہنشاہ کے دائمی زندگی کے خواب کے باعث اپنی جان بچانے میں نہ صرف کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ سلطنت کی پوری فوج کو بھی اپنی گرفت میں لے کر تباہی و بربادی کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کا یہ ایک مسلمہ اور ناقابلِ تسخیر اصول ہے کہ جو قوم روحِ عصر کے تقاضوں سے غافل ہو کر کھیل تماشوں میں اپنا قومی سرمایہ ضائع کر دیتی ہے، انہیں جلد ہی عبرت کا نشان بنتے ہوئے تاریخ کا حصہ بن جانے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

زیرِ نظر چینی سائنس فکشن میں آخری تحریر "چوہے کا سال" کے عنوان سے ہے۔ چینی تہذیب میں جن جانوروں کو خاص اہمیت حاصل ہے ان میں چوہا بھی شامل ہے۔ چینی تقوم میں چوہے کے ہر بارہ سال کے بعد مکمل ہونے والے سلسلے میں پہلے سال کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ بارہ سالوں پر محیط یہ سلسلہ ہر سال کے لیے کسی نہ کسی جانور کے نام کے ساتھ منسلک ہے۔ اس بارے میں "چینی ثقافت کے تابندہ نقوش" کے مصنف لکھتے ہیں:-

> "چُو عہدِ حکومت میں چینی کیلنڈر کو بارہ برسوں کے وقفوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر برس کو ایک جانور سے منسلک کر کے اس کی خصوصیات اس سال میں شامل کر دی گئیں۔ بارہ برسوں کا محور مغربی منطقہ البروج (Zodiac) سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ جانور بالترتیب چاہا، بیل، شیر، خرگوش، ڈریگن، گھوڑا، بکری، بندر، مرغ، کتا اور سور ہیں۔"(۶۷)

چھن چیوفان نے اپنی اِس تحریر میں جدید ٹیکنالوجی کے منفی استعمال پر کاری ضرب لگائی ہے اور اس جانب متوجہ کیا ہے کہ جینیاتی انجینئرنگ کے غیر انسانی استعمال نے انسانیت کو ایک بڑے چیلنج سے دوچار کر دیا ہے۔ سامراجی طاقتیں سائنسی علوم میں سبقت لے جانے کے باعث انسانیت کو نت نئی مصیبتوں میں ڈال کر

دنیا کو جہنم کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ انسانوں پر اپنے ظالمانہ تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے جینیاتی انجینئرنگ کے غلط استعمال نے چوہوں کو بھی انسانوں کے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔ دراصل مقتدر عالمی طاقتیں اپنے غلبے کے نظام کو بچانے اور اسے طول دینے کے لیے ہر حربے کو بروئے کار لانے سے کسی بھی طور گریز کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس کے مقابلے پر کوئی بھی فرد اپنے بے پناہ اخلاص کے باوجود کامیابی سے ہم کنار ہونے سے قاصر ہے۔ دنیا میں اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کے تحت سیاسی وسماجی تشکیل نے غیر سرمایہ داری سوچ کو دبانے کے لیے ایسے ایسے اقدامات کیے ہیں جن کے تصور سے بھی عام آدمی کوسوں دور ہے۔ "چوہے کا سال" بنیادی طور پر کمزور انسانوں کے طاقت ور انسانوں کے ساتھ بر سرِ پیکار ہونے کی ایک شکل ہے۔ یوں چینی تہذیب میں ظلم کے خلاف مزاحمت پیدا کرنے کے انسانی وصف کی نقاب کشائی کر کے ہر تہذیب کے مظلوم انسانوں کو دعوتِ فکر دی گئی ہے۔ سماجی ہم آہنگی کا حسین خواب اسی صورت اپنی تعبیر کو پہنچ سکتا ہے جب تہذیبیں ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہوئے استفادہ کریں۔ انسانوں کو پُرامن بقائے باہمی میں زندگی گزارنے کا موقع اسی صورت میسر آسکتا ہے جب مختلف زبانوں کے ادبی فن پاروں کو ترجمے کے ذریعے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔

حوالہ جات

۱-عابد حسین،ڈاکٹر، چینی ادب کے اردو تراجم: تہذیبی مکالمے کی ایک صورت،(ریسرچ آرٹیکل)امتزاج ۱۸، ص ۵۰

۲- آفتاب اقبال شمیم،(دیباچہ)، چین کا ادب (قدیم و جدید فکشن سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۷

۳- نثار احمد ترابی،ڈاکٹر،(فلیپ) تین سلطنتوں کی داستان، مترجمہ ظہور احمد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء،

۴- تھانگ منگ شنگ، پروفیسر،(پیش لفظ)، تین سلطنتوں کی داستان، مترجمہ ظہور احمد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۱۵

۵- انتخاب عالم، پروفیسر، چانگ شی شوان،(تبصرہ)، تین سلطنتوں کی داستان، مترجمہ ظہور احمد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۱۷

۶- ظہور احمد،ڈاکٹر، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۶۳

۷- عابد حسین،ڈاکٹر، عظیم تاریخی ناول "تین سلطنتیں"، مشمولہ چین کا ادب (قدیم و جدید فکشن سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۸

۸- ظہور احمد،ڈاکٹر، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۱۷

۹- ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۳

۱۰- سن ذی، فنِ حرب و ضرب،(مترجم) صفدر علی شاہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء ص ۲۰

۱۱- ظہور احمد،ڈاکٹر، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۱۸۳

۱۲- ظہور احمد،ڈاکٹر، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۲۳

۱۳- ظہور احمد،ڈاکٹر، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۴۳۰

۱۴- ظہور احمد،ڈاکٹر، تین سلطنتوں کی داستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۲۶۳

۱۵- مختار صدیقی (مترجم) جینے کی اہمیت از لین یو تانگ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۸۲

۱۶- جمیل الدین عالی (ابتدائیہ)، چینی لوک کہانیاں، مترجمہ شفیع عقیل، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۷

۱۷- شفیع عقیل، (مترجم) چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰

۱۸- شفیع عقیل، دیباچہ، چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۱۹- مختار صدیقی (مترجم) جینے کی اہمیت از لین یو تانگ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۰۶

۲۰- شفیع عقیل، (مترجم) چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲

۲۱- رشید بٹ، (مترجم)، سورج کی تلاش، منتخب چینی لوک کہانیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۰۹

۲۲- شفیع عقیل، (مترجم) چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۴۹

۲۳- ایضاً" ص ۵۴

۲۴- ایضاً" ص ۵۷

۲۵- ایضاً"، ص ۶۱

۲۶- محمد امین، ڈاکٹر، کنفیوشس اور چین کی ثقافت، بکس اینڈ ریڈرز، ملتان، ۲۰۲۱ء، ص ۸۹

۲۷- شفیع عقیل، (مترجم) چینی لوک کہانیاں، ص ۷۵

۲۸- رشید بٹ، (مترجم)، مینڈک گھڑ سوار، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹

۲۹- محمد امین، ڈاکٹر، کنفیوشس اور چین کی ثقافت، ایک تعارف، بکس اینڈ ریڈرز، ملتان، ۲۰۲۱ء، ص ۸۸

۳۰- شفیع عقیل، (مترجم) چینی لوک کہانیاں، ص ۹۲

۳۱- عبد المنان / محمد حسیب، (مضمون) چینی ثقافت مشمولہ چین شناسی از عبد الواحد تونسوی، ڈاکٹر / چانگ وے، پروفیسر، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۷۸

۳۲- شفیع عقیل، چینی لوک کہانیاں، ص ۱۲۰

۳۳- رشید بٹ، مینڈک گھڑ سوار (بہترین چینی لوک کہانیاں)، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۱

۳۴- شفیع عقیل، چینی لوک کہانیاں، ص ۱۶۷

۳۵- عابد علی خان، مشاہیر چین، فیکٹ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۵۲

۳۶- ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۱

۳۷- شفیع عقیل، چینی لوک کہانیاں، ص ۱۷۲

۳۸-انتخاب عالم، گلبانگِ وفا، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۷

۳۹-خالد عباس الاسدی، ڈاکٹر، پاک چین دوستی، کاغذی پیراہن، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۷

۴۰- شفیع عقیل، (مترجم) چینی لوک کہانیاں، دیباچہ، ص ۱۲

۴۱-نصری فاطمہ، آج چاند روشن ہے (لوشون کی کہانیاں)، آئی شو پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء، ص ۶

۴۲-نصری فاطمہ، آج چاند روشن ہے (لوشون کی کہانیاں)، ص ۱۱

۴۳-خالد فتح محمد، پاگل آدمی کی ڈائری، (تعارف)، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۹

۴۴-نصری فاطمہ، آج چاند روشن ہے۔ ص ۱۴

۴۵-ایضا" ص ۱۵

۴۶-ایضا" ص ۵۷

۴۷-ایضا" ص ۷۰

۴۸-ایضا" ۳۱

۴۹-ایضا" ۱۴۸

۵۰-ارشد مسعود ہاشمی، لوہ سوں کے شاہکار افسانے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی، بھارت، ۱۹۸۹ء ص ۲۱

۵۱-منیر فیاض، معاصر چینی افسانے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۸

۵۲-منیر فیاض، معاصر چینی افسانے، ص ۹۲

۵۳-یاسر جواد، فاہیان کا سفر نامہِ ہند، (حرفِ آغاز)، تخلیقات پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۷

۵۴-خَہ مئے لَین، چین پاکستان ثقافتی تبادلوں کی تاریخ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص ۱۶۵

۵۵-ارشد مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، کلاسیکی چینی فکشن پر بدھ مت اور ہندوستانی دیومالا کے اثرات، سہ ماہی مژگاں، کولکتہ،، جلد ۶ شمارہ ۲۱-۲۲، ص ۶۵

۵۶-یاسر جواد ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند، (مترجم کا نوٹ)، تخلیقات پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۷

۵۷-حامد ہاشمی، شہنشاہ سے شہری تک، (جلد اول)، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر بیجنگ، ۱۹۸۰ء، ص ۵

۵۸-حامد ہاشمی، شہنشاہ سے شہری تک، (جلد اول)، ص ۱۱۰

۵۹-حامد ہاشمی، شہنشاہ سے شہری تک، (جلد دوم)، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر بیجنگ، ۱۹۸۰ء، ص ۷۴۴

۶۰-حامد ہاشمی، شہنشاہ سے شہری تک، (جلد دوم)، ص ۵۱۳
۶۱-ادبِ اطفال، تربیتِ اطفال اور اکیسویں صدی کے چیلنجز، ارم صبا، ڈاکٹر، یاسمین کوثر، ڈاکٹر، صنم شاکر، ڈاکٹر، مشمولہ خیابان، خزاں ۲۰۲۲ء، ص ۱۸
۶۲-احفاظ الرحمن، ایک کتاب میں تین کہانیاں، فرید پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷۰
۶۳- جمیل الدین عالی، (حرفِ چند)، سورج نکل رہا ہے، احفاظ الرحمن، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء،
۶۴-احفاظ الرحمن، (پیش لفظ)، سورج نکل رہا ہے، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ح
۶۵-خورشید اقبال، اردو میں سائنس فکشن کی روایت، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۹۳
۶۶-عابد حسین، ڈاکٹر، چین میں سائنس فکشن، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۶
۶۷-ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۴

باب چہارم:

چینی شعری تراجم میں تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی

چینی شاعری کی روایت چینی تہذیب کی مانند انتہائی قدیم ہے۔ چینی شعری ادب کے جو فن پارے اردوزبان میں منتقل ہوئے ہیں ان سے چینی شاعری کے عمومی مزاج، موضوعات اور نوعیت کے بارے میں بڑی حدتک آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ چینی کلاسیکی شاعری اپنے موضوعات کے اعتبار سے متنوع خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں جہاں ایک جانب سماج کی حقیقی انداز میں عکاسی دکھائی دیتی ہے، وہیں فرد کے داخلی احساسات کا اظہار بھی ہے۔ جنگ سے نفرت، امن سے بے پناہ محبت، حب الوطنی کا جذبہ اور طالع آزما طاقتوں کے خلاف سخت مزاحمت، مظاہرِ فطرت کی خوب صورتی، انسانی رشتوں مثلاً "ماں، باپ، بہن بھائی، میاں بیوی اور دوستی کے تعلق سمیت سیاسی سماجی مسائل کو چینی شعراء نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کرنے کی سعی کی ہے۔ چین کی تاریخ میں پُرامن ادوار کے دوران تہذیبی ترقی اپنی بلند ترین سطح پر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ضروریات کی کئی ایک بنیادی چیزوں کی ایجاد یا دریافت سرزمینِ چین کی دین ہے۔ ایسے حالات کی ادبی تخلیقات زمانہ جنگ کے ادب سے یکسر مختلف ہیں۔ اس اعتبار سے چینی ادبی تاریخ کو چین کی ہی تاریخ کے طور پر دیکھنا اور سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یوں دیگر اقوام کے ادبِ عالیہ کی مانند قدیم چینی شاعری اس مُلک کے گہرے اور وسیع سماجی مطالعے کی شاعری کے طور پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو زبان میں چینی شاعری کے تراجم پیش کرنے کی روایت کا آغاز، دستیاب مواد کی رو سے، معروف ادیب، مزاح نگار اور مترجم ابنِ انشاء سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں یحییٰ امجد، آزاد کوثری، آفتاب اقبال شمیم، ڈاکٹر عابد حسین سیال، یاسمین حمید، پروین طاہرہ، سعیدہ ارم، زاہد امروز، علی یاسر، محمد عاصم بٹ، ڈاکٹر محمد امین اور ڈاکٹر صفدر علی شاہ کے نام نمایاں ہیں

چینی ادب کے بارے میں یہ بات حد درجہ اہم ہے کہ چینی فلسفے کے ساتھ اس کی غیر معمولی ہم آہنگی ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے چینی حکیم کھنگ فو تسو (KIUNG FUTZU ۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م)، جنہیں

کنفیوشس کے نام سے جانا جاتا ہے، کی مرتب کردہ فلسفے کی پانچ بنیادی کتب میں ادبی چاشنی کا خوب صورت امتزاج ہے۔ کنفیوشس ازم کی تعلیمات اُن کی مرتب کردہ پانچ کتب سے اخذ کی جا سکتی ہیں، جن میں پہلی کتاب شوکنگ، دوسری شیہہ کنگ، تیسری لی چی، چوتھی بی کنگ، اور پانچویں چون چن کے نام سے موسوم ہے۔

دستیاب شدہ مواد کے مطابق چینی شاعری کا اولین نمونہ "دہقان کا گیت" نامی نظم ہے۔ یہ نظم قبل از تاریخ دور سے تعلق رکھتی ہے جب لوک ادب سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا تھا۔ چینی مورخین عمومی طور پر اپنی تاریخ کو شیا خاندان کی حکمرانی کے آغاز سے شروع کرتے ہیں۔ اس خاندان کے دورِ حکومت میں تہذیب و اخلاق کو خصوصی طور پر انسانی شرف کی معراج تصور کرتے ہوئے باصلاحیت اور نیک سیرت افراد کو امورِ مملکت میں شریک کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں "دہقان کا گیت" نظم کی تخلیق ہوئی۔ سات مصرعوں پر مشتمل یہ نظم اپنے اندر معنویت کا ایک مکمل جہاں سموئے ہوئے ہے۔ نظم "دہقان کا گیت" کے مصرعے کچھ یوں ہیں:-

دن نکلتا ہے تو ہم بھی نکلتے ہیں
اپنے اپنے کاموں کی طرف
شام ڈھلتی ہے تو سمٹ آتے ہیں
اپنی اپنی آرام گاہوں کی طرف
پانی پیتے ہیں کنویں کھود کر
کھاتے ہیں اپنا اُگا کر
کسی شہنشاہ کو ہم سے کیا لینا؟(۱)

اس بارے میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نظم کی تخلیق کسی ایک فرد کی کاوش تھی یا کہ مشترکہ تفکر کا نتیجہ، تاہم اس کے موضوع کے بارے میں آفتاب اقبال شمیم کا خیال ہے:-

"دہقان کا گیت" کے خالق اِس دور کے کسان تھے جو کنویں کھودتے اور زمین کاشت کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ خواب بھی دیکھتے تھے۔ "دہقان کا گیت" جسے چینی شاعری کی پہلی نظم کا درجہ دیا جاتا ہے اُسی خواب اور ادرش کا اظہار کرتا ہے۔ انفرادی

آزادی اس گیت کا مرکزی موضوع ہے اور اسی موضوع کو بعد میں آنے والی شاعری میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔"(۲)

دنیا کی کوئی بھی تہذیب آزادی اور تحفظ کے احساس کے بغیر پنپ نہیں سکتی۔ تہذیب کا پھیلاؤ اور ارتقاء اسی صورت ممکن ہے جب وہ کسی بھی طاقت کے غلبے سے آزاد ہو۔ مغلوب ہونے کی صورت میں تہذیب اپنے دائرے کے اندر ہی سمٹ کر نابود ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ چینی تہذیب کی بہرحال یہ خوبی رہی ہے کہ اس نے بیرونی تسلط سے خود کو ہر ممکن حد تک نامساعد حالات میں بھی محفوظ رکھا ہے۔ غالبا" یہی وجہ ہے کہ چینی تہذیب ہزاروں سال کے تسلسل کے باوجود آج تک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ محفوظ ہے۔ "دہقان کا گیت" نامی یہ نظم بذاتِ خود اس بات کا اعلان ہے کہ چینی قوم میں طالع آزمائی اور حقِ خود ارادیت کو سلب کرنے کی کوئی کوشش کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ چین میں زرعی معاشرت کی ایک قدیم تاریخ ہے۔ ملک کے بیشتر علاقوں میں کھیتی باڑی اور اس سے متعلقہ پیشے ہی آبادی کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد و معاون تھے۔ آبپاشی کے لیے یوں تو دریاؤں کے قریب ترین زمینوں کو تیار کیا جاتا تھا۔ تاہم اضافی ضروریات کے لیے کنوئیں کھود کر پانی حاصل کیا جاتا تھا۔ ایسے محنتی اور جفاکش کسانوں کا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی ظالم حاکم کے دستِ نگر ہونا کسی صورت ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کا یہ دعویٰ کہ جب وہ اپنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں تو پھر کوئی دوسرا حاکم کیسے ان پر اپنی مرضی مسلط کر سکتا ہے۔ چنانچہ آزادی اور حریت کا جذبہ ہمیں چینی شاعری کے اولین نمونوں سے ہی میسر آجاتا ہے۔

کنفیوشس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چینی شاعری کی اولین کتاب "شیہہ کنگ" (SHIH CHING کتابِ نغمہ) کو مرتب کیا، جسے "شیہہ چِنگ" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح تک کے چینی لوک ادب کی نظموں کو پہلی بار کنفیوشس ہی نے مرتب کر کے تحریری طور محفوظ کیا۔ درحقیقت ان نظموں کی تعداد تین ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے، تاہم کنفیوشس نے چھان پھٹک کے بعد اپنے مجموعے میں تقریبا" تین سو پانچ نظموں کو منتقل کیا۔ ان نظموں میں چھٹی صدی قبل مسیح تک کے مختلف شاہی ادوار کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ "شیہہ چِنگ" کے معنی "گیتوں کی کتاب" کے طور پر بیان کیے جاتے ہیں۔ یہی کتاب چینی شاعری کے مزاج اور نوعیت کے سمجھنے کے لیے بنیادی ماخذ تصور

کی جاتی ہے۔ چینی ادبی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:-

> "چوؤ سلطنت کے دوران بعض بہترین ادبی تصانیف بھی منظر عام پر آئیں جو آج بھی کلاسیکی چینی ادب کے بیش قیمت سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب شیہہ چِنگ (کتابِ نغمہ) ہے جو پانچویں صدی ق م تک کے مقبول عام گیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتب چینی ثقافت کی تفہیم کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس میں دورِ قدیم کے باشندوں کی بود وباش، خانگی حالات، خاندانی نظام، آپسی تعلقات، عشق، جنگ، موسم، شجر و حجر، چرند پرند، ملبوسات، گہنوں، رہائش، زراعت، معاشرتی رسوم سے متعلق گیت شامل ہیں۔ روایت ہے کہ اسے کنفیوشس نے مرتب کیا۔"(۳)

چینی شاعری کی اس اولین کتاب کا مقدمہ کنفیوشس نے لکھا، جسے بجا طور پر چینی تنقید نگاری کا نقشِ اول قرار دیا جاسکتا ہے۔ اِس مقدمے کی ابتداء میں مذکور ہے "شاعری عمیق تفکر کا حاصل ہے۔ لاشعور میں دبے افکار عمیق تر ہوتے جاتے ہیں۔ جب بیان کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں، شاعری ہو جاتے ہیں"(۴)۔ اس انتخاب میں شامل نظمیں چار حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ کوؤ پھنگ (KUO PENG) ہے جس کے تحت پندرہ ابواب اور ۱۶۰ نظمیں شامل ہیں۔ دوسرے حصے شیاؤ یا (XIAO YA) کے آٹھ ابواب میں اسی نظمیں ہیں۔ تیسرے حصے "تایا" (DA YA) کے تین ابواب میں تیس نظمیں اور چوتھے حصے "سنگ" (SUNG) کے کُل پانچ ابواب میں اکتالیس نظمیں ہیں۔ تمام نظمیں دو سے سات بندوں پر مشتمل ہیں اور ہر بند دو سے تیرہ الفاظ پر مشتمل سطور کا ہے۔ ان میں زیادہ تر چہار سطری بند ہیں اور اس قسم کا ہر بند ایک مکمل خیال رکھتا ہے، ایک مکمل نظم ہے۔ زیادہ تر نظموں کی سطور کی طوالت یکساں ہے اور چار مصرعوں کے بند کی فراوانی ہے۔ چند مصرعے فقط ایک لفظ کے ہیں۔ ہر صورت میں وزن، بحر اور قافیہ پر خاطر خواہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ کئی نظموں میں دو سے پندرہ چہار سطری بند بھی موجود ہیں۔ تین چہار سطری بند کے بعد دو ہم قافیہ سطور کی ترکیب بھی اچھی تعداد میں ملتی ہے۔ دو سے پنچ سطری بند زیادہ تر صورتوں میں چہار

سطری بند کے اولین یا آخری حصے کی تکمیل کرتے ہیں۔ چہار سطری بند اکثر و بیشتر دو سے گیارہ الفاظ کے ہیں۔ چار، پانچ اور سات الفاظ کی سطور زیادہ ہیں۔

چینی شاعری کے بارے میں دلچسپ امر یہ ہے کہ اس میں موضوعات کی نوعیت اردو شاعری سے یکسر مختلف ہے۔ اردو ادب میں مابعد الطبعیاتی عناصر کو ادبی تخلیقات میں ذوق و شوق سے مذکور کیا جاتا ہے، جب کہ چینی شاعری ایسے موضوعات کا چلن عام نہیں ہے۔ چینی شاعری کی تفہیم کے لیے چینی فلسفے کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ قدیم چینی باشندوں کا زندگی کے بارے میں جو نقطۂ نظر قائم تھا، قریب قریب اسی کی ترجمانی یا عکاسی بھی چینی شاعری کے نمونوں میں دکھائی دیتی ہے۔ قومی تاریخ کی اہم اور نمایاں شخصیات کو چینی شاعری میں بڑی چاہت کے ساتھ بیان کئے جانے کی روایت بھی موجود ہے۔ بسا اوقات ایسی شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے، جن کی حیثیت دیومالا کے طور پر موجود ہوتی ہے۔

چینی شعری متون کی سب سے نمایاں ترین خصوصیت اختصار ہے۔ اب تک چینی شاعری کے جو تراجم اردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں، ان میں سے ایک آدھ استثنا کے علاوہ دیگر تراجم میں اختصار کی خصوصیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ چینی شاعری کی اولین نظم سمجھی جانے والی نظم "دہقان کا گیت" اپنے تمام تر تنوع کے باوجود محض سات مصرعوں پر مشتمل ہے۔ دیگر شعری متون میں بھی اسی روش کی تقلید جابجا دکھائی دیتی ہے۔ چینی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فطری مناظر کی دل کشی سے حظ اٹھانے پر بہت توجہ کی گئی ہے۔ قدرتی مناظر اور اس میں موجود حُسن و رعنائی کا بیان چینی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ مظاہرِ فطرت میں زمین، آسمان، دریا، جنگل، پہاڑ، بارش، حیوانات، نباتات اور موسموں کی کیفیات کو فن کارانہ مہارت سے چینی شاعری میں مذکور کیا گیا ہے۔ زرعی سماج کا پس منظر رکھنے کے باعث چینی شاعری کے کلاسیکی نمونوں میں دیہی معاشرت اور کھیتی باڑی سے متعلقہ سرگرمیوں کو بھی مختلف چینی شاعروں نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ بدعنوانی، معاشی جبر اور امراء کی تن آسانی کو بھی کمال خوب صورتی سے تنقید کا نشانہ بنانے کے شواہد بھی چینی شعری روایت کے نمایاں اوصاف ہیں۔ سماجی برائیوں اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کے بارے میں نفرت کا رویہ مشترکہ انسانی میراث ہونے کے باعث چینی متون میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ تاہم چینی شاعری کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں اردو شاعری کی مانند غیر

مادی امور اور مباحث کا کہیں کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا۔ اردو شاعری میں فلسفیانہ مباحث کو شاعری کے نمایاں ترین وصف کے طور پر دیکھا جاتا ہے، لیکن چینی شاعر ان امور سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین سیال اسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:-

"تہذیبی مظہر کے طور پر دیکھا جائے تو چین کی شاعری اپنے مجموعی مزاج میں ہماری شعری روایت سے یکسر مختلف ہے۔ اِس میں اُس نوع کے مابعد الطبعیاتی عناصر مفقود ہیں جو ہماری مرکزی شعری روایت کا جزوِ اعظم ہیں۔ چینی شاعری کا بیشتر حصہ قلبی واردات کے بجائے لمحاتی سرشاری کی کیفیت کا غماز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی نظمیں مختصر اور تجرید تک پہنچی ہوئی تمثال کاری کا شاہکار ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بیان شخصی تجربے کا ہے جو زندگی کے معمولات سے کوئی منفرد حِسی کیفیت کشید کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔۔۔ اس شاعری میں تاریخی شخصیات اور واقعات کے حوالے فراوانی سے پائے جاتے ہیں جو استعاروں اور علامتوں کا ایسا ہالہ پیدا کرتے ہیں جس کی تفہیم تاریخ اور ثقافت کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔"[۵]

درج بالا اقتباس سے چینی شاعری کے مجموعی مزاج کے بارے میں بنیادی سطح کی آگاہی میسر آنے کے ساتھ ساتھ اس میں مذکور موضوعات کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔ اردو زبان میں یوں تو چینی شعری متون کو منتقل کرنے کی روایت کا آغاز باوجوہ تاخیر کا شکار رہا۔ ان وجوہات میں سے پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں زبانوں میں باہمی تفاعل کی عدم موجودگی ہے۔ دوسرا جس زمانے میں اردو تراجم کا آغاز ہوا، اُس وقت برصغیر پاک وہند میں انگریزی راج بتدریج پھیلتا جارہا تھا۔ اسی پس منظر میں دنیا کی قیادت کرنے والی قوم کے ادبی ذخیرے کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے رجحان میں غیر معمولی توجہ مبذول ہوئی۔

تاریخی طور پر شاہراہِ ریشم کے ذریعے ہندوستان اور چین کے مابین تجارتی تعلقات کا ایک وسیع سلسلہ قائم رہا، جس کے تحت دونوں خطوں کی معاشرت، ثقافت اور زبان پر اثرات مرتب ہونا لازمی امر ہے۔ مذہبی تعلیمات کا ایک مکمل نظام برعظیم پاک وہند سے بدھ مت کی صورت میں چین پر صدیوں تک اثرانداز رہا ہے۔ یقینی طور پر یہ تعلیمات یہاں کی مقامی زبانوں میں ہی محفوظ تھیں، جنہیں چینی سماج میں منتقل کرنے کے لیے ترجمہ کیا گیا۔ اس حقیقت کے دستاویزی ثبوت بدھ مت کے دو بھکشوؤں ہیون سانگ اور فاہیان کے سفر

ناموں سے بھی میسر آتے ہیں۔ اس قدر مضبوط بنیادوں کے باوجود چینی شاعری کو اردو زبان یا برعظیم پاک و ہند کی کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی باقاعدہ شعوری کوششوں کا آغاز تاخیر کا شکار رہا۔ چینی شاعری کا باقاعدہ طور پر پہلا مکمل ترجمہ اردو زبان کے معروف ادیب اور شاعر ابنِ انشاء نے کیا۔ ابنِ انشاء کا پہلا ترجمہ "چینی نظمیں" کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ذیل میں چینی شاعری کے تراجم کو فرداً فرداً زیرِ بحث لا کر ان کی نوعیت کو سمجھنے کی کاوش کی جا رہی ہے۔

ا۔ چینی نظمیں از ابنِ انشاء

اردو زبان کے معروف مزاح نگار ادیب ابن انشاء کی ادبی خدمات میں سفر نامہ نگاری کے علاوہ ترجمہ کاری بھی شامل ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۹ء میں چینی ادب کی نمائندہ نظموں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا، تاہم یہ نظمیں نامساعد حالات کے باعث زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے سے محروم رہیں۔ آخر کار ۱۹۶۰ء میں لاہور اکیڈمی، لاہور سے اس ترجمے کو شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں کئی ایک خصائص ہیں، جن میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق چینی شاعری کا پہلا باقاعدہ اُردو ترجمہ ہے۔ اِس انتخاب کے تین حصے ہیں، جس میں مجموعی طور پر پینسٹھ نظمیں شامل ہیں۔ پہلا حصہ قدیم نظموں پر مشتمل ہے جس میں چھبیس نظموں کے تراجم کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں چینی شاعر حان شان کی سترہ نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ آخری اور تیسرے حصے میں جدید چینی شاعری کو ترجمہ کیا گیا ہے، تاہم اس حصے کی نظمیں بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی تک کے منتخب چینی شعراء کے کلام پر مشتمل ہیں۔ اس حصے میں شامل نظموں کی تعداد بائیس ہے۔ یوں پینسٹھ نظموں پر مشتمل یہ کتاب چینی تہذیب اور ہند اسلامی تہذیب کے حاملین کے درمیان مکالمے کی اولین شعری کاوش قرار پاتی ہے۔ اس ترجمے کی خاص بات یہ ہے کہ مترجم کا اپنا شعری ذوق بہت بلند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتخاب کی کم و بیش تمام نظمیں طبع زاد ہونے کا تاثر برقرار رکھتی ہیں۔ "جگنو سے" کے عنوان سے پہلی نظم ہی اس بات کی تصدیق کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں تیرا یہ دیپ جلے
کبھی بجھ نہ سکے، جھکڑ جو چلے
تری جوت دبے نہیں۔۔۔۔۔ اور بڑھے

اے جگنو جا!
اور نیل گگن کو جا کے بنا کہیں اپنا وطن
اے جگنو جا!
اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارا بن (۶)

بادی النظر میں چینی شاعر لی پو (۶۲ء-۷۰۵ء) کی یہ نظم حشرات الارض میں سے ایک عام سے کیڑے کے بارے میں ہے لیکن درحقیقت اس میں زندگی کی تلخیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ایک ایسی نصیحت ہے جو چینی تہذیب میں رچی بسی ہے۔ اس تہذیب کے حاملین نے دن رات ایک کر کے اپنی قوم کا نام نہ صرف روشن کیا بلکہ اقوامِ عالم کو بھی عزت و سرفرازی حاصل کرنے کی ایسی راہ دکھائی جو آخر کار لی پو کے الفاظ میں "اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارہ بن" کے مصداق قرار پاتا ہے۔ خوشی اور غمی زندگی کی گاڑی کے وہ دو پہیے ہیں جن کی موجودگی زندگی کے متحرک ہونے کی دلیل اور ترقیات سے ہم کنار ہونے کی سبیل تصور کیے جاتے ہیں۔ چینی شاعری میں موجود عناصر کا تعلق ارضی مظاہر سے ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شاعری میں بھی جگنو کی علامت کو کئی ایک مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ انسانی خصائص میں علم و فضل بانٹنا بہت بڑی صفت ہے۔ جگنو بھی اپنی ذات کی نفی کر کے اندھیروں میں روشنی بانٹنے کو اپنی زندگی کو مقصد بنائے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ چینی شاعر فطرت کے مناظر اور مظاہر کے اظہار کی قدرت رکھتے ہیں۔ فطرت کے جمال اور رعنائی کے لیے وہ ایک مخصوص نگاہ رکھتے ہیں۔ چینی ادب کے صفحات پر فطرت کے رنگا رنگ حُسن کی دلآویزی جس کثرت سے ملتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ المختصر چینی ادب فطرت اور اُس کی بے پناہ محبت سے مخمور ہے۔

دنیا کی ہر تہذیب میں عورت کو اپنے والدین اور ان کے گھر کی ہر چیز سے ایک خاص انس ہوتا ہے۔ اسی انس اور اپنائیت کے باعث وہ اپنی شادی کے بعد بھی میکے کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ "عُروسی کے چھپر کھٹ کا پردہ" بنیادی طور پر ایک ایسی چینی عورت کی منظوم فریاد ہے جب وہ اپنی شوہر کی بے وفائی کے باعث جہیز میں ملنے والے ایک کپڑے سے مخاطب ہو کر بیان کرتی ہے۔ یہ نظم تیسری صدی عیسوی کے ایک نامور سپہ سالار جنرل لیو ہسون کی اپنی بیوی سے بے وفائی کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ فوجی جرنیل نے اپنی

زندگی کا ایک طویل حصہ اپنی بیوی کے ساتھ گزارا تھا۔ تاہم ایک فوجی مہم کے دوران وہ "سوما خاندان" کی ایک دوشیزہ کی محبت کا اسیر ہو کر اپنا سب کچھ اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ چینی سالار نے اپنی پہلی بیوی کی محبت اور نیاز مندی کو پسِ پشت ڈال کر دوسری شادی کو فیصلہ کر لیا۔ شوہر کے اس فیصلے پر وہ عورت اپنی شادی کے ابتدائی دنوں اور میکے کی حسین یادوں کو اپنے دل ہی دل میں یاد کر کے خون کے آنسو بہانے پر مجبور تھی۔ جب وہ واپس اپنے والدین کے ہاں عازمِ سفر ہوئی تو وہ دورانِ سفر وہ اپنے جذبات کے اظہار اور اپنی دلی کیفیت کو زبان دینے کے لیے اپنے پردے سے مخاطب ہو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

"اے پردے چھپر کھٹ کے پردے!
بابل کے یہاں سے لائی تھی
میں ساتھ تجھے اس مقصد سے
دنیا کی نگاہوں سے اوجھل
اچھے ہیں کھیل محبت کے
اے پردے چھپر کھٹ کے پردے۔۔۔
کلفت کی یہ گھڑیاں کٹ جائیں
اور بھاگ کھلیں تیرے میرے
ایسا بھی کوئی دن آئے!
یا چین کے دن سب بیت چکے
اے پردے چھپر کھٹ کے پردے" (۷)

ہرجائی اور ہجر کی ایسی کیفیات کو چینی شاعری میں فن کارانہ مہارت سے پیش کرنے کا انداز دل چسپ بھی ہے اور دل فریب بھی۔ انسانی فطرت ہے کہ دُکھ کی گھڑیوں میں وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے جذبات کو محسوس کر کے زبان پر لاتا ہے۔ انہی کیفیات کی ترجمانی ۱۰۰ قبل مسیح کے چینی شاعر می شینگ کی ایک نظم "جوانی" میں بھی ہوتی ہے، جس میں ایک رقاصہ کی اپنے شوہر سے جدائی اور ہجر کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس رقاصہ کا شوہر ایک غیر مستقل مزاج آدمی ہے جو کسی ایک چیز پر شاکر رہنے کے بجائے اِدھر

اُدھر مارامارا پھرتا رہتا ہے۔ اپنے شوہر کے اس غیر مناسب سلوک کے باعث وہ عورت حسرت ویاس کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔ اسے اپنے شوہر کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسا تقاضا دنیا کی ہر عورت کرتی ہے کہ اس کا شوہر اس کا وفادار رہے۔ شومئ قسمت جب اسے شوہر کی بے وفائی کا علم ہوا تو وہ واپس اپنے والدین کے گھر جاتے ہوئے اپنے جہیز میں شامل ایک پردے سے مخاطب ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہی ہے۔

زندگی اور موت ایسی آفاقی حقیقتیں ہیں جن کا انکار کسی بھی انسانی تہذیب میں نہیں کیا گیا۔ انسانوں کی پیدائش اور مرگ کے مواقع پر ہونے والی رسومات دراصل کسی تہذیب کی جامعیت اور اس کے فلسفہ حیات کو سمجھنے میں مدد ومعاون ہوتی ہیں۔ چینی تہذیب میں بھی موت کے وقت سوگ پر مبنی رسومات اور ایسی ہی کیفیات سے بھرپور نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ ابنِ انشاء کے زیرِ نظر چینی نظموں کے اردو ترجمے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جہاں خوشی کے گیت ترجمہ کئے گئے ہیں وہیں موت کے وقت جو منظوم کلام پڑھا جاتا ہے، اس کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ "تدفین کے گیت" نامی نظم میں بنیادی طور پر دو نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی نظم کو امراء میں سے کسی کی موت کے موقع پر پڑھا جاتا ہے جب کہ دوسری نظم کو عوامی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی موت کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ دونوں نظموں کا حاصلِ کلام یہی ایک خاص نقطہ ہے جو ہر تہذیب سے وابستہ لوگوں میں ایسے مواقع پر پیشِ نظر رہتا ہے، وہ ہے دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور موت کے بعد دنیا سے تعلق منقطع کر کے سارے رشتوں ناتوں کو توڑ کر دنیا کو چھوڑنا ہے۔ دونوں نظمیں اپنے اندر اختصار کی خصوصیت کو سموئے ہوئے ہیں۔ بادشاہوں یا امراء کے لیے پڑھے جانے والے گیت کا ترجمہ یوں ہے:-

لہسن کے پتوں کی شبنم
پل پل سوکھی جائے
یہ شبنم جو اَب اڑ جائے
کل پھر واپس آئے
لیکن آج لحد میں جس کا
بستر نرم بچھے گا!

گرمی ہو یا پوس کا جھاڑا
وہ نہ کبھی لوٹ آئے (۸)

ہند اسلامی تہذیب کے حاملین بھی اپنے ہاں ہونے والی اموات کے موقع پر اپنے غم کے اظہار کے لیے منظوم کلام پیش کرتے ہیں۔ سطح مرتفع پوٹھوہار کے اکثر علاقوں میں حضرت میاں محمد بخش رح کے عارفانہ کلام "سیف الملوک" کے وہ حصے درد اور جذب کی کیفیت میں پڑھے جاتے ہیں، جن میں دنیا کی ناپائیداری اور عارضی ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ "تدفین کے گیت" بھی چینی تہذیب کے حاملین کے لیے ایسے اشعار ہیں، جن سے وہ اپنے پیاروں کی حسین یادوں کو دل سے لگاتے ہیں اور نیک خواہشات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت کرتے ہیں۔ تاہم غربت اور امارت کے درمیان جاری کشمکش کے باعث زیریں طبقے کو اپنی غمی کی رسومات کے موقع پر سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس نظم کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں، ایک حصے طبقۂ امراء کی آخری رسومات کے لیے اشعار ہیں تو دوسرے حصے میں غریب افراد کے لیے منظوم کلام پیش کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں دیکھا جائے کسی بھی انسان کے انتقال کے موقع پر پیدا ہونے والے جذبات کا تعلق دولت یا غربت سے قطعاً" نہیں ہوتا۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود انسانی سماج میں طبقاتی نظام کو روا رکھ کر امیر و غریب کے مابین خلیج کو مزید وسیع کیا جاتا ہے۔

۱۲۴ ق م میں لکھی گئی نامعلوم شاعر کی نظم " قلعے کے جنوب کی لڑائی " چینی شاعری کا ایک بہترین مرقع ہے۔ بلاشبہ اس کا اردو ترجمہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں ایک قلعے کی حفاظت پر معمور شاہی محافظوں کی قربانی کو پیش کیا گیا ہے۔ ان سرفروشوں کی اپنی جان کو ہتھیلی پر لے کر دشمن کے سامنے ڈٹ جانا، بہادری کی ایک زبردست مثال ہے۔ ہر تہذیب کے کچھ مظاہر ایسے ہوتی ہیں جنہیں مادی عناصر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً" محبت، مہمان نوازی، دوستی، خلوص اور احترام وغیرہ۔ ایسے ہی بہادری کا جذبہ بھی ایسا عنصر ہے جسے پیش کرنے کے لیے جنگوں کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ چینی تہذیب کا سب سے خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں بیرونی طاقتوں کو کبھی بھی سرزمینِ چین پر قابض ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ چینی قوم کو کسی بھی دور میں کسی بیرونی طاقت کا باج گزار ہونے کی زحمت گوارہ نہیں کرنی پڑی۔ زیرِ غور نظم میں چینی تاریخ کے ان بہادر سورماؤں کو پیش کیا گیا ہے جنہوں نے دلیری سے اپنی سرزمین کا دفاع کیا اور اپنی

جان بھی اس عظیم مقصد کے لیے پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔"سپاہی کا انتظار" نامی نظم میں محاذ پر ڈٹے سپاہی کے منتظر انسان کی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔

"ابابیل کا گیت" نامی نظم موسمِ بہار کے گزرنے اور موسم سرما کی آنے پر درپیش حالات کو پیش کرتی ہے۔ ایک ابابیل کے جذبات کو پیش کرتے ہوئے دراصل اُن حقائق کا بیان کیا گیا ہے جو آنے والے زمانے میں ہر فرد کو پیش ہو سکتے ہیں۔ ہمیشہ حالات ایک جیسے نہیں رہتے ہیں۔ تغیر اس دنیا میں ایک ایسی ابدی سچائی ہے جو کائنات کو آگے بڑھا رہا ہے۔

ساز جب میں اٹھاتی ہوں
یا محبت کا گیت گاتی ہوں
تار نغمے کا ٹوٹ جاتا ہے
ساز ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے
کیسے تم تک پیام پہنچاؤں
حال اپنا تمام پہنچاؤں(۹)

چینی نظم اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ آسانی اور پریشانی زندگی کا حصہ ہے۔ عقل مند وہی ہے جو آنے والے وقت کی پہلے سے تیاری کر لے۔ وقت گزر جانے کے بعد یہ امید رکھنا کہ تنگی کی گھڑیوں میں خود بخود حالات ٹھیک ہو جائیں گے، محض ایک خام خیالی اور جھوٹی تسلی کے سوا کچھ نہیں ہے۔اس نظم کی خوب صورتی یہ بھی ہے کہ اس میں مظاہرِ فطرت کو بہت ہی دل کش انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان فطری مناظر کو پیش کرتے ہوئے جس سادگی اور بے ساختگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ چینی شاعری کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ایک بہترین تجربہ ہے۔ مختصر الفاظ میں کیفیات کی عکاسی اور اس میں موجود معنویت کو سامنے لانے میں چینی شاعری کے کلاسیکی نمونے اپنی مثال آپ ہیں۔ فطری مناظر کو بیان کرنے کی بے پناہ قوت اور صلاحیت کے باعث چینی شاعروں میں ایسا انداز پیدا ہو گیا ہے، جسے بجا طور پر چینی شاعری کے خاص وصف قرار دیا جا سکتا ہے۔ چینی تاریخ اور تہذیب سے آگاہی فراہم کرنے والی اردو کتب میں سے ایک اہم مترجمہ کتاب "چین کا بدلتا سماج" میں اس بحث کا احاطہ یوں کیا گیا ہے:-

"چینی ادیب فطرت کے مناظر اور مظاہر کے بیان کی بے مثل قوت رکھتے ہیں۔ فطرت کے حسن کے لیے وہ ایک مخصوص نگاہ رکھتے ہیں۔ چینی ادب کے صفحات پر فطرت کے رنگارنگ حسن کی دلآویزی جس افراط سے ملتی ہے اس سے مغربی مصنف بالکل آشنا نہیں۔ چینی ادب فطری ادب سے معمور ہے۔"(۱۰)

ابنِ انشاء کی ترجمہ کردہ اِن چینی نظموں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں عظیم چینی مفکر کنفیوشس سے بھی منسوب چند نظموں کو پیش کیا گیا ہے، جو نغمگی اور روانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں ہیں۔ "کوچ" کے عنوان سے اس نظم میں بہت ہی دل کش انداز میں ہجر کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ تین حصوں پر مشتمل اس نظم کے پہلے حصے میں ہوا کو مخاطب کرتے ہوئے ہجر کی کیفیات کو وصال میں بدلنے کی سعی کی گئی ہے۔ بقیہ دونوں حصوں کی اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اس میں نغمگی اور ردھم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اگر کنفیوشس کی نظم پر غور و فکر کیا جائے تو ایک خوب صورت احساس ہمارے سامنے آتا ہے، جس کے اندر فطرت کے ساتھ وابستگی اور وارفتگی کے ایسے ایسے حسین تجربے سامنے آتے ہیں کہ جو انسان کی روح کو سرشار کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں، تصنع سے پاک اسلوب میں ہجر و وصال کی کیفیات کو بیان کرنے میں جس کاریگری کا مظاہرہ کیا گیا ہے، بلاشبہ فطرت کے دل دادہ اہلِ ذوق کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

لو سرد اور تیکھی بہنے لگی پورب کی ہَوا
لو برف زمیں پر گرنے لگی گالا گالا
تم دل اپنا مجھے سونپ چکے کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے لاؤ ہات میں ہات تو دو
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دور چلیں، کہیں دُور چلیں (۱۱)

کنفیوشس کی اس نظم کے اردو ترجمے پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے انتہائی اعلیٰ شعری ذوق کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ الفاظ کے چناؤ اور ترتیب کا ایسا خوب صورت انداز متعارف کروایا گیا ہے جو اس عظیم شاعر کی عظیم نظم کے شایانِ شان ہے۔ فاضل مترجم نے گو کہ اس نظم کا

لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اسے رواں ترجمے سے مزین کر کے ایک زبردست فن پارے کو اردو زبان جاننے والے قارئین کو چینی شاعری کا ایک حسین مرقع فراہم کیا ہے۔

چینی تاریخ کے ایک اہم تانگ دور میں شعر و ادب کے افق پر شعراء و ادباء کی معقول تعداد موجود رہی ہے۔ ان شعراء میں سے مینگ ہاؤ جان کا نام اپنے فنی اظہار اور منفرد اسلوب کے باعث کسی مبالغہ آرائی کا محتاج نہیں ہے۔ زیرِ نظر ترجمے میں اُن کی نظم "اوائل خزاں کی سردی کے بارے میں" موسمی کیفیت کو بیان کرنے کا ایک خوب صورت تجربہ ہے۔ موسمِ گرما کے اختتام کے بعد موسمِ سرما کا بتدریج اپنی شدت میں اضافہ کرنا ایک فطری عمل ہے۔ اس سلسلے میں سرد ہواؤں کا چلنا، پرندوں کا آنے والے موسم کے لیے اپنی حفاظت کو یقینی بنانا، اپنے بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کرنا اور بعض پرندوں کا گرم علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنا موسم سرما کے چند خاص معمولات میں سے ایک ہے۔ مینگ ہاؤ جان نے اپنی اس نظم میں جہاں فطری عناصر کو زیرِ بحث لایا ہے وہیں مقامی جغرافیائی عناصر کو بھی سامنے رکھا ہے۔ یوں اس نظم میں مقامیت کی بھی ایک اہم جھلک موجود ہے۔ سیانگ یانگ کی جھلیں اس موسمی تغیر کی چشم دید گواہ ہیں۔ جو اس پورے منظر کو ایک خاموش قدردان کی مانند دیکھنے میں مگن ہیں۔

"وادی کے اُس پار" نامی نظم پہلی صدی قبل مسیح میں کسی نامعلوم چینی شاعر کی تخلیق کی گئی نظم ہے۔ اس میں ایسے دو بھائیوں میں سے اس بھائی کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جو کسی جنگ کے نتیجے میں دشمن کے نرغے میں آکر گرفتار ہو گیا۔ جب کہ اُس کا دوسرا بھائی اس اذیت میں مبتلا ہونے سے نا صرف محفوظ رہا بل کہ وہ اپنے گھر میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ گرفتار بھائی اپنی مشکلات کو بیان کرتے ہوئے خون کے آنسو رو رہا ہے۔ نہ تو اسے معیاری کھانا دستیاب ہے اور نہ ہی سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت حاصل ہے۔ یوں تو بھائیوں کی باہمی محبت کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں جن میں بھائی آپس میں ایک دوسرے کے لیے جان دینے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ تاہم اس نظم میں دونوں حقیقی بھائیوں کے مابین جس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو بھائی آزادی کی زندگی گزار رہا ہے، اسے اپنے گرفتار بھائی سے کوئی غرض نہیں ہے، بلکہ وہ اسے دورانِ قید درپیش مسائل کو حل کرنے اور رہائی کی کوئی سبیل کرنے کی کوئی بھی کوشش بروئے کار نہیں لا رہا ہے۔ قیدی بھائی اپنے شب و روز کو ایک مجبور شخص کی مانند کاٹنے پر مجبور

ہے۔ گویا کہ اس مختصر سی نظم میں اس اہم امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ مال و دولت کی زیادتی بسا اوقات انسان کو اس کے مخلص ترین رشتوں سے غافل کر دیتی ہے اور وہ غفلت کا شکار ہو کر اپنی بسائی ہوئی دنیا میں مگن ہو جاتا ہے۔

نظم "لی لنگ" میں ایسے دو دوستوں کے ذکر ہے جو ایک جنگی مہم کے دوران دشمن کے نرغے میں آ کر گرفتار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ دشمن افواج نے انہیں انیس برس تک قید کی سزا سنائی جو انہوں نے ایک ایک دن گن کے کاٹی۔ اس دروان ان کے گھروں میں بہت سے مسائل آئے اور چند خوشیاں بھی یقینی طور پر آئی ہوں گی۔ مگر وہ اِن سے بے خبر اپنی قید کاٹنے پر مجبور تھے۔ آخر کار انیس برس کا طویل دورانیہ مکمل ہوا۔ تاہم ان میں سے رہائی کا شاہی حکم صرف ایک قیدی یعنی سوو کے لیے جاری ہوا۔ جب یہ خبر اسے ملی تو اس نے اپنے دوسرے ساتھی لی لنگ کا اس سے آگاہ کیا تو اس نے حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات میں اپنے معافی الضمیر کا اظہار کیا۔ یوں اس کے یہ جذبات ایک نامعلوم شاعر نے اپنی ادبی استعداد سے شعری آہنگ میں محفوظ کر لئے۔

بارہویں صدی عیسوی کے معروف چینی شاعر لُویو کی ایک نظم "خزاں میں کشتی بانی" بنیادی طور پر ان کی سیلانی طبیعت اور دنیا سے بے گانگی کا ایک دلچسپ مظہر ہے۔ اپنی مستی میں مگن وہ اپنی کشتی میں سوار جنگل کے بیچوں بیچ ندی میں سے گزرتا ہوا اپنے ارد گرد کی فطری آوازوں کا سنتا جاتا ہے۔ اسے پرندوں کی مدھم اور مدھر آوازیں سنائی دیتی ہیں، پانی میں چلتے ہوئے کشتی کی آواز، ارد گرد آبادیوں سے آئے ہوئے جانوروں کے گلے میں بجتی گھنٹیاں بھی اس ماحول کو چار چاند لگانے میں اپنا حصہ ڈال رہی ہیں۔ مگر شاعر اپنے احساس کے ساتھ جینا چاہتا ہے اور خزاں میں کشتی بانی کے اس تجربے کو کسی اور احساس کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں مگن ہے۔

تاؤ چن کی نظم "ایک سفر" دراصل انسان کی ازلی ضرورت روٹی کے حصول کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ آج تک انسانیت جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار رہی ہے اُن میں روٹی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ نت نئی ایجادات اور حیرت انگیز سائنسی کمالات کے باوجود بھی انسانیت مجموعی طور پر اس مسئلے کو احسن انداز میں حل کرنے میں مکمل طور پر کامیاب نظر نہیں آتی۔ بھوک کا مسئلہ پسماندہ اقوام میں تو پہلے ہی شدت سے

موجود ہے، لیکن اب بے لگام صنعتی سرگرمیوں کے باعث ترقی پذیر ممالک میں یہ مسئلہ ایک عفریت کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ تاؤچن نے بھوک کے عالمگیر مسئلہ کو اپنی فنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے یوں پیش کیا ہے کہ گویا کہ یہ ہر اس انسان کا نوحہ ہے جو اس سے نمٹنے کی کوشش میں جدوجہد کررہا ہے۔

"لویانگ کے کھنڈرات" تیسری صدی عیسوی کے چینی شاعر ساؤچن کے ایسی نظم ہے جس میں چین کے ایک تاریخی مقام کے جنگ کے بعد ابتری اور بربادی کو منظوم کیا گیا ہے۔ شاعر نے شاہی محل اور اس کی رونقوں کے اختتام کو موضوع بنایا ہے۔ حرم میں ہر لمحہ رنگ ونور کا عالم ہوا کرتا تھا۔ شہر میں جابجا تجارتی قافلے ڈیرا ڈالے ہوتے تھے۔ زرعی اور صنعتی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہوتی تھیں۔ کھیتوں میں ہر سمت سبزہ اور ہریالی کا دور دروہ ہوتا تھا۔ عام لوگ اپنی زندگیوں کو بہتر انداز میں گزارنے کے لیے کام کاج میں مصروف رہتے رکھائی دیتے تھے۔ یکایک جنگ کی عفریت نے سب کچھ تباہ وبرباد کر دیا اور ہنستے بستے اس شہر کو تاراج کر کے ملیامیٹ کر دیا گیا۔ گویا جنگ نے پوری تہذیب کو تباہی کا نشانہ بنا کر نہ صرف انسانیت کو تباہ کیا بلکہ عظیم ثقافتی ورثے کو بھی ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ اس سانحہ میں شاعر کا اپنا گھر، جہاں اس نے اپنی زندگی کا خوب صورت دور گزارا تھا، وہ بھی نابود ہو کر فنا ہو گیا۔

"سی چوں کا نوحہ" ۱۱۰ قبل مسیح میں ہونے والے ایک سمجھوتے کے پس منظر میں منظوم کی گئی زبردست نظم ہے۔ اس زمانے میں ریاستوں کے درمیان جاری مخاصمت کو مفاہمت میں بدلنے کی غرض سے چینی شہزادی کو وسط ایشیا کے ایک بادشاہ کے نکاح میں دے دیا گیا۔ سی چوں نام کی اس دوشیزہ کو دلہن بنا کے مختصر قافلے کے ساتھ اس کے شوہر کے محل کی جانب روانہ کیا گیا۔ محل میں پہنچ کر اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ اس کا شوہر تو انتہائی بوڑھا اور قریب المرگ شخص ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی زبان سے بھی ناواقف تھے، اس لیے باہمی گفتگو کا موقع بھی میسر نہ تھا۔ سال بھر میں محض ایک بار اسے اپنے شوہر کی رفاقت میسر آتی۔ مزید ستم یہ کہ اسے بادشاہ کی بیوی ہونے کے باوجود نہ تو معیاری خوراک دی جاتی تھی اور نہ ہی اسے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل تھا۔ اس دکھ اور کرب کی کیفیت میں وہ اپنے میکے کو آہیں بھر بھر کر یاد کرتی اور اپنی قسمت کا ماتم کرتی رہتی۔ ایسی مثالیں کئی ایک معاشروں اور تہذیبوں میں بھی دیکھنے

میں آتی ہیں جہاں کسی نہ کسی مصلحت کے تحت عورت کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔

چینی نظموں میں حسِ مزاح کے نمونے بھی بسا اوقات دکھائی دیتے ہیں، جن میں ہلکے پھلکے انداز میں لطیف پہلوؤں کی نقاب کشائی کر کے بہت بڑی حقیقتوں کو آسان الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ابنِ انشاء کی ترجمہ کی ہوئی خوب صورت نظم "فلسفی" کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں اور علمی مباحث میں ایک عام آدمی کا دلچسپی لینا ایک غیر یقینی بات ہے۔ ایک مزدور یا کسان کی اپنی پوری زندگی سادگی سے عبارت ہے جسے وہ تصنع اور بناوٹ سے پاک انداز میں گزار دیتا ہے۔ اپنی احتیاجات کو پورا کرنے کی حد تک وہ علم و ہنر سے اپنی راہ و رسم پیدا کرتا ہے۔ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے وہ صبح سے شام تک اپنے مختلف کاموں میں منہمک رہتا ہے۔ اس کے لیے کل کائنات اسی معمول کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا کہ دنیا کے دوسرے کونے میں کیا ہو رہا ہے۔ ایسی کیفیت کو بیان کرنے والی دل چسپ نظم "فلسفی" بھی خوب صورت مزاح سے بھرپور نظم اپنی مثال آپ ہے:-

"جو بولتے ہیں وہ کیا جانیں
جو جانتے ہیں وہ کب بولیں
یہ قول ہے لوزو دانا کا
اچھا تو ہم نے مان لیا
یہ لوزو عارف و دانا تھا
پر یہ تو کہو کیوں اُس نے لکھی
یہ پوتھی سینکڑوں صفحوں کی"(۱۲)

"ایک پہاڑی جھونپڑی میں خزاں کی آمد پر" کے عنوان سے لکھی گئی نظم چینی شاعری کے ایک اہم پہلو کی نقیب ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں اور مابعد الطبعیات کے اسرار و رموز سے قطع نظر سیدھے سادھے انداز اور الفاظ میں قلبی کیفیات کا اظہار چینی نظموں کا ایک خاص وصف ہے۔ ماحول میں موجود قدرتی خوب صورتی کو الفاظ کا پیکر دینے کے لیے شاعر جن الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں، ان میں سلاست بھی موجود ہوتی ہے اور نفاست

بھی۔ اسی بنیاد پر چینی شاعری میں موجود مباحث کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ کوشش اور محنت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وانگ وی جو کہ تانگ دور کے شاعر ہیں، ان کی یہ نظم موسم کی تبدیلیوں کو خوب صورت انداز میں بیان کرتی ہے۔

مشرقی زبانوں کے ادب میں بارہ ماسہ لکھنے کی ایک توانا روایت موجود رہی ہے۔ اس صنف ہے جس میں سال کے بارہ مہینوں کی نسبت شاعرانہ خیالات کو منظوم کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ چینی شاعری کے اس ترجمے میں بارہ ماسہ صنف پر محیط ایک شان دار نظم "مینگ چیانگ نیو کا نوحہ" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال دراصل اس واقعے سے جڑا ہوا ہے جس میں چین کی عظیم دیوار کی تعمیر کے موقع پر وانگ چی لیانگ نامی مزدور کو جبرا" اپنے علاقے سے بہت دور اس منصوبے میں شریک ہونے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہ اپنی چہیتی بیوی کو چاہتے ہوئے بھی ساتھ لے جانے سے قاصر تھا۔ سرکاری حکم عدولی کے عتاب کا شکار ہونے کے خوف سے وہ بددل ہو کر، مجبورا" اپنی بیوی کو تنہا چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ اِدھر وانگ چی لیانگ کو مشقت کرتے کرتے مہینوں گزر گئے، مگر اسے واپس جا کر بیوی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری جانب اس کی بیوی مینگ چیانگ نیو اپنی شوہر کی جدائی میں حسرت و یاس کی تصویر بن گئی۔ موسمِ سرما کی آمد سے قبل اس نے دن رات محنت کر کے اپنے شوہر کے لیے گرم ملبوسات تیار کیں۔ تاہم ان چیزوں کو اپنی شوہر تک پہنچانے کا جب کوئی ذریعہ نہ بن سکا تو وہ خود ہی تنِ تنہا اس پر خطر سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ ان گنت تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والی یہ خاتون جب اس مقام پر پہنچی جہاں اس کا شوہر مزدوری کے لیے آیا تھا۔ تاہم اُسے یہ جان کر دلی افسوس ہوا کہ اُس کا شوہر اس دنیا میں نہیں رہا۔ مینگ چیانگ نے اپنے دل کا حال زبان پر اس انداز سے لایا کہ سننے والے بھی اس کے غم میں شریک ہو جاتے۔ بارہ ماسہ صنف میں لکھے ہوئے اس کلام کو ابنِ انشاء نے اردو زبان میں جس ہنر مندی اور دل سوزی سے منتقل کیا ہے، وہ بلاشبہ انہی کا خاصہ ہے۔ یوں تو تمام اصنافِ ادب کا ترجمہ انتہائی توجہ کا طالب ہوتا ہے، مگر شاعری کے ترجمے کا معاملہ سب سے جدا ہے۔ مارچ کو مذکور کرتے ہوئے غمگین مینگ چیانگ کی کیفیت کو ابنِ انشاء نے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

"مارچ آیا ہے۔۔۔۔۔پیغام لایا بھی ہے، پر وہ میرا نہیں
آڑوؤں میں نئے پھول آنے لگے
لوگ قبروں پہ کاغذ جلانے لگے
قبر اُس کی مگر،
سرد وویران ہے۔۔۔۔۔اب بھی سنسان ہے" (۱۳)

زیرِ نظر کتاب کا پہلا حصہ قدیم نظموں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اس حصے کی آخری نظم بنیادی طور پر سترہ مختصر نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں ھان شان نامی ایک شاعر کی تخلیق کردہ ہیں۔ چینی زبان میں ھان شان کا ترجمہ ٹھنڈا پربت یا سرد پہاڑ کے طور پر کیا جاتا ہے۔ دراصل اس شاعر کی زندگی اپنے بھائی کے ساتھ بہت آسودگی سے گزر رہی تھی۔ تاہم کسی بات پر اختلاف ہونے کے باعث اسے اپنا گھر بار چھوڑ بیوی کے ہمراہ دور دراز علاقے میں منتقل ہونا پڑا۔ اس مقام پر ایک ایسا پہاڑ تھا جو سارا سال برف سے ڈھکا رہنے کے سبب سرد رہتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ھان شان اس کا تخلص نہیں ہے بلکہ ایک باطنی کیفیت، سکون و استغنا کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ ھان کی ان نظموں میں مظاہرِ فطرت کا جس خوبی سے اظہار کیا گیا ہے، اسے چینی شاعری کی روایت میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ فطری مناظر اور ان میں پوشیدہ حسن کی تلاش اور اس کے اظہار پر جو قادرالکلامی چینی شاعری میں نظر آتی ہے، بلاشبہ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

"چینی شاعری کا بیشتر حصہ قلبی واردات کے بجائے لمحاتی سرشاری کی کیفیت کا غماز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی نظمیں مختصر اور تجرید تک پہنچی ہوئی تمثال کاری کا شاہکار ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بیان شخصی تجربے کا ہے جو زندگی کے معمولات سے کوئی منفرد حسی کیفیت کشید کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔" (۱۴)

ھان شان کی شہرہ آفاق سترہ نظموں میں سب سے آخری نظم وہ ہے جس میں زندگی کی بے ثباتی اور موت کے ایک اٹل حقیقت ہونے پر دلائل دیئے گئے ہیں۔ شاعر نے اپنی داخلی کیفیات کو اس نظم کی صورت میں الفاظ کا پیکر عطا کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں خواہ مخواہ کی فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے سیدھے سادے انداز میں عام فہم بات کی گئی ہے۔ برف اور پانی کی تمثیل پیش کرتے ہوئے ایسا انداز

اختیار کیا گیا ہے کہ جس کی بدولت انسانی نفسیات اور اس سے وابستہ امور کا بے باک اظہار سامنے آتا ہے۔ زیرِ غور نظم میں سادگی اور سلاست کی جو شعریت ملحوظ رکھی گئی ہے، اس میں انسان کے لیے بہت بڑا پیغام ہے۔

"چینی ادب حیرت انگیز حد تک رنگارنگ ہے لیکن اس رنگارنگی کے باوجود اس کا ایک ہی مقصد ہے فطرت سے ہم آہنگی کی تلاش۔ چینی شاعری کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر صحیح ہے۔ شاعر اپنے شعور کو کائنات میں گم کر دیتا ہے اور اس کی اپنی زندگی باقی کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ خارجی مظاہر اور داخلی احساس میں جو حدیں حائل ہیں وہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ شاعروں کا ادرش وہ ہے جسے چوانگ ٹزو "تمام اشیاء کی برابری" کا نام دیتا ہے۔"(۱۵)

چینی نظموں کے اس انتخاب کا اگلا حصہ قدیم چینی شاعری کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اس حصے کی پہلی نظم ہوچی فینگ کی ہے۔ اس نظم کا مطالعہ ایک دل چسپ تجربے سے عبارت ہے۔ تہذیبوں کے مابین مکالمہ ہی انسانی سماج کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ زیرِ غور نظم میں موسمِ خزاں کے بارے میں انتہائی سادگی اور خوب صورتی سے شاعر نے اپنے جذبات کو زبان دی ہے۔ مشرقی زبانوں کے روائتی اسلوب کے برعکس عام فہم انداز میں موسمی تغیر کو پیش کیا گیا ہے جس میں سلاست کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جابجا بیل بوٹوں، درختوں، کھیتوں، کسانوں اور دیہی سماجی تشکیل میں شامل نمایاں عناصر کو ذکر کرتے ہوئے خزاں کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی ہر تہذیب میں موسموں کے حوالے سے خصوصی اہتمام دکھائی دیتا ہے۔ تہذیبی عناصر میں لباس، طعام، نشست و برخاست، خوشی غمی کے مواقع اور عمومی مجالس کے موقع پر موسمی اثرات کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ چینی تہذیب کی بنیاد ارضی ہے اسی لیے اس کی شاعری میں بھی جو عناصر نمایاں ہیں ان کا تعلق بھی ارضی ہے۔ اس کے برعکس مشرق کی دیگر زبانوں میں مابعد الطبعیاتی عناصر کو بہت زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک حقیقت ہے ہمارے ہاں جب تک کلام میں غیر ارضی عناصر کو شامل نہ کیا جائے، تب تک اس کلام کی آفاقیت کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا جاتا ہے۔

ہوچی فینگ کی ہی اگلی نظم "سرخ رنگ دھوئیں نہیں" بنیادی طور پر زندگی کی تلخیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا ایک منشور ہے۔ ایک دھوبی کے معمولات کو پیش کرتے ہوئے مظاہرِ فطرت کو اس کے حقیقی چہرے

کے ساتھ پیش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی ہے۔ بارش اور دھوپ کی علامت کو استعمال کرتے ہوئے انسان کی زندگی میں آنے والی مشکلات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس طرح ایک لباس کو بار بار دھونے اور اس پر دھوپ کے اثرات کے باعث اس کے رنگوں میں کمی اور پھیکا پن آجاتا ہے اسی طرح زندگی کے مختلف مراحل میں بھی آنے والے مصائب اس کی رنگا رنگی کو گھہنا دیتے ہیں۔ مشکلات اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ ایسا ممکن نہیں کہ دکھوں کو زندگی سے الگ کر کے خوشیوں کو گلے لگا کر عمر گزار دی جائے۔ ہوچی فینگ کی اس نظم سے ہمیں چینی تہذیب کے اس پہلو سے آگاہی ملتی ہے کہ انسان اگر سیکھنا چاہے تو اسے زندگی کا کوئی بھی پہلو یا واقعہ ایسا سبق دے سکتا ہے جس کی بنیاد پر زندگی کی گاڑی کو کامیابی سے چلانا مشکل نہیں۔ محمد ارشد قریشی اپنے مضمون "چین میں نئے سال کی آمد" میں لکھتے ہیں کہ جشن بہاراں کو منانے کی ابتداء ۴ ہزار سال پرانی ہے، جس کی تاریخ کچھ یوں ہے کہ کوئی شیطانی قوت ان ہی دنوں چین کے مختلف علاقوں سے گزرتی تھی، جس کی وجہ سے علاقے میں تباہی اور لوگوں میں بیماریاں پھیلتی تھی، مویشی ہلاک ہو جاتے اور فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ انہی تاریخوں میں کچھ بچے ایک علاقے میں بہت بڑی سرخ رنگ کی چادر تان کر اس کے نیچے آتش بازی کر رہے تھے، بچے اتفاقیہ طور پر سرخ رنگ کی چادر استعمال کر رہے تھے، لیکن اسی رنگ کے استعمال سے وہ شیطانی طاقت وہاں سے بھاگ گئی۔ اس سال چین میں نہ کوئی آفت آئی، نہ بیماریاں پھیلیں اور نہ ہی فصلیں تباہ ہوئیں۔ اس بات سے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ شیطانی طاقت سرخ رنگ اور آتش بازی سے خوفزدہ ہوتی ہے۔ بس اسی وقت سے یہ تہوار منانے کی ابتدا ہوئی، جس کے بعد چینی ہر نئے سال کا آغاز اسی تاریخی مذہبی عقیدے سے ساتھ کرتے ہیں۔ نئے سال اور جشن بہاراں کی آمد سے قبل ہی اپنے مکانوں اور دکانوں کی صفائی کرتے ہیں، سجاتے ہیں، مختلف اقسام کے پکوان پکائے جاتے ہیں اور سرخ رنگ کے مشروبات تیار کئے جاتے ہیں جن سے مہمانوں کی خوب خاطر مدارت کی جاتی ہے۔

رشید صافی اپنے مضمون "ثقافتوں کی منتقلی" میں لکھتے ہیں کہ ثقافت کا دریا مسلسل بہتا ہے‘ اس میں نئے پانی اور نئے دھارے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ثقافت صرف روایات‘ زبان اور رسم و رواج تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع تصور ہے جو کسی قوم کی تاریخ‘ معاشرت‘ فنون اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس لیے ثقافتی تبادلہ ایک قدرتی عمل ہے جو مختلف تہذیبوں کے درمیان ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔ جب مختلف

ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات استوار ہوتے ہیں تو ان کے درمیان لوگوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ تاجر' سیاح اور دیگر افراد جب ایک دوسرے کے ممالک کا سفر کرتے ہیں تو اپنے ساتھ اپنی ثقافت بھی لے کر جاتے ہیں۔ اس طرح مختلف ثقافتوں کے درمیان اقدار کا تبادلہ ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں

چین کا جشنِ بہار ایک ایسا تہوار ہے جو پوری دنیا میں مقبول ہو رہا ہے۔ چین میں بہار کا تہوار' جسے نئے چینی سال کے تہوار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے' پورے ملک میں بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ یہ تہوار چاند کی گردش کے مطابق ہوتا ہے اور اس کی تاریخ ہر سال بدلتی رہتی ہے۔ اس کا آغاز عام طور پر جنوری یا فروری کے مہینے میں ہوتا ہے۔ نئے چینی سال کی تاریخ کا تعلق قدیم چینی ثقافت سے ہے جس کی ابتدا قدیم زمانے میں ہوئی تھی۔ اس وقت کے لوگ چاند کی گردش کو وقت کا پیمانہ سمجھتے تھے اور اس کے مطابق اپنا سال شمار کرتے تھے۔ اگرچہ اس تہوار کی سرکاری تعطیلات عام طور پر ایک ہفتہ تک جاری رہتی ہیں لیکن اس سے جڑی ہوئی رسومات اور جشن کا دورانیہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے' بعض اوقات یہ ۴۰ دنوں تک جاری رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چینی ثقافت میں بہار کا تہوار صرف ایک دن کا تہوار نہیں ہے بلکہ یہ پورے موسم بہار کی آمد اور نئے سال کے استقبال کا جشن ہے۔ اس موقع پر چین میں گھروں کو خوبصورت انداز میں سجایا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کے فانوس لٹکائے جاتے ہیں اور دروازوں پر مبارکباد کے پیغامات لکھے جاتے ہیں۔ لوگ نئے ملبوسات زیب تن کرتے ہیں۔ اپنے عزیزوں سے ملنے جاتے ہیں اور تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں۔ چینی عوام میں اس موقع پر بہت زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے۔

نئے چینی سال کا تہوار چینی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے' اس موقع پر لوگ اپنی ثقافتی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چینی ثقافت میں ایک قدیم عقیدہ ہے کہ بارہویں قمری مہینے کی ۲۵ تاریخ کو یوہوانگ دادی کے نام سے معروف جید شہنشاہ زمین پر اترتے ہیں۔ یہ عقیدہ چینی لوگوں میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس عقیدے کے مطابق جید شہنشاہ زمین پر اتر کر لوگوں کے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ لوگوں کے کردار' اخلاص اور ایمانداری کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی زندگیوں میں خوشی اور برکت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ چین کے جشنِ بہار اور نئے قمری سال کے تہوار کی اہمیت کو عالمی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے یونیسکو کی نمائندہ

فہرست میں غیر محسوس ثقافتی ورثے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی سنگ میل ہے کیونکہ اس سے چینی ثقافت کی عالمی سطح پر شناخت ہوئی اور اس کے تحفظ اور فروغ کو عالمی سطح پر حمایت ملی ہے۔ نئے چینی سال کا تہوار صرف چین میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں چینی برادریوں کے ذریعے بھی منایا جاتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک جیسا کہ سنگاپور' ملائیشیا' انڈونیشیا' ویتنام' تھائی لینڈ اور فلپائن میں چینی بہار کا تہوار بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ ان ممالک میں چینی برادریاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا اور یورپ کے مختلف ممالک میں بھی چینی برادریاں موجود ہیں جو نئے چینی سال کے تہوار کو بڑے جوش و خروش سے مناتی ہیں۔ ان ممالک میں چینی کمیونٹی نے اپنے ثقافتی مراکز قائم کیے ہیں جہاں وہ نئے چینی سال کے موقع پر مختلف ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے چینی سال کا تہوار صرف ایک تہوار نہیں ہے بلکہ یہ چینی ثقافت کی علامت ہے جو دنیا بھر میں اپنی شناخت بنا چکی ہے۔

"تربت کے پھول" کے عنوان سے ہو چی فینگ کی ایک اور نظم میں جو بنیادی جوہر پیش کیا گیا ہے وہ موت کے فلسفے کے متعلق ہے۔ بنیادی طور پر یہ نظم ایک ایسے معصوم کردار کے بارے میں ہے جو بچپن میں ہی موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ اس ننھے معصوم کی قبر کو مخاطب کرتے ہوئے شاعر جن جذبات کا اظہار کرتا ہے اسے خوب صورت الفاظ کی ایک مالا قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ دنیا کے باقی انسانوں کی طرح ایک معصوم بچہ بھی دراصل اپنی دنیا بسائے بیٹھا ہے۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن باہر کی دنیا سے بے خبر اپنے شاندار مستقبل کا گمان کرتے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ان پھولوں کی بھینی بھینی خوش بو کو سونگھو، جو گھاٹی میں کھل کر اپنی آب و تاب سے ماحول کو چار چاند لگا دیتے ہیں، مگر اپنے عروج کو پہنچنے کے بعد زوال آمادہ ہونے کے باعث مرجھانے پر مجبور بھی ہو جاتے ہیں۔ انھی پھولوں پر بسا اوقات شبنم بھی پڑتی ہے، جو کسی موتی کی مانند صاف و شفاف دکھائی دیتی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ کوئی موتی اپنی رعنائی کو بے نقاب کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ تاہم دنیا کے ان تمام رنگوں کے باوجود ایک ننھا منھا سا بچہ ہنستا مسکراتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ شاعر اس کی بے وقت موت پر بے حد رنجیدہ ہے اور اس کی یاد میں اپنے دل کا حال بیان کرتے ہوئے دُکھی ہے۔ اس نظم سے انسانی تہذیبوں میں موت کے اٹل ہونے اور اس کے سامنے انسان کے مجبور و بے بس ہونے کو دکھایا گیا ہے۔

لن کینگ کی نظم "وداعِ بہار" میں جس مضمون کو پیش کیا گیا ہے درحقیقت اسی کی ہی تفسیر ہے۔ یوں تو اس میں موسمی تغیر یعنی بہار کے ختم ہونے اور خزاں کے ڈیرا ڈالنے کے بارے میں ہے، لیکن اس میں زندگی کی ناپائیداری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زندگی کا سفر بظاہر تو ساٹھ ستر سالوں تک ہی جاری رہتا ہے، لیکن انسانی تہذیب کا سفر صدیوں تک ایک تسلسل سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسی تسلسل کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں تہذیبیں ایک دوسرے سے مکالمے کرتے ہوئے استفادہ کرتی ہیں۔ باقی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اپنی بقاء کی جنگ لڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ عالمی انسانی سماج کے وسیع تر مفاد میں ہم آہنگی اور رواداری کا قیام از حد ضروری اور لازمی ہے۔ "وداعِ بہار" درحقیقت لن کینگ کی جانب سے ایک خوب صورت پیغام ہے جس میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شے یا انسانی کیفیت دائمی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ اس میں تبدیلی کا پیدا ہونا اس کی فطرت کا تقاضا ہے گویا تغیر کو ہی ثبات حاصل ہے۔ ہمیشہ کے لیے خوشی ہمارے ہم رکاب نہیں رہتی اور اسی طرح غم بھی ہمیشہ انسان کے دل میں اپنا مقام برقرار نہیں رکھ سکتے۔ "سرخ سایہ" اور "بچپن کی یادیں" بھی لن کینگ کی ایسی ہی دو مزید نظمیں ہیں جن میں انہی کیفیات کا ایک نئے تجربے اور زاویئے سے پیش کیا گیا ہے۔ اول الذکر نظم کے آخری حصے میں شاعر منظر نگاری کی عمدہ مثال پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ منظر نگاری دراصل چینی شاعری کی سب سے بنیادی خصوصیت ہے، جو اسے دنیا کی دیگر زبانوں کی شاعری سے منفرد مقام دلاتی ہے۔ اول الذکر نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:-

"چاندنی رات ہے
اور جنگل کی ویرانیوں سے کہیں
ایک جھینگر کی آواز آنے لگی
لو ہوا ناچنے کسمسانے لگی
اور چناروں کے بربط بجانے لگے
لو خزاں آ گئی
لو بہاروں کے دن بھی ٹھکانے لگے
لو خزاں آ گئی"(۱۶)

یوں تو ان نظموں میں چینی ثقافت کے ان گنت پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، تاہم چند ایسے پہلو بھی ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت منفرد اور دل چسپ ہیں۔ درج بالا اقتباس میں جھینگر کی آواز کا ذکر کیا گیا ہے۔ یوں تو یہ ایک عام سا کیڑا ہے، لیکن چینی ثقافت میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عہدِ قدیم سے ہی اسے بڑے اہتمام سے گھروں میں پالا جاتا تھا۔ اس کی آواز کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ بہت ہی خوش گوار ہے۔ اسی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے "چینی ثقافت کے تابندہ نقوش" کے مصنف ایس ایم حالی یوں رقم طراز ہیں:-

> "چین میں جھینگر پالنے کا شوق زمانہِ قدیم سے جاری ہے۔ جھینگر کو اس کی سریلی آواز اور ذہنی سکون پہنچانے والے پُر ترنم نغموں کی وجہ سے پالا جاتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں چینی جھینگروں کی لڑائی کے تماشے اور اس پر جوا کھلنے کے شواہد تاریخ سے ملتے ہیں۔ شاہی دور میں چینی فرمانروا، اور عوام دونوں کو جھینگر پالنے کا شوق تھا۔ شہر ممنوعہ کے مکین چنگ خاندان نے اس شوق کو چار چاند لگانے کی خاطر جھینگروں کی افزائش اور لڑنے والے جھینگروں کی نسل کو فروغ دینے کے لیے احسن اقدامات لئے تھے جو انیسویں صدی عیسوی تک شاہی محل کی اجارہ داری رہے۔"(۱۷)

چینی نظموں کے اس خوب صورت انتخاب میں جدید شاعری کرنے والوں میں موچہ مو کی تین نظمیں "ایک گلی کا منظر"، "کس کے بغیر" اور "برف کا گالا" روائتی چینی شاعری کے اہم مرقع ہیں، جن میں مظاہرِ فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا گیا ہے۔

وین ای تو کو جدید چینی شاعری کی روایت میں ایک اہم نام ہیں۔ اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شگاگو آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے داخلہ حاصل کیا۔ اُس زمانے میں چینی اپنے ملک سے باہر جہاں بھی مقیم ہوتے، وہ سب ایک ہی پیشے سے منسلک ہو جاتے، تاکہ کاروباری معاملات میں بہم آسانی رہے۔ اُس زمانے میں امریکہ میں مقیم چینی افراد دھوبی کا پیشہ اختیار کر کے اس شعبے سے اپنا روزگار کمانے لگے۔ امریکہ میں عوامی سطح پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید تمام چینی لوگ اسی کام میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ وین ای تو جب امریکہ کے اس ادارے میں داخل ہوئے تو ان کے بارے میں بھی یہی خیال کیا گیا۔

اس کیفیت کو انہوں نے نظم کی شکل میں پیش کیا اور بتلایا کہ کپڑے دھونا تو کوئی عار کی بات نہیں ہے، بل کہ اس عمل میں تو انسانی لباس سے میل کچیل کو دور کر کے اسے دوبارہ استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس نظم میں چینی قوم کی محنت، جفاکشی اور جواں مردی کا بھی بے باک اظہار کیا ہے۔

"دھوبی کے پیشے کو تم گندہ کہتے ہو
کہتے ہو دھوبی کا پیشہ پاک نہیں ہے
کیا دنیا میں چینی ہی گندے ہوتے ہیں۔۔۔
پانی اور صابن سے کیا کچھ ہو سکتا ہے
کپڑے دھونا تو فوجیں لڑوانا تو نہیں ہے
جنگی بیڑے میداں میں لانا تو نہیں ہے
میں نے مانا یہ کچھ اچھا کام نہیں ہے
کپڑوں سے لوگوں کے پسینے دھوتے جاؤ
اُن کی خاطر آپ ہی گندے ہوتے جاؤ
لیکن تمھی بتاؤ تم یہ کام کرو گے
ہاں ہاں تم ہی بتاؤ تم یہ کام کرو گے"(۱۸)

ابنِ انشاء کی مترجمہ نظموں میں سے "ققنس کا راگ" اہم نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم کو کوموجو نامی شاعر نے تخلیق کیا تھا۔ انہیں جمہوریہ چین کے جدید اور سربرآوردہ شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ عوامی خدمت کے جذبے کے تحت ملک کے نائب صدر کے طور پر بھی اپنی خدمات سرانجام دینے میں مصروف رہے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے ان کی یہ نظمیں ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی ہیں۔ "ققنس کے راگ" ان کی چند مشہور نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا انجامیہ گیت وحدت الوجود فلسفے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آگ کو ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس میں زندگی کے بارے میں اہم امور کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فینگ اور ہوانگ نامی دو پرندوں کے خیالات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ دونوں کے بارے میں ہم دردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ در حقیقت یہ دونوں پرندے بنیادی طور پر ایک ہی نسل

سے تعلق رکھنے والے نر اور مادہ ہیں۔ ان کی جو خصوصیات چینی معاشرے میں معروف ہیں، ان کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ققنس نامی اساطیری پرندے کی ہی مثل ہے۔ ققنس کے بارے میں ابنِ انشاء لکھتے ہیں:-

"ققنس ایک اساطیری پرندہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس کے مرنے کا وقت آتا ہے وہ سوکھی لکڑیوں کی چتا بنا کر اس پر بیٹھ جاتا ہے اور دیپک راگ گاتا ہے۔ راگ کی تاثیر سے لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور ققنس اس میں بھسم ہو جاتا ہے۔ اس راکھ پر مینہ برستا ہے تو اس سے پھر ققنس پیدا ہوتا ہے، چینی ادبیات میں اس کا مماثل فینگ اور ہوانگ کا جوڑا ہے۔"(۱۹)

زیرِ نظر ترجمے میں ابنِ انشاء نے جن منتخب نظموں کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے، ان میں سے بیشتر کا تعلق عیسوی دور کے لگ بھگ خیال کیا جاتا ہے۔ عمومی طور پر اس میں جن موضوعات کو ملحوظ رکھا گیا ہے ان میں کسانوں اور عام لوگوں کے رویئوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ چینی شاعری کے ابتدائی تراجم میں سے ایک ہونے کے باعث اس کو روایت ساز ترجمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ "گلبانگِ وفا" از انتخاب عالم

چینی نژاد اردو شاعر چانگ شی شوان کا اردو شعری مجموعہ "گلبانگِ وفا" اس اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے کہ یہ کسی بھی چینی ادیب کی جانب سے اردو زبان میں کی جانے والی پہلی کاوش ہے۔ چانگ شی شوان اردو حلقوں میں انتخاب عالم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا تخلص عالم ہے۔ "گلبانگِ وفا" میں انہوں نے اپنی چینی زبان میں کہی گئی چند منتخب نظموں کو بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یوں ان کی ترجمہ کی گئی نظمیں اس اعتبار سے خصوصیت کی حامل ہیں کہ انہیں تخلیق اور ترجمہ کرنے والی ایک ہی شخصیت ہے۔ نومبر ۱۹۹۸ء میں اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے تعاون سے اس کی اشاعت کا اہتمام ممکن ہوا۔ اس مجموعے کا پیش لفظ آفتاب اقبال شمیم نے تحریر کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"چین معجزوں کی سرزمین ہے۔ شاہراہِ ریشم تعمیر کرنے والی نسل کے ایک فرد نے اب خشتِ لفظ اور جذبہ وخیال کے مواد سے ایک داخلی شاہراہ تعمیر کرنے کا آغاز کیا ہے۔

کچھ عجب نہیں کہ آنے والے مشرق و مغرب کو ملانے والی اس ثقافتی شاہراہ کی تعمیر مکمل کر دیں۔"(۲۰)

چانگ شی شوان جنہیں انتخاب عالم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بنیادی طور پر چینی ادب کے بہترین استاد ہیں۔ تاہم اردو زبان سے واسطہ پڑتے ہی ان میں اسی زبان میں شعر کہنے کی خواہش بیدار ہو گئی۔ اُن کا اپنا خیال ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں مشترک عناصر پائے جاتے ہیں، لیکن ان کی اپنی اپنی جداگانہ انفرادیت بھی ہوتی ہے، جس کے باعث انہیں اردو میں شعر کہنے میں بے پناہ مشکلات درپیش رہیں۔ اس اہم مسئلے کے پائیدار حل کے لیے انہوں نے ایک جانب اردو شاعری کا بغور مطالعہ کیا، جس کے باعث انہیں اردو شاعری کے عمومی مزاج اور شعر کہنے کے انداز سے خاطر خواہ مدد میسر آئی۔ تاہم اردو ادب سے وابستہ نمایاں شخصیات سے بالمشافہ استفادہ ان کے لیے غیر معمولی فائدے کا باعث بنا۔ معروف شاعر مظفر وارثی سے چینی دارالحکومت بیجنگ میں عروض کا علم اور پروفیسر آفتاب اقبال شمیم سے شاعری کی اصلاح لیتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں اردو زبان میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ وہ اپنے شعری سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"ایک چینی ہونے کی وجہ سے میر اردو میں شعر گوئی کا راستہ خاصا پُر پیچ رہا۔ ۱۹۸۲ء کے آخر میں جب میں پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کر کے چین واپس آیا، تو اردو شاعری کے ماحول سے محروم ہو گیا، چنانچہ میری شعر گوئی کا وہی حشر ہو گیا جو ماہیِ بے آب کا ہوا کرتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں مشہور صحافی جناب احفاظ الرحمان دوبارہ بحیثیت ماہرِ زبان چین تشریف لائے اور مجھے شعر کہنے کا سلسلہ جاری رکھنے کا تاکیداً" مشورہ دیا، جب کہ اُن کی بیگم محترمہ مہ ناز رحمان جو خود بھی ایک پیشہ ور صحافی ہیں، اکثر و بیشتر پاکستانی رسالوں اور اخباروں میں میرا کلام شائع کراتی رہیں۔ ۱۹۸۷ء میں جناب اکرم ذکی، جو بذاتِ خود ایک اچھے شاعر ہیں، چین میں سفیرِ پاکستان کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اُن کے مدد اور کوشش کی بدولت بیجنگ کے سفارت خانہء پاکستان میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ساتھ ہی اُن کی مہربانی سے مشاعروں کا مستقل مہمان بن گیا"(21)

انتخاب عالم کے شعری سفر میں جن شخصیات نے انتخاب عالم کی معاونت کی ان میں درج بالا احباب کے علاوہ بھی مہربانوں کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں سے نمایاں نام احمد ندیم قاسمی، منصورہ احمد، عطاء

الحق قاسمی، نمل یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ اردو کے اساتذہ کرام، اکادمی ادبیات پاکستان سمیت اردو ادب کی خدمت پر معمور ادبی تنظیموں کے ساتھ ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن کا تعاون بھی شامل رہا۔ اردو زبان میں کسی غیر ملکی کو مکالمہ اور شاعری کرتے ہوئے دیکھنا بلاشبہ اہلِ پاکستان کے لیے ایک خوش گوار لمحہ ہوتا ہے۔ اِس خوشی کو اُس وقت چار چاند لگ جاتے ہیں جب اردو میں کلام کرنے والا فرد عظیم پڑوسی ملک عوامی جمہوریہ چین سے تعلق رکھتا ہو۔ مشاعروں میں انتخاب عالم کو ان کے کلام کے باعث بے پناہ پذیرائی ملتی اور ساتھ ہی ساتھ دوست ملک کے شہری ہونے کے باعث مزید احترام اور عزت کا مستحق سمجھا جاتا۔

اپنی اولین شعری تصنیف کو انہوں نے پاک چین دوستی سے منسوب کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چین اور پاکستان کی دوستی ایک بے مثال اور سدا بہار گلشن ہے جو ہر موسم میں نغمہ و خوشبوئے وفا بکھیرتا رہا ہے۔ انتخاب عالم کی اس تصنیف میں ان کی ۵۳ اردو غزلیں شامل ہیں۔ جب کہ پاکستان اور اہلِ پاکستان کے بارے میں بیس کے لگ بھگ نظمیں ہیں، ان میں سے چند نظموں کے نام "لاہور"، "نذرِ اقبال"، "فیض کے ساتھ سرگوشیاں"، "پہاڑی گاؤں کے مکانات"، "رات کی روشنیاں" اور "چنار کے درخت" نمایاں ہیں۔ اسی کتاب میں انتخاب عالم کی طبع زاد سات نظمیں بھی شامل ہیں۔

اس کتاب کی سب سے خاص بات وہ سترہ نظمیں ہیں، جنہیں بنیادی طور پر انتخاب عالم نے چینی زبان میں لکھی تھیں، مگر اردو زبان سے غیر معمولی وابستگی اور میلان کے باعث ان نظموں کو اردو زبان میں خود ہی ترجمہ کر کے منتقل کیا ہے۔ یقینی طور پر اردو زبان میں منتقل ہونے والے چینی ادب کے تراجم میں یہ نظمیں اس اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ ان کے تخلیق کار اور مترجم بیک وقت ایک ہی شخصیت ہیں۔ چینی نظموں کے اردو تراجم پر مشتمل اس حصے کو بازیافت کا نام دیا گیا ہے۔ چینی شاعری کی روایت کو آگے بڑھاتی ہوئی انتخاب عالم کی یہ نظمیں ایک ایسے تاثر سے بھرپور ہیں جو قاری کو جمالیاتی ذوق سے ہم آہنگ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان نظموں میں یوں تو ارضی مظاہر ہی کو پیش کیا گیا ہے لیکن فطری حسن، محبت، دوستی، جمادات، تاریخی عمارات اور زندہ دل دوستوں کا جس انداز میں ذکر کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چینی شاعری کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مابعد الطبعیاتی عناصر باوجوہ دکھائی نہیں دیتے۔ اس تصور سے

اختلاف کی بہر حال کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ انتخاب عالم کی یہ نظمیں بلاشبہ چینی شاعری کو سمجھنے میں اس لیے بھی بے حد مفید ہیں کہ ان کا ترجمہ بھی خود انہی کا کیا ہوا ہے۔

انتخاب عالم کی چینی نظمیں جو کہ اردو میں منتقل کی گئی ہیں، اِن میں سے اولین نظم کا عنوان "آئینہ" ہے۔ اس میں کمال خوب صورتی کے ساتھ آئینے کی خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہند اسلامی تہذیب میں آئینے کو تصوف کی اصطلاح کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم زیرِ غور نظم میں فاضل شاعر نے آئینے کی بے باکی اور حقیقت کو آشکار کرنے کی صلاحیت کو جس سادہ انداز میں پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی شے کو متعارف کروانے کے لیے سادہ انداز اور الفاظ بہت پُر اثر اور دیرپا ہوتے ہیں۔

"آبِ چشمہ کی طرح شفاف ہے تیری نظر
تیرا دل بلور سے بھی پاک ہے
گو بہت کمزور اور نازک ہے تُو
پر بہت بے باک ہے----
تو کبھی سچ کو سچ کہنے سے کتراتا نہیں
گو تجھے معلوم ہے
ہے صداقت کا صلہ انعام بھی دشنام بھی" (۲۲)

"برف باری" کے نام سے موسوم دوسری نظم میں موسمی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جس میں آسمان سے برف برسنے کے منظر کو ایک دل چسپ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ برف برسنے کا منظر اگر دل کو بھاتا ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں کچھ اسرار پوشیدہ ہیں۔ برف کی زمین پر بچھی ہوئی چادر دراصل پورے ماحول پر اپنا سحر طاری کر دیتی ہے۔ اس کے باعث اندھیرے میں بھی روشنی کا گمان ہوتا ہے۔ شاعر اس کیفیت کو انسانی غموں کو ختم کرنے کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ "ترسیلِ خط" نامی اگلی نظم بھی ایک ایسے معاملے سے متعلق ہے جس میں ایک خط کو مضمون بنایا گیا ہے۔ "سرمائی گل آلوچہ" نامی نظم میں موسمِ سرما کے ایک پھل کو زیرِ غور لایا گیا ہے۔ شاعر اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ گو کہ تیرا وجود ایک ننھا سا حجم رکھتا ہے ۔اس سے باغ کی رعنائی میں کوئی نمایاں فرق بھی پڑے گا، لیکن تیرے وجود کی خوشبو سے باغ کی رونقوں کا

چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اپنے موسم میں جب یہ پھل پک کر تیار ہوتا ہے، تو اس کی خوش بو سے ماحول پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو ہر ذی روح کو گرفت میں لے کر اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

"ثمرِ زمین کا پودا" ایک ایسی نظم میں جس میں چین کی سر زمین پر پائی جانے والی دو رنگوں کی مٹی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ شمالی چین کی مٹی پیلے رنگ کی ہے، جب کہ شمال مشرقی چین کی مٹی کالے رنگ کی ہے۔ ان رنگوں کی مٹی کی اپنی اپنی خصوصیت ہے۔ ایک ننھے پودے کے دورِ حیات کو پیش کرتے ہوئے شاعر خودداری کا درس دے رہا ہے۔ ایک معمولی سا پودا مٹی کی مضبوطی اور جڑوں کے بل بوتے پر اپنے عروج کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وہ کسی مصنوعی یا عارضی سہارے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا ہے۔ گویا کہ انسان کو اس نظم میں یہ پیغام مل رہا ہے کہ وہ بھی ترقی کے سفر میں اپنی صلاحیتوں کے درست استعمال کو یقینی بنائے اور اپنے مقصدِ حیات کو تلاش کرتے ہوئے آگے سے آگے بڑھتا رہے۔ "جادۂ گلشن" نامی نظم میں بھی زرد مٹی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حاشیے میں فاضل شاعر اور مترجم نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:-

> "زرد مٹی کی سطح مرتفع اور دریائے زرد چینی تہذیب و ثقافت کے گہوارے ہیں۔ چینی قوم کا تعلق زرد فام نسل سے ہے اور چینی قبائلی سربراہ کو "زرد شہنشاہ" کہا جاتا ہے۔ اس لئے زرد رنگ روایتا" چین کا قومی رنگ ہے اور زرد مٹی چین کی ایک طرح کی علامت ہے۔"(23)

"سبزیوں کے آزاد بازار کی سیر" بھی ایک اہم اور فکر انگیز نظم ہے، جس میں چین کے ایسے بازار کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ملک کے کسی بھی کونے سے کوئی بھی شہری اپنی پیدا کی ہوئی اجناس لا کر فروخت کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ عمومی طور پر یہاں کسانوں کو ہی اپنی زرعی اجناس بیچتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ کسانوں کے نوجوان بیٹے اپنے سامان کی جلد فروخت کے لیے گاہگوں کو عزت و احترام سے مخاطب کرتے ہیں۔ شاعر اس منظر سے محظوظ ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ یوں تو بازاروں میں ہر شے کی بہتات ہوتی ہے، مگر انسانی اقدار کی قلت ہونے کے سبب یہاں نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے۔ اس عام سے بازار کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ یہاں پر اس شے کی افراط ہے جو عام بازاروں میں مفقود دکھائی نہیں دیتی ہے۔ "بیر کا درخت" بھی انتخاب عالم کی ایک خوب صورت نظم ہے جس میں بیر کے درخت کے احساسات کو بیان کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا

درخت ہے جو اپنے پھل کی وجہ سے لوگوں کی سنگ زنی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی شاخوں پر کانٹوں کی صورت میں ہتھیار بھی قدرت نے فراہم کر دیئے ہیں مگر وہ ان ہتھیاروں کو بھی اس سنگ باری سے بچانے سے محروم ہے۔ اس عظیم درخت کو اپنے میٹھے پھل کے باعث انسانوں کے سخت رویئے کا سامنا ہے۔ بادی النظر میں انسان کو یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ اسی درخت کا کنکر مارے جاتے ہیں جس کی شاخوں پر پھل ہوتے ہیں۔ جن درختوں کی شاخیں ثمر آور نہیں ہوتیں، انہیں کوئی ذی روح کنکر نہیں مارتا۔ گویا جس انسان کے اندر کچھ ہوگا تو اسے ہی مخالفتوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک ثمر آور پھل دار درخت کی مانند اُس انسان کو بھی جھک کر زندگی کے سفر پر گامزن رہنا چاہیے۔ "بند درِ چمن پر" میں بھی جو حقیقت آشکار کی گئی ہے اس کے مطابق انسان کا کام یہی ہے کہ اپنی بساط کے مطابق محنت کیے جائے۔ اس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ کسی نہ کسی صورت میں انسان کو اس کی محنت کا صلہ مل ہی جاتا ہے۔ دنیا کی لاکھ ستم ظریفانہ روش کے باوجود انسان آخر کار کامیابی سے ہم کنار ہو ہی جاتا ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ فطرت خود کلام کرتی ہے۔ انتخاب عالم کی نظم "شامِ بہاراں" اس حقیقت کی واضح ترجمانی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ایک باغ کا منظر پیش کیا گیا ہے، جہاں بید مجنوں، آڑو اور خوبانی کے درخت اور ان پر ان کے خوش نما پھول، معصوم اور ننھی چڑیاں خوشی و مسرت کے گیت گا گا کر باغ کی رونق کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ ایسے میں آسمانِ دنیا پر چمکتا ہوا چاند سونے پہ سہاگہ کا کام کر رہا ہے۔ وہ مختلف درختوں کی شاخوں میں کبھی گم ہو جاتا ہے اور کبھی پھر سامنے آ جاتا ہے۔ یوں ایک ایسی محفل کی صورت بن جاتی ہے جس میں کبھی محبوب کے رخ کا دیدار ہوتا ہے تو کبھی انتظار کی سولی پہ لٹک کر وقت کے پہیے کو رواں رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چینی تہذیب میں پھل دار درختوں میں سے آڑو کا درخت بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ایس ایم حالی اپنی کتاب "چینی ثقافت کے تابندہ نقوش" میں لکھتے ہیں:-

> "چینی روایت میں آڑو لمبے سفر کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے کھانے سے عمر دراز ہوتی ہے۔ عوام اپنی سالگرہ کی دعوت میں آڑو سے بنے کھانے ضرور استعمال کرتے ہیں تاکہ لمبی عمر پائیں۔ آڑو کے موسم میں تازہ پھل استعمال ہوتے ہیں اور جب اس کا

موسم نہ ہو تو آٹے سے خوبصورت آڑو بنائے جاتے ہیں تا کہ یہ روایت بر قرار رہے۔

۔۔اسے "شوشوٹو" کہتے ہیں۔"(۲۴)

انتخاب عالم کی نظموں میں "پتنگ "نامی نظم ایک گہری معنویت اور تہذیبی تنوع کی حامل ہے۔یوں تو اس سادہ سی نظم میں ایک پتنگ کی مثال دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح ایک پتنگ کی ڈور جس بچے کے ہاتھ میں ہوتی ہے،اسی طرح ایک بچے کی زندگی کی ڈور اس کے والدین کے ہاتھ میں بندھی ہوتی ہے۔ایک پتنگ چاہے جتنی بھی دور ہوا میں اڑتی جائے، یقینی طور پر ان ہاتھوں کی گرفت میں ہوتی ہے جو اسے اُڑا رہے ہوتے ہیں۔جب تک وہ پتنگ خود کو اپنے اُڑانے والے کے ساتھ ہم آہنگ رکھے گی، خوب صورتی سے آسمان پر اُڑتی رہے گی۔

در حقیقت پتنگ بازی چین میں ایک مقبول تفریح کے طور پر رائج ہے۔ چینی قوم میں چھنگ منگ تہوار (چنمگ فیسٹیول) ہر سال اپریل کی پانچ تاریخ کو بہت ہی جوش و جذبے سے منایا جاتا ہے۔کتاب "چینی شناسی" کے مطابق اس دن خاندان کے آنجہانی بزرگوں کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے، ان کی قبروں کی صفائی ستھرائی کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ قومی شہداء کی قبور پر پھول چڑھا کر ان کی قربانیوں کو یاد کیا جاتا ہے۔لوگ صبح سویرے بیدار ہو کر قبرستانوں کا رُخ کرتے ہیں اور صفائی کے بعد قبروں پر پھول، نقلی کرنسی نوٹ، اگربتیاں اور کھانے پینے کی چیزیں قبروں کے سرہانے پر رکھ دیتے ہیں۔(۲۵)

اس تہوار کی ایک اہم سرگرمی پتنگ بازی بھی ہے۔ یہاں کی پتنگ بازی کسی بھی قسم کے ناگہانی حادثات کا باعث بننے سے محفوظ ہوتی ہے۔چھنگ منگ تہوار کو موسم کے ساتھ بھی ایک گہرا تعلق ہے۔اس موسم میں ہوا کا رخ اوپر کی جانب زیادہ ہوتا ہے اس لیے پتنگ کو زیادہ بلندی پر لے جانے میں مدد میسر ہوتی ہے۔یوں اس تہوار میں لوگ ایسی پتنگیں خصوصی طور پر تیار کرواتے ہیں جو زیادہ بلندی پر جا سکیں۔ اس دلچسپ کھیل کے ساتھ کچھ عقائد بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔اس بارے میں ایس ایم حالی لکھتے ہیں:-

"عام چینی عقیدہ یہ ہے کہ اگر پتنگ کی ڈور کاٹ دی جائے اور اسے آزاد فضا میں پرواز کی خاطر چھوڑ دیا جائے تو وہ آپ کی پریشانیاں، ذہنی و جسمانی بیماریوں کو آپ سے دور لے کر چلی جائے گی اور آپ کے لیے خوش قسمتی چھوڑ جائے گی۔" (۲۶)

انتخاب عالم کی یہ نظم تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ اس کے ذریعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ دوسری تہذیب کے تہواروں اور سرگرمیوں سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں پتنگ بازی ایک جان لیوا خونی کھیل کے طور رائج ہے۔ ہر سال دھاتی ڈور کے استعمال سے ہزاروں افراد کی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ سینکڑوں گھروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ بجلی کے ترسیلی نظام میں بارہا مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملک و قوم کو بڑا معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس سرگرمی کو ہمسایہ ملک کی حکمتِ عملی سے استفادہ کرتے ہوئے منظم کیا جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایک صاف ستھری تفریحی سرگرمی سے نہ صرف عوامی حلقے محظوظ ہوں گے بلکہ قومی معیشت پر بھی دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

"بیجنگ میں اور پاس پُلوں کا جنگل"، "دیوارِ چین کی سیر" اور "لونگ چھینگ گھاٹی کی سیر" کے ناموں سے شامل نظمیں بنیادی طور پر فاضل شاعر کے گہرے تفکر اور فطرت سے بے پناہ وابستگی کی غمازی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اول الذکر نظم میں چینی دارالحکومت میں نت نئی تعمیرات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال پر بہت ہی معنی خیز انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔ فطرت کے مظاہر کو ختم کر کے سڑکوں کا ایک جنگل پیدا ہو جانے سے انسانوں کو فطرت سے دیرینہ تعلق قائم کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ صنعتی ترقی بلاشبہ کسی بھی قوم کے لیے از حد ضروری ہے لیکن صنعتوں کی اس انداز سے بڑھوتری جو ماحولیاتی تنوع کے لیے مضر ہو، بلاشبہ انسانوں کے لیے بے پناہ مسائل کا باعث بنتی ہے۔ تاہم "دیوارِ چین کی سیر" نامی نظم ایک شان دار شعری مرقع ہے۔ پوری نظم ہی ایسی ہے کہ جس میں ہر مصرعہ اپنی مثال آپ ہے۔ شاعر دیوار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے خود کو کسی آسمانی سیڑھی پر محسوس کرتا ہے اور اس دیوار پر بنے پُلوں کو آسمان سے ملانے والا پُل سمجھتے ہوئے اپنے تفکر کو آسمان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ عظیم دیوارِ چین کی تعمیر انسانی تہذیب کے اُن اولین نقوش میں ایک ہے جو آج بھی انسان کے لیے باعثِ فخر ہے۔ شاعر اس کی چوٹی پر پہنچ کر یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ انسانیت کی تہذیب و ثقافت کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکا ہو۔ دیوار میں موجود اینٹوں کو شاعر نے لفظوں سے تعبیر کیا ہے اور اس میں مختلف فاصلے پر قائم چوکیوں کو مجسم رزمیہ کے طور پیش کیا ہے۔

"گلبانگِ وفا" میں انتخاب عالم کی آخری ترجمہ شدہ نظم "رشتۂ ازدواج کی دیوی" کے نام سے ہے۔ اس نظم کا پس منظر بے حد دلچسپ اور منفرد ہے۔ چینی ٹیلی ویژن پر شادی کے خواہش مند مرد و خواتین کے لیے ایک پروگرام نشر ہوتا ہے۔ اس میں بذریعہ ٹیلی فون روابط قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ ہزاروں افراد نے اس پروگرام سے جڑ کر اپنے گھروں کو آباد کیا۔ فاضل شاعر اس پروگرام کی خاتون میزبان کے بارے میں یہ نظم لکھتے ہیں۔ دراصل اس خاتون کو لوگوں کے درمیان رشتہ قائم کروانے کا وسیلہ ہونے کے سبب عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خاتون کی معصومیت اور خوب صورتی کے سبب، بعض لوگ "رشتۂ ازدواج کی دیوی" کے نام سے یاد رکھتے ہیں۔ اس خاتون کے بارے میں شاعر کا کہنا ہے کہ یہ ٹیلی ویژن کی سکرین پر جس انداز سے نمودار ہوتی ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے یہ پرستان سے آئی ہوئی کوئی پری ہے۔ شاعر اُسے ایک خاص دہقان قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ محبت کے بیج بوتی ہے اور اس محبت کی کھیتی سے ایسی نسل پیدا ہوتی ہے جو انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔

اس نظم میں پیش کیے گئے تصور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انسانوں کی بقاء کی ضمانت اسی میں ہے کہ وہ آنے والے نسلوں کی بہتر تربیت کریں۔ یہ فریضہ اسی صورت پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے جب ان کے والدین کے مابین محبت و الفت کا رشتہ ہو گا۔ خاندانی نظام کی مضبوطی اسی صورت ممکن ہے جب مرد و عورت کو آزادی سے اپنے جیون ساتھی کے انتخاب کا موقع فراہم کیا جائے۔ فی زمانہ معاشی میدان میں ہونے والی ترقی کسی قوم کو اسی وقت فائدہ فراہم کر سکتی ہے جب وہ خاندانی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرئے۔ چینی تہذیب میں بھی شادی کے موقع پر خصوصی رسومات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یوں اس نظم سے اس حقیقت کی نقاب کشائی ہوتی ہے کہ سماجی بقاء کا دار و مدار شادی جیسے اہم عمل سے وابستہ ہے۔

ج۔ "غم کے محاذ پر" از ڈاکٹر عابد سیال

معروف چینی ادیب چھوُیو آن کی شہرہ آفاق نظم "لی ساؤ" ادبیاتِ چین میں منفرد مقام کی حامل ہے۔ اسے طویل ترین چینی نظم ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ یوں تو چھوُیو آن کو عوامی جمہوریہ چین میں محبِ وطن اور عظیم شاعر کے طور پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ انہیں چینی عوام ایک قومی شخصیت کے طور پر بھی یاد رکھتی ہے۔ بنیادی طور پر چھویو آن کا دور حیات ۳۴۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے

جو ان کی ناگہانی وفات ۲۷۸ قبل مسیح تک محیط ہے۔ محققین کا ماننا ہے ہے کہ چھویو آن ایک مدبر منتظم اور خدا ترس انسان تھا۔ اپنی علمی قابلیت اور انسان دوستی کے باعث انہیں اپنی ریاست میں وزیر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس دوران انہوں نے عوامی خدمت کے ایسے امور سرانجام دیئے کہ اپنی قوم کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ ملک کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے شہنشاہ کی جانب سے انہیں تجاویز مرتب کرنے کا اہم کام سونپا گیا۔ اس کام کی تکمیل کرتے ہوئے چھویو آن نے اہم دفاعی امور کو منظم کرنے سمیت مفید تجاویز دیں۔ بدقسمتی سے اس کی تجاویز پر عمل درآمد کرنے کے بجائے امراء نے اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محلاتی سازشوں کے باعث حاکمِ وقت کے عتاب کا شکار ہو کر چھویو آن خود ساختہ جلاوطنی پر مجبور ہو گئے، تاہم قوم کی خدمت کا غم ان کے دل و جان میں رچا بسا تھا۔ اپنی زندگی میں ظلم کا ساتھ نہ دینے کی پاداش میں انہیں اپنا احتجاج اس طور سے کرنا پڑا کہ خود اپنے ہی جان کی قربانی دینی پڑی۔ دفاعی امور میں ان کی تجاویز پر عمل نہ کرنے کے باعث فوجی طاقت کی کمزوریوں کو بھانپ کر پڑوسی ریاست کے بادشاہ نے حملہ کیا جس سے ریاست کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ملک کو اس نازک مرحلے سے گزرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے خون کے آنسو بہائے۔ آخر کار ایک کشتی میں سوار ہوئے اور گہرے پانی میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ "چین کا بدلتا سماج" کے مصنفین نے چھویو آن کا تعارف کرواتے ہوئے انہیں ان الفاظ میں یاد کیا ہے:-

> "عظیم وطن دوست شاعر چویو آن ۔۔۔ اگرچہ شاہی خاندان کا ایک فرد تھا لیکن اس نے چو کی بددیانت حکومت کی بڑی ثابت قدمی کے ساتھ مخالفت کی۔ اس کی لافانی نظم لی ساؤ یعنی "مصیبت میں پھنسا ہوا" جو تین سو ستر مصرعوں پر مشتمل ہے، وطن کے لیے اس کی محبت اور اپنے ہم وطنوں کے لیے ہمدردی کا بہت عمدہ اظہار ہے جس میں بادشاہ کی حماقت اور بدطینت وزیروں کی غداری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔"(۲۷)

چینی قوم اپنے عظیم شاعر کی اس قربانی کو، صدیاں گزر جانے کے باوجود، یاد رکھے ہوئے ہے۔ ہر سال چینی تقویم کے پانچویں مہینے کی پانچ تاریخ کو ڈریگن بوٹ فیسٹول کے نام سے ایک رنگارنگ تہوار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس تہوار کے موقع پر چینی قوم اپنے عظیم ہیرو کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مختلف

تقاریب کا انعقاد کرتی ہے۔ دریا میں اس نیت سے مچھلیوں کو کھانا ڈالا جاتا ہے تاکہ یہ چھویو آن کے جسم کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس تہوار کی مناسبت سے خصوصی طور پر کشتیاں بھی تیار کی جاتی ہیں۔ اس کشتیوں کے سرے پر اژدھے کی شکل بنائی جاتی ہے۔ چھویو آن کی یاد میں منائے جانے والے اس فیسٹول کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ایک مخصوص مٹھائی بہت ہی جوش و خروش سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کا نام "زونگ زی" ہے۔ اس کی تیاری میں چاولوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ (۲۸)

چھویو آن کی ادبی خدمات میں سب سے نمایاں ترین ان کی شہرہ آفاق نظم "لی ساؤ" ہے۔ اس کے علاوہ بھی اُن کی نظمیں موجود ہیں، تاہم "لی ساؤ" کی بدولت انہیں ادبیاتِ چین میں اہم مقام حاصل ہوا۔ اس نظم کے اب تک اردو زبان میں تین تراجم ہو چکے ہیں۔ اولین ترجمہ یحییٰ امجد نے کیا ہے، جو اُن کی کتاب "چینی شاعری" میں شامل ہے۔ چینی شعری ادب کے اسرار و رموز سے واقفیت دلانے والی یہ اولین اردو کتاب سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں چھویو آن کی نظم کا ترجمہ "نوحہ" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے بعد دوسرا ایڈیشن شائع نہ ہوا، جس کے باعث اس تک رسائی دشوار ہے۔

چھویو آن کی شہرہ آفاق نظم کے بقیہ دونوں اُردو تراجم ڈاکٹر عابد حسین سیال نے کیے ہیں۔ اولین ترجمے کا ڈرافٹ ۲۰۰۶ء میں مکمل ہو گیا تھا، جسے اکادمی ادبیات پاکستان کی سرپرستی میں چھپنے والی کتاب "چین کا ادب: عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب" میں شائع کیا گیا۔ یہ ترجمہ بنیادی طور پر انگریزی زبان سے اردو زبان میں منتقل ہوا۔ بعد ازاں فاضل مترجم کو جب بنفسِ نفیس عوامی جمہوریہ چین میں درس و تدریس کی غرض سے قیام کرنا پڑا تو اس دوران انہوں نے اس ترجمے پر نظرِ ثانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب کی بار اس کاوش میں اُن کی معاونت کے لیے بیک وقت چینی و اردو زبان میں مہارت رکھنے والی شخصیات کا تعاون میسر رہا۔ یوں یہ ترجمہ اس اعتبار سے زیادہ موثر اور بہتر ہے کہ اسے براہ راست کلاسیکی چینی ادب سے وابستہ ماہرین کی معاونت میں اصل متن کی روشنی میں اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ ۲۰۲۱ء میں شہرہ آفاق تاریخی نظم "لی ساؤ" کا ترجمہ "غم کے محاذ پر" کے نام سے شائع ہوا۔ اس ترجمے کے عنوان کے بارے میں فاضل مترجم کا کہنا ہے:-

"انگریزی میں "لی ساؤ" کے کئی ایک لغوی مترادفات ہیں جن میں زیادہ معروف Encountering Sorrow ہے۔اسی طرح اردو متبادلات بھی متعدد ہو سکتے ہیں جن میں مہجوری کا غم، جدائی کا غم، غم کی گرفت میں، غم کی زد میں، وغیرہ ہیں۔ لیکن آفتاب اقبال شمیم کے ذہنِ رسا نے "غم کے محاذ" پر تجویز کیا جو نہ صرف معنی کی تہہ داری کا حامل ہے بلکہ شعری جمالیات کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔"(۲۹)

یہ نظم در حقیقت ایسے درد کا اظہار ہے جو ایک محبِ وطن انسان کو درپیش تھا۔ چینی ادب پر نگاہ رکھنے والا ہر طالب علم اس نظم سے واقف ہے۔ گو کہ اس نظم میں رومانوی محبت کے روایتی مضامین کا بیان نہیں ہے تاہم انسانی سماج کو درپیش مسائل کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ پروفیسر چانگ شی شوان اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"لی ساؤ" کو چینی زبان کی تاریخِ ادب میں پہلے سنگِ میل کا مقام حاصل ہے۔اس نے چینی شاعری کو اپنے پہلے عروج سے روشناس کرایا تھا۔ حقیقت پسندی اور رومانیت کے امتزاج کی حامل یہ نظم، سیاسی غنائی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔"لی ساؤ" کے بعد اس جیسی نظم نہیں لکھی گئی۔" (۳۰)

بنیادی طور پر "لی ساؤ" ایک مسلسل نظم ہے۔ چھویو آن نے اسے مختلف بندوں میں تقسیم کرنے کے التزام سے مبرا رکھا ہے، تاہم ماہرین نے اس کے متن کی بنیاد پر اسے آٹھ بندوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا بند ابتدائی چوبیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا بند پچیسویں بند سے شروع ہو کر اڑتالیسویں بند تک محیط ہے۔ تیسرا بند انچاسویں بند سے شروع ہو کر ایک سو چوتھے مصرعے تک پھیلا ہوا ہے۔ چوتھا بند ایک سو پانچویں مصرعے سے لے کر ایک سو اٹھائیسویں مصرعے تک ہے۔ پانچواں بند ایک سو انتیسویں مصرعے سے ایک سو اسی تک محیط ہے۔ چھٹا بند ایک سو اکیاسی ویں مصرعے سے دو سو چھپن ویں مصرعے تک ہے۔ ساتواں بند دو سو ستانوے ویں مصرعے سے تین سو بتیسویں مصرعے تک ہے۔ آخری بند تین سو تینتیسویں مصرعے سے تین سو اڑسٹھویں مصرعے تک ہے۔ فاضل مترجم ڈاکٹر عابد حسین سیال اس بارے میں لکھتے ہیں:-

"تین سو تہتر (373) مصرعوں پر مشتمل اس نظم میں ۲۴۹۰ تصویری اشکال جنھیں جدید دور میں کریکٹر کہا جاتا ہے، استعمال ہوئی ہیں۔ چینی نظمیں مختصر ہوتی ہیں اور عام

طور پر آٹھ دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ سے بیس مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس طوالت کے باعث بعض روایتوں میں اسے چینی کلاسیکی شاعری کی طویل ترین نظم قرار دیا جاتا ہے۔ غیر معمولی طوالت اور موضوع کے اعتبار سے اسے چینی رزمیہ بھی کہا جاتا ہے، اگرچہ اس میں اس طرح کے عناصر موجود نہیں جو دنیا کے عظیم رزمیہ ادب میں ملتے ہیں۔"(۳۱)

پروفیسر لیو لیو شیونگ کا خیال ہے کہ چھو یو آن کی یہ نظم ایک قسم کی نئی شاعری ہے جو چین میں برسرِ پیکار ریاستوں کے دور میں جنوبی چین کی چھو نامی ریاست میں تخلیق ہوئی۔ وہ اسے بیک وقت سیاسی اور سوانحی نظم خیال کرتے ہوئے اسے باطل قوتوں کے خلاف مزاحمت اور عدل کے قیام کے لیے ایک استعارے کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ لی ساؤ درحقیقت ایک محبِ وطن شخص کا اپنی سرزمین کے ساتھ والہانہ اور بے غرض تعلق کی غماز ہے۔ تاہم ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی کا اس بارے میں جداگانہ موقف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"چار سطروں والی نظم جو "چوئہہ چو" کہلاتی ہے، اس کے لغوی معنی ہیں 'ٹوٹی ہوئی سطریں'۔ تکنیک کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی قریب ترین اردو یا فارسی اصطلاح 'رباعی' ہے۔ فارسی رباعی جس کا سفر غالباً "رودکی سے شروع ہو کر خیام کی تخلیقات میں نقطہ ارتکاز کو پہنچتا ہے۔ تھانگ عہد اور اس کے بعد ہزاروں برس کی چوئہہ چو سے حد درجہ مماثلت رکھتی ہے۔ یہ مماثلت محض سطور کی قیود میں ہی نہیں بلکہ قافیہ کے استعمال میں بھی ہے۔"(۳۲)

اردو ادب میں مزاحمتی ادب کا ایک باقاعدہ دبستان موجود ہے، جس میں تخلیق کار اپنے دور کی استعماری اور سامراجی قوتوں کے خلاف اپنے الفاظ سے برسرِ پیکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس روایت میں جو ادب تخلیق ہوا، اُن میں سے چند ادب پاروں کو ادبِ عالیہ کی فہرست میں بھی رکھا جاتا ہے۔ تاہم چینی ادب کا یہ فن پارہ اپنی معنوی سطح پر مزاحمتی ادب کے تقاضوں پر کماحقہ پورا اترنے کے بجائے جزوی طور پر، اس کے قریب دکھائی دیتا ہے۔ چھو یو آن کی زندگی کا پورا فلسفہ گو کہ ظالمانہ نظام کے خلاف متبادل نظام کے قیام سے عبارت تھا، مگر اس جدوجہد میں وہ تنِ تنہا اپنے محاذ پر ڈٹے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے بیانئے کو عام کرنے کے لیے کسی

اجتماعیت کے قیام کی جانب کوئی اشارہ نہیں دیتے۔ دریا میں کشتی کے سفر پر نکلتے ہوئے وہ ملاح سے جن امور پر کلام کرتے ہیں، اُن سے بھی یہی شہادت میسر آتی ہے کہ وہ سخت بد دلی اور نااُمیدی کا شکار ہو کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔

ہند اسلامی تہذیب اور چینی تہذیب کے مابین کئی ایک اقدار مشترک ہیں۔ چھویو آن کی اس نظم سے دونوں تہذیبوں کے مابین بہت سے مشترکہ امور کی نشان دہی ہوتی ہے۔ فاضل شاعر نے نظم کے ابتدائی اشعار میں اپنے خاندانی پس منظر اور حسب نسب کے بارے میں معلومات فراہم کیں ہیں۔ بعد ازاں اپنی ابتدائی زندگی کے ان واقعات کا اجمالی تذکرہ کیا ہے جو ان کی شخصیت کے بارے میں مفید فراہم کرتا ہے۔ چین میں ایک قدیم روایت موجود ہے، جس کے تحت معزز خاندان اپنے آراکین کے ناموں کو اس انداز سے ترتیب دیتے ہیں، جس میں دو ناموں کو جوڑ کر ملایا جاتا ہے۔ اس میں سے پہلا حصہ اس فرد کا ذاتی نام ہوتا ہے جب کہ دوسرا حصہ اس فرد کے خاندانی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ پاکستانی سماج میں بھی عمومی طور پر ناموں کی ترتیب اس کے قریب قریب ہے۔ اس قدرِ اشتراک کی بدولت دونوں اقوام کے مابین ہم آہنگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نظم کی ابتداء میں ہی فاضل شاعر نے دلکش انداز میں اپنے خاندانی پس منظر اور بزرگوں کا تعارف کروایا ہے، جس میں اپنے باپ دادا کی شرافت اور اپنے پیدائش کے وقت کو علمِ نجوم کے ساتھ ہم آہنگ کر کے بیان کیا ہے۔ اپنی خاندانی اور ذاتی نام کے بارے میں فاضل شاعر کا کہنا ہے:-

"میں چشم و چراغ ہوں
اپنے جدِ امجد کاؤ یانگ کے گھرانے کا
اور پویونگ نام تھا
میرے والد کا
جب سیارہ زُحل ین کے بُرج میں آیا
کنگ ین کے سال
اس سال کے پہلے چاند میں
میں نے دنیا میں قدم رکھا(۳۳)

چھویو آن اپنے ظاہری اوصاف کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ پیدائش کے وقت ہی سے حسن و جمال کا مرقع تھا۔ اس کی شکل و صورت وجیہ اور جاذبِ نظر تھی۔ اسی طرح اس کے باطنی اوصاف بھی حد درجہ مثالی تھے۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، دوسروں کا خیال اور سب کے لیے بھلائی کے جذبات اس کی سرشت میں شامل تھے۔ تاہم حیران کن طور پر نظم کے ابتدائی اشعار میں ہی اپنی اپنی منزل تک نہ پہنچنے کے اندیشے کا اظہار بھی ملتا ہے۔ اپنی منزل کو کھودینے اور وقت کے ہاتھ نہ آنے کے خوف سے خود کو مسلسل جدوجہد میں رکھنے پر تیار دکھائی دیتے ہیں۔

"لی ساؤ" میں جابجا مظاہرِ فطرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان مظاہر میں جنگل، پہاڑ، پودے اور درختوں وغیرہ کا ذکر از حد نمایاں ہے۔ ان اشیاء کو بیان کرتے ہوئے سادگی اور بے ساختگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چینی سرزمین کے درختوں، دریاؤں، جھیلوں اور پہاڑوں کا ذکر کرتے ہوئے ان میں جس اپنائیت کا احساس دلایا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ یقینی طور پر اسی محبت کا اثر ہے جو ارضِ وطن پر نااہل حکومت کے وجود پر شاعر کو ہر لمحہ تڑپاتی ہے۔ شاعر اپنے بچپن کی ان یادوں کا دہراتا ہے جب وہ ایک معصوم ذہن کے ساتھ قدرت کی رعنائیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اپنے بچپن کے خوب صورت دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

صبحیں گزری پہاڑوں میں
درختوں کے خوب صورت پھول چنتے
شامیں بتائیں دریاؤں کے کنارے
سدا بہار گھاس سومانگ کی پتیاں اکٹھی کرتے (۳۴)

شاعر کا ذہن خوب صورتی کے مرقع دیکھ کر ان میں چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان مظاہر کی رنگارنگی اور تازگی کو دیکھ کر اس حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب دکھائی دیتا ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی مظاہر ہیں، سب کے سب عارضی اور وقتی ہیں۔ کوئی بھی عنصر دائمی نہیں ہے۔ حُسن، شباب، بہار، خوش حالی، تازگی، دُکھ، تکلیف، تنگ دستی سمیت ہر مثبت و منفی جذبہ ایک مخصوص مدت تک ہی اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ زندگی میں کوئی بھی دور ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ وقت کا کوئی بھی لحظہ ہمیشہ ایک جیسا

نہیں رہتا۔ اس لیے چھویو آن اپنے دور کے انسانوں کو ایک آفاقی سبق دے رہا ہے کہ وقت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لو، تاکہ تمہیں کامیابی مل سکے۔ انسان کو قدرت کی جانب سے جو صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں، انہیں بروئے کار لا کر اپنی زندگی کو بہتر سے بہترین بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ فاضل شاعر نے چینی تاریخ کے ان بادشاہوں کا ذکر کیا جنھوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی اور تاریخ میں عبرت کا نشان بن کر رہ گئے، جب کہ اس کے برعکس ایسے تاریخی حکمرانوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جنھوں نے راست بازی اور انسان دوستی کے جذبے کو مقدم رکھا، اپنی رعایا کے آرام کا خیال رکھا۔ آج انہیں دنیا عزت و احترام سے یاد کرتی ہے۔ تاریخ میں اچھے اور بُرے کردار کے حامل حکمرانوں کی مثالیں دیتے ہوئے چھویو آن اپنی ریاست کے حاکم کے بارے میں سخت تشویش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ بادشاہ اپنے نااہل مشیروں کے بدنیتی پر مبنی مشوروں کے باعث وہ غلط روش پر چل پڑا تھا۔

میں بھاگتا رہتا ہوں
اپنے بادشاہ کے آگے پیچھے
تاکہ وہ گامزن رہے
اگلے بادشاہوں کے نقشِ قدم پر
لیکن ناکام رہا میرا آقا
میرے باطنی احساسات کے سمجھنے میں
بلکہ وہ غصے میں مجھ پر برسا
خوشامدیوں کی چغل خوری سُن کر
حق بات کہنا نقصان دہ ہے
میں خوب سمجھتا ہوں
لیکن چھپ نہیں رہنے دیتی مجھے
میری وفاداری (۳۵)

شاعر کا خیال ہے کہ جب انسان کوئی کام کرے تو اس کا نتیجہ پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ وہ ایک مثال دے کر اس بات کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب ایک کسان کسی کھیت میں محنت و مشقت کر کے اپنا خونِ جگر شامل

کرتا ہے تو اس میں بہار آنا لازمی امر ہے۔ تاہم شومئ قسمت میں موسمی تغیر و تبدل سے کسی قسم کا نقصان ہوتا ہے تو اس بات کا کسان کو زیادہ رنج نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات زیادہ دردناک ہوتی ہے کہ کوئی باغ عدم توجہی کے باعث اجڑ کر برباد ہو جائے۔ زمانے کی روش کا ذکر کرتے ہوئے چھویو آن کہتا ہے کہ انسان اس سبب خسارے میں ہے کہ وہ اپنے لالچ میں آکر ناجائز ذرائع سے رزق کا متمنی ہے۔ وہ اس بات پر چنداں غور نہیں کرتا کہ جس جگہ سے وہ رزق کما رہا ہے وہ درست بھی یا نہیں۔ بس ایک خواہش کی پیروی میں لگ کر زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی دوڑ میں سبقت لے جانے کو کوشش ہے۔

"لی ساؤ" میں کرداروں کا معاملہ بہت ہی منفرد ہے۔ عمومی معنوں میں ایسے کسی مرکزی کردار کا وجود نہیں ہے جو شعری تخلیقات میں موجود ہوتا ہے۔ کرداروں میں سب سے نمایاں خود شاعر کا اپنا کردار ہے۔ چھویو آن کی ہمشیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے، جو اسے مختلف اوقات میں مصلحت کے مشورے بھی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ چند تاریخی شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان میں پھنگ شیان کا نام نمایاں ہے۔ یہ شخصیت چینی تاریخ میں شانگ عہد میں ایک اہم سرکاری منصب پر فائز تھی۔ اپنی نیک نیتی اور عوامی خدمت کے باعث مقتدر طبقہ کی نظروں میں آگئے۔ ان کی صلاحیتوں سے خائف عناصر نے حاکمِ وقت کا گھیراؤ کر لیا اور اس کے بارے میں بے بنیاد معلومات کی بناء پر شاہی غیض و غضب کا شکار کر دیا۔ ان کی زندگی کا خاتمہ بھی سخت کس ما پرسی کی کیفیت میں ہوا۔ اس تاریخی نظم کے اختتام پر بھی اسی شخصیت کا تذکرہ ملتا ہے۔

فریب کے ماحول کو بدلنے کا جذبہ ہر دم شاعر کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ابن الوقت قسم کے لوگوں کے بنائے ہوئے اس دجل پر مبنی نظام کو ملیامیٹ کرتے ہوئے تہہ و بالا کر دے۔ اس عظیم جدوجہد میں وہ جان کی قربانی پیش کرنے کے لیے بھی تیار دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین چھویو آن کے سماج کی کیفیت کا جن الفاظ میں تجزیہ کرتے ہیں، ان سے بجا طور پر ان حالات کی غمازی ہوتی ہے، جو اس زمانے میں درپیش تھے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "چھویو آن اپنے آقا اور اس کے مصاحبین کی بے حسی پر مایوسی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک اور قابلِ توجہ نکتہ اس کا جمود اور ٹھہراؤ، جسے معاصر سیاسی اصطلاح میں 'اسٹیٹس کو' کہا جا سکتا ہے، کی مخالفت ہے۔ حکمرانوں کی بے حسی اور عوام

کی حالتِ راز سے لاپرواہی اس کے لیے سیاسی نعرے کے بجائے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"(۳۶)

تاہم ایک وقت میں شاعر کے دل و دماغ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ وہ حالات کے جبر سے دلبرداشتہ ہو کر مایوسی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ اس موقع پر اسے اُن لوگوں کی باتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں جنہوں نے اسے اس راہ پر چلنے سے روکا تھا۔ انہی لوگوں میں اس کی اپنی حقیقی ہمشیرہ بھی شامل تھی۔ اس کی بہن اس حقیقت سے بہرہ ور تھی کہ سماجی برائیوں کا خاتمہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس راہ میں پہاڑوں جیسے بلند جذبے اور سمندروں جیسی وسعتِ قلبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج دشمن عناصر ایسے لوگوں کی ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ چھویو آن کو بھی اس بات کا خدشہ لاحق ہے کہ وہ تنِ تنہا اس ظالمانہ طاقت کے سامنے کیسے کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ یوں وہ ایک لمحے کے لیے مایوسی کی دلدل میں پھنس کر پسپائی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:-

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے غفلت کی
راستے کے انتخاب میں
اس لیے اب مجھے تامل ہے
کہ پرانی راہ پر لوٹ جاؤں
سو میں نے موڑ لیا اپنا رتھ
نئے سرے سے پرانے دوستوں کی طرف
اس سے پہلے کہ میں اتنا آگے نکل جاؤں
کہ میں اپنی راہ بھی گم کر بیٹھوں"(۳۷)

بدی کے راستے کو غلط سمجھ کر نیکی کی روش اختیار کرنا اور اُس پر مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہنا، بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ چھویو آن بھی اپنے دور کے غلط کاموں سے دلبرداشتہ ہو کر ایک ایسے معاشرے کے قیام کا خواب دیکھ رہا تھا جہاں روحِ عصر کے تقاضوں کو سمجھ کر، خالصتاً" اخلاقی بنیادوں پر سماجی تشکیل کو ممکن بنایا جا سکے۔ باطل طاقتوں کی مسلسل مزاحمت اور اپنے خیر خواہوں کی جانب سے بھی ہاتھ کھڑے ہو جانے کے بعد شاعر کو یہ احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ کہیں میں نے جس راستے کو چنا ہے، وہ اسے ناکامی

سے دوچار نہ کر دے۔ ایسے میں اُس کی بہن کی جانب سے ملنے والے خدشات بھی شاعر کا حوصلہ پست کر دیتے ہیں۔ تاہم اس موقع پر ماضی کے حکمرانوں کا تذکرہ، صورت حال کو ایک نئی جہت سے متعارف کروا دیتا ہے۔ جن قدیمی بادشاہوں کو اس اہم موقع پر زیر بحث لایا جاتا ہے، اُن میں چی، اُوز، ہان چیو، یاؤ، شیا، شن، شانگ، تھانگ اور چانگ ہُوا، جنہیں شوان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، شامل ہیں۔ ان حکمرانوں میں سے جس جس نے عوامی فلاح و بہبود کے مطابق اپنی حکومت کو قائم رکھا، انہوں نے عوامی تائید کو بھی حاصل کیے رکھا۔ تاہم جن حکمرانوں نے عوامی توقعات کے برعکس عیش و عشرت کی رنگینیوں میں کھو کر قومی خدمت کے فریضے کو پسِ پشت ڈالے رکھا، آج تک عوام انہیں بُرے لفظوں سے یاد کرتے ہیں۔ یہ تصور شاعر کے دماغ میں آتے ہی وہ پھر سے پُر عزم ہو جاتا ہے۔ وہ مایوسی کی دلدل سے نکل کر پھر سے کمر باندھ لیتا ہے۔ اس موقع پر شاعر چینی ثقافت کے چند نقوش نمایاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ چینی ثقافت کے چند پہلوؤں میں کچھ عناصر تاریخی نوعیت کے ہیں اور کچھ اساطیری قسم کے ہیں۔ زیرِ نظر نظم میں یشم نامی پتھر کا ذکر کیا جاتا ہے جو چینی تہذیب میں بہت متبرک تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ققنس نامی پرندے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اپنی جلائی ہوئی آگ میں خود ہی جل جاتا ہے، حیران کن طور پر اُس آگ میں فنا ہونے کے بعد دوبارہ اسی آگ میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد امین اپنی کتاب "کنفیوشس اور چین کی ثقافت: ایک تعارف" میں لکھتے ہیں:-

> "ققنس کے سر پر کلغی ہوتی ہے۔ رنگین خوب صورت پر ہوتے ہیں۔ اسے پرندوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور خوش قسمتی کی علامت ہے۔ روایتی شادی کی تقریب میں ققنس کو دلہن کے لباس پر سجایا جاتا ہے۔ تصویر کے ذریعے سے خوش نصیبی اور خوشی کی علامت کے طور پر۔"(۳۸)

اس موقع پر "لی ساؤ" کا سب سے اہم اور خاص بند شاعر کے لبوں سے ادا ہوتا ہے۔ ناقدین سمجھتے ہیں کہ یہی بند پوری نظم کا خلاصہ ہے۔ دنیا کی کسی بھی تہذیب کے انسان کے لیے اس لفظوں میں ایسا آفاقی پیغام ہے جس کی معنویت سے انکار سلیم الفطرت دل و دماغ کے لیے ناممکن ہے۔ چھویو آن بنیادی طور پر ایک محبِ وطن اور انسان دوست طبیعت کا مالک ہے۔ اپنے ساتھی انسانوں کو ظلم کی چکی میں پستا دیکھ کر اس کا دل خون

کے آنسو روتا ہے۔ وہ اپنے غم کو غلط کرنے کے لیے محض کفِ افسوس ملنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بل کہ عملی طور پر میدانِ کارزار میں بنفسِ نفیس اتر کر برائی کو جڑ سے اکھاڑنے پر یقین رکھتا ہے۔ اس کھٹن سفر میں اسے بے پناہ مسائل کو سامنا کرنا پڑا۔ ایک موقع پر وہ اس قدر غمگین ہو جاتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پسپائی اختیار کرنے جیسے خیالات اس کے دل و دماغ پر غالب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر اس کی عزیز ترین بہن بھی اسے یہ باور کرواتی ہے کہ سماجی تبدیلی کا یہ سفر محض ایک فرد کی کاوش سے کیونکر کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ ان نامساعد حالات میں شاعر اپنی تاریخ کے عظیم بزرگوں کے کارہائے نمایاں کو یاد کرتا ہے۔ ان مشاہیر کو جن مشکلات کا سامنا رہا، ان کے مقابلے میں چھویو آن کو اپنی مشکلات بہت سطحی اور چھوٹی محسوس ہوئیں۔ سو اس اہم موقع پر شاعر کا دل و دماغ یقین اور اعتماد کے ملے جلے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ وہ مایوسی اور ناامیدی کو دور بھگا کر نئی عزم و حوصلے سے قوم کے اصلاح کا بیڑا اٹھالیتا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ اس نظم کا سب سے اہم اور خوب صورت قطعہ قلم بند کرتا ہے۔ بلاشبہ ان مصرعوں کا بجا طور پر نظم کا مغز قرار دیا جاسکتا ہے:۔

"رستہ طویل سے طویل تر ہے
لیکن مجھے جانا ہے
عرش کی بلندیوں سے پاتال کی گہرائیوں تک
اپنی اس جستجو میں"(۳۹)

اس طرزِ خیال سے فاضل مترجم کے اعلیٰ شعری فہم و فراست کا واضح ثبوت سامنے آتا ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ جو کہ ۲۰۲۱ء میں زیورِ طباعت سے ہم کنار ہوا، اپنے منفرد اسلوب کے باعث ترجمے کی جمالیاتی حس کو بہت عمدگی سے سمیٹے ہوئے ہے۔ "عرش" اور "پاتال" کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے، شاعر کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تفکرات کو پیش کرنے کی کامیاب کاوش کی گئی ہے۔ اس سے قبل کیے جانے والا ترجمہ، گو کہ متنی پیمانوں پر پورا اترتا تھا، تاہم جو شعری آہنگ اور نظم کی گہرائی اس ترجمے میں ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ درج بالا مصرعوں کا جو ترجمہ پہلے ایڈیشن میں تھا ان کو ملاحظہ کرنے سے یہ حقیقت واضح طور پر آشکار ہو جاتی ہے:۔

"یہ سڑک دھیمی ہے جس پر میں چلتا ہوں
اور میں اس پر بلند و پست تلاش کرتا ہوں" (۴۰)

چینی شاعری کے مطالعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ علامت نگاری کا استعمال اس میں ایک روایت کے طور پر برتا جاتا ہے۔ عرش، فرش، ہوا، پانی، جھیل، دریا، سمندر، صحرا، پہاڑ، جنگل، درخت، مشاہیر سمیت درجنوں ارضی عناصر چینی شاعری کو ایک ایسی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جن سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ چینی شاعری کا مرکزہ اور بنیاد ارضی ہے، یعنی مافوق الفطرت اور مابعد الطبعیاتی عناصر کو وہ اہمیت میسر نہیں جو ہند آریائی زبانوں کا طُرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

چھویو آن نے نئے عزم و حوصلے ساتھ اپنے مقصد کے حصول یعنی اپنی آبائی ریاست میں عادلانہ نظام کے قیام اور دقیانوسی قیادت کے بجائے ایک دور اندیش اور رعایا پرور حکومت کا قیام۔ اس موقع پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی ذات کے اکیلے پن کو ختم کرنے کے لیے رشتۂ ازدواج میں بندھ جانے کا متمنی ہے۔ وہ مختلف تانیثی کرداروں کے ساتھ اپنے ازدواجی رشتے کو قائم کرنے کے جتن کرتا ہے۔ اس امر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "لی ساؤ" سے ہمیں چینی ثقافت کے اس پہلو کی بھی خبر ملتی ہے کہ یہاں بھی دیگر تہذیبوں کے حاملین کی مانند انسان اپنی بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد شادی کے رشتے میں بندھ کر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوں ایک تہذیب کو آگے بڑھانے والی نسل کا وجود یقینی ہو جاتا ہے۔ اسی معاملے کو چینی فلسفے کی اہم کتاب "جینے کی اہمیت" میں لین یو تانگ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:-

"انسان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ دوسری جنس کے ایک مناسب فرد کے ساتھ رشتہ استوار کرتا ہے۔ مرد کی شخصیت اسی ہم رشتگی کی بدولت اظہار پا سکتی ہے اور مکمل ہو کر اپنے اوجِ کمال کو پہنچ سکتی ہے۔" (۴۱)

"لی ساؤ" کے مطالعہ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ چھویو آن نے اپنی پوری زندگی مجرد حیثیت میں گزاری۔ شادی کے بندھن میں بندھنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے باوجود وہ اس رشتے کو قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بادی النظر میں یہ تاثر ملتا ہے کہ شریکِ حیات میسر نہ آنے کے سبب انہیں زندگی کے آخری ایام میں سخت ترین مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس مایوسی کا اظہار انہوں نے نظم میں بھی کیا ہے۔ تاہم

اس ناکامی کی ذمہ داری قبول کرنے کے برعکس انہیں یہ خیال تھا کہ ان کی شادی نہ ہونے کی وجہ محض وہ لوگ ہیں جن پر انہیں تکیہ تھا کہ وہ اس کام کو بخیر سرانجام دیں گے۔ چھویو آن اپنے ایسے دوستوں کو کم زور وکیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایسے لوگ اپنی محدود ذہنی استعداد کے باعث اِس کے گھر کو بسانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ان کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر دکھی دل کے ساتھ یوں رقم طراز ہے:۔

"لیکن کمزور تھے میرے وکیل
اور کم ہنر اور ناتجربہ کار تھے میرے پیام بر
اور مجھے خدشہ ہی رہا
کہ یہ کوئی بات پکی نہیں کرا سکتے"(۴۲)

شاعر اپنے حلقۂ احباب کے بارے میں شکوے شکایات کا اظہار کرتے ہوئے زمانے کی سختیوں کو بھی واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ یہ دنیا اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے باوجود کیچڑ اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں دوسروں کی کامیابیوں کو قبول کرنے کے بجائے حسد اور لالچ کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ محنتی اور جفاکش انسانوں کو ان کی محنت کا صلہ دینے کے بجائے استحصال کرنے والے افراد کو ہی معتبر تصور کیا جاتا ہے۔ حسن و خوب صورتی کو پذیرائی بخشنے کے بجائے یہاں ایسے انسانوں کا جینا مشکل کر دیا جاتا ہے۔ گویا شاعر جب دکھ کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے دنیا و مافیا کی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہمہ وقت اس سوچ میں ہی گرفتار دکھائی دیتا ہے کہ اسے دکھ دینے میں دنیا کی طاقتیں آپس میں ایکا کیے ہوئے ہیں۔ گھر بسانے کے خواب چکنا چور ہوتے ہی شاعر کو یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ اسے جو دوست واحباب میسر ہیں، وہ اس کے ذہنی و جسمانی مسائل حل کرنے کے بجائے مزید مشکلات پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اس کیفیت میں شاعر محدود مدت کے لیے ہی مبتلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آقا کی زندگی میں آنے والی مشکلات کو پہلے ہی سے دیکھتے ہوئے، کفِ افسوس مل رہا ہے۔

نظم میں اساطیری کرداروں کا بھی تذکرہ ملتا ہے، جن میں لنگِ فن نامی کاہنہ بھی شامل ہے۔ اس کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چینی سماج میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں لنگ فن اپنی روحانی واردات کے بل بوتے پر آنے والے زمانے میں پیش آنے امور سے خبر دار کر سکتی ہے۔ ایسے

ہی دو اور کردار بھی ہیں جن کے نام لنگ فن اور اُوشیان ہیں۔ایسے اساطیری کردار چینی تہذیب میں ایک خصوصی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ چھویو آن بھی اپنی زندگی کی مشکلات سے تنگ آ کر لنگ فن سے مدد طلب کرتا ہے۔ لنگ فن کی جانب سے اسے جو بات بتلائی جاتی ہے، اس میں ظاہری طور پر مثبت پیغام موجود ہے۔ اُسے یہ بتلایا گیا کہ دنیا بہت وسیع ہے۔اگر ایک در بند ملا ہے تو اس کا قطعا" یہ مطلب نہیں کہ ہر در ہی اس کے لیے بند ہو گا۔ گویا کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ماضی میں بھی ایسے لوگوں کی ایک تاریخ رہی ہے جو مشکلات کا شکار ہو کر امید کا دامن تھامے رہے۔ آخر کار انہیں کامیابی اور کامرانی سے سرفراز ہونا پڑا۔

فاضل شاعر اس موقع پر چینی تہذیب کے اہم ترین مظہر لباس کے ایک جزو کمر بند کے بارے میں اپنے خیالات کو منظوم کرتا ہے۔ صاحبِ حیثیت چینی افراد اپنی کمر کے گرد ایک کمر بند روایت کے طور پر باندھا کرتے تھے۔ اس کمر بند کو خوب صورت بنانے کے لیے دیدہ زیب نقوش اور خوش بو دار پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ ان پھولوں کی یوں تو کئی ایک اقسام ہوتی تھیں۔ تاہم شاعر علامت کے طور پر دو اقسام کے پھولوں کا ذکر کرتا ہے۔ اول الذکر پھول وہ ہیں جو اپنی من پسند خوشبو کے باعث ارد گرد کے ماحول کو بہترین بنا دیتے ہیں۔ یہ وہ پھول ہیں جو اپنی خوش بو سے نہ صرف اس انسان کو معطر کرتے ہیں جو انہیں اپنی پوشاک میں سجاتا ہے بل کہ اُس انسان کے ساتھ ساتھ اُس کے مصاحبین کو بھی خوش گوار سانسوں سے محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ خود رو جھاڑیوں کے پھول نہ صرف قربت اختیار کرنے والے انسان کو بدبو دار سانسوں سے تنگ کرتے ہیں بل کہ اپنے مضر اثرات کے باعث چھونے والے انسان کو بھی کسی زحمت میں مبتلا کر سکتے ہیں۔

در حقیقت شاعر نے دو طرح کے پھولوں کا ذکر کر کے شہنشاہ کے دربار میں موجود دو طبقات کا ذکر کیا ہے۔ شہنشاہ کے مصاحبین میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو اپنی بد اعمالیوں اور بد عنوانیوں کے سبب مملکت کے عدم استحکام اور جگ ہنسائی کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مزاج اور سوچ کے اعتبار سے مضر رساں خود رو پھولوں کے مشابہ ہیں۔ شہنشاہ کو ملک کی ترقی کے مشورے دینے کے بجائے اپنی ذاتی منفعت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں عوام اور بادشاہ کے مخلص عمائدین کی تعداد اقلیت میں ہونے کے سبب کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ بد قسمتی سے چھویو آن بھی انہیں لوگوں میں شامل ہے جو محبِ وطن ہونے کے ساتھ ساتھ

باصلاحیت بھی ہیں۔ تاہم بد کردار اکثریت کے غلبے کے باعث اپنی صلاحیتوں کو بحقِ قوم استعمال کرنے سے محروم ہے۔

امید اور ناامیدی کے ملے جلے جذبات میں مبتلا شاعر کو آخر کار وہ راستہ سجائی دیتا ہے جس پر چل کر وہ یقینی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ وہ زمانے کی تلخیوں سے چند لمحوں کے لیے مغموم ضرور ہوتا ہے اور اس کیفیت کے زیرِ اثر وہ مایوسی کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ اپنے عظیم مقاصد کی طرف رجوع کرتا ہے تو اسے پھر سے توانائی اور قوت بہم ملتی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اس کیفیت کو شاعر نے "لی ساؤ" میں بیان کرنے کے لیے ایک منفرد لب و لہجے کا انتخاب کیا ہے۔ یہ لب و لہجہ دراصل ایک ایسا اظہار ہے جو مایوسی کی گھٹاٹوپ فضاؤں میں تازگی اور شگفتگی کی حامل تازہ بہار کے مترادف ہے۔ اپنی ذات کے حصار میں بند رہنے کے بجائے وہ اجتماعیت کی بات کرتا ہے۔ اپنی طاقت کو انفرادیت تک محدود رکھنے کے بجائے وہ اسے اجتماع کی تائید دینے کا متمنی ہے۔ وہ ذات کو ایک منظم جماعت میں بدلنا چاہتا ہے۔

"سو میں خود کو مفاہمت کی راہ پر ڈال کر
بجائے دوسروں سے الجھنے کے
جاؤں کا اپنی چاہت کے پیچھے
اور پھرتا پھراتا رہوں گا کسی حسینہ کی تلاش میں
میں ابھی جواں مردی سے عاری نہیں ہوا
جستجو کے اس راستے پر
جہاں چاہوں گا، جاؤں گا
اور نشیب و فراز دیکھوں گا(۴۳)

"لی ساؤ" کی چینی ادب میں یوں تو کئی ایک حوالوں سے اہمیت مسلم ہے، تاہم ایک پہلو اس اعتبار سے منفرد اور قابلِ غور ہے۔ چھویو آن کو اپنے وطن کی سلامتی اور ترقی دل و جان سے عزیز تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومتِ وقت ہوش کے ناخن لے اور ایسی اصلاحات متعارف کروائے جو ریاست کو استحکام فراہم کر سکیں۔ تاہم اس مقصد کے حصول کے لیے ہر حربہ ناکام ہوا تو شاعر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں تعامل کا مظاہرہ

نہیں کرتا۔ "لی ساؤ" کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ شاعر نے اپنے قول کی لاج رکھتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اس سے قبل بھی چینی تاریخ میں پھنگ شیان نامی مدبر سیاست دان گزرا ہے، جو شانگ سلطنت کے ایک بادشاہ کا مصاحب تھا۔ ریاست کو درپیش ایک اہم مسئلے کے حل کے لیے اس نے بہترین منصوبہ پیش کیا، جسے محلاتی سازشوں نے عملی جامہ پہنانے کی راہ میں ناکام بنا دیا۔ تاہم پھنگ شیان نے بادشاہ سے اپنی والہانہ وابستگی اور ریاست سے وفاداری کو اس طور سے ثابت کیا کہ آج بھی اسے یاد کیا جاتا ہے۔ چھویوآن کے سامنے یہ مثال بہت بڑی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اپنا مقصد نہیں چھوڑا۔ دنیا بھر کی طاقتیں اسے زیر کرنے کے لیے متحد تھیں، مگر اس نے اعلیٰ انسانی اوصاف کو پائمال ہونے سے نہ صرف بچایا بل کہ انسانی تہذیب کو ایک ایسے نمونے سے بھی روشناس کروایا جسے انسانیت بھلا بیٹھی تھی۔ چھویوآن نے گو کہ اپنی نظم میں ایسی منظر کشی واضح طور پر نہیں کہ وہ دریا میں ڈوب جائے گا تاہم اپنی جان کی امان پانے کے بجائے وہ عوام کی امان کا متمنی ہو کر ایک پر امن حتجاج ریکارڈ کروا رہا ہے۔ نظم کا آخری مصرعہ اس حقیقت کی خوب ترجمانی کرتا ہے کہ انصاف کی حکمرانی ہی ایک فلاحی معاشرے کی بنیاد ہے۔ انصاف کے بنا سماج کا اعلیٰ انسانی اصولوں پر قائم رہنا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ چھوآن کی اسی مقصد کے حصول کے لیے دی جانے والی قربانی کو چینی قوم آج تک یاد رکھے ہوئے ہے اور ہر سال چینی تقویم کے پانچویں مہینے کی پانچ تاریخ کو اس عظیم محبِ وطن شاعر کی یاد میں ایک رنگا رنگ تہوار منایا جاتا ہے۔ یوں "لی ساؤ" درحقیقت چھویوآن کی زندگی کی سرگزشت ہے۔

د۔ "نظمیں، خطاطی اور محبت۔ پاکستان کے لئے" از یوان وے شوئے

یوان وے شوئے کی کتاب "نظمیں، خطاطی اور محبت۔ پاکستان کے لئے" اردو اور چینی زبانوں کے مابین تہذیبی مکالمے کی ایک خوب صورت مثال کے طور پر اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ یوان وے شوئے عوامی جمہوریہ چین کے ایک ممتاز ادیب، مترجم اور زبردست خطاط ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں اردو زبان سیکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ چینی اور پاکستانی عوام کے مابین دوستی اور محبت کے جذبات کو فروغ دینے کے عزم نے انہیں مستقل طور پر متحرک رکھا۔ ۱۹۷۶ء سے ہی ترجمہ کاری کے شعبے سے وابستگی کی بدولت اردو ادب کے اہم نثر پاروں کو چینی زبان میں منتقل کیا۔ پاکستانی تہذیب و ثقافت کے بارے میں درجنوں مضامین قلم بند کیے۔

۱۹۸۰ء میں چینی وزارتِ ثقافت سے منسلک ہونے کے بعد پاکستان میں چین کے ثقافتی کونسلر کے طور پر اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۶ء میں چین کے مترجمین کی انجمن کے باقاعدہ ممبر کی حیثیت سے ادب کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ اس دوران پاکستانی ادب کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ دورانِ مطالعہ نمایاں تصانیف کو چینی زبان میں منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

زبان و ادب میں یہ غیر معمولی دلچسپی آخر کار پاکستان اور اہلِ پاکستان سے والہانہ محبت میں تبدیل ہو گئی۔ اسی محبت کے زیر اثر اہلِ اردو کو چینی ادب کے نمایاں ناموں سے متعارف کروانے کے لئے "چین کے مشہور ادیب اور شاعر" کے نام سے اپنی نوعیت کی اولین اور منفرد کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع کی۔ جس میں معروف چینی افسانہ نگار لوشیون کے معاصر و مابعد سو سے زائد نمایاں چینی شعرا کا تعارف پیش کیا۔ "فاسیان" کے نام سے چینی زبان میں ناول بھی لکھا۔ خطاطی کے شعبے میں بھی اپنی مہارت کا خوب لوہا منوایا۔ ان کی خطاطی کے نمونے چین کے موقر روزناموں کی زینت بنتے رہے۔ کئی ایک ممالک میں ان فن پاروں کی نمائش بھی کی گئی۔ سال ۲۰۰۱ء میں اُن کی اردو اور چینی زبان میں لکھی کتاب "نظمیں، خطاطی اور محبت۔ پاکستان کے لیے" اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی سرپرستی میں شائع ہوئی۔ یوں اُنہیں ایک متنوع علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیت کے طور پر پاکستان اور چین میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

"نظمیں، خطاطی اور محبت۔ پاکستان کے لئے" بنیادی طور پر تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ اولین نظم کا عنوان "پاک چین دوستی لازوال" ہے، جو اپنے اندر دونوں زبانوں کو بولنے والے افراد کے مابین مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کی دل کش نظیر ہے۔ فاضل شاعر اور مترجم نے پاک چین دوستی کے دیرینہ نقوش کا ذکر کیا ہے۔ اس میں پاک چین تعلقات کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے قدیم شاہراہِ ریشم پر سفر کرنے والے نام ور چینی مذہبی رہنماؤں فاسیان، سونگ یون اور سوان چھونگ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ پاک چینی تعلقات کی ابتداء اور دونوں ممالک کے مابین بے مثال دوستی کے جذبے کو بھی خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فاضل شاعر کی پوری نظم ہی اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مختصر الفاظ میں پاک چین دوستی کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ بجا طور پر اسے پاک چین دیرینہ دوستی کی ایک

نمایاں مثال کے طور پر یاد رکھا جاسکتا ہے۔ نظم "پاکستان چین دوستی لازوال" بنیادی طور پر اس خوب صورت کتاب کی ابتدائی نظم ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:-

پاک چین دوستی
قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے
شاہراہ ریشم
پاکستان سے گزرتے ہوئے
مغرب کی طرف چلی جاتی ہے
خاندان خان اور خاندان کشان
قدیم زمانے کی بڑی بڑی ریاستیں رہی ہیں
دونوں ملکوں کی ایلچی
اس زمانے سے آتے جاتے ہیں
چین کے بدھ مت کے پیروکار
فاسیان، سونگ یون اور سوان چھوانگ نے
پاکستان کی سیر و سیاحت کی
پاکستان میں بدھ مت کے پیروکار گوپتا نے
چین اور پاکستان کے میل جول کی تاریخ رقم کی
چین اور پاکستان کے درمیان
سفارتی تعلقات کے قیام کے بعد
نئے در کھل گئے
دونوں ملکوں کے سربراہ
دوروں پر آتے جاتے رہے
دوستی کے درخت
نشوونما پاتے رہے

ثقافت اور تجارت کے تبادلے
بڑھتے رہے
ہماری پُر امن ہم آہنگی
دوسرے ملکوں کے لیے مثال ہے
ہم مشترکہ خوشحالی کے راستے پر
ایک دوسرے کی مدد و حمایت کرتے رہے
ہم نسل در نسل
دوستی پر قائم رہے (۴۴)

اس نظم کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پاک چین دوستی کی پوری تاریخ کو چند سطروں میں سمو دیا گیا ہے۔ باہمی تعلقات کی تمام نوعیتوں کو فاضل شاعر نے اس طور سے پیش کیا ہے کہ اس میں مستقبل کے لیے بھی نیک خواہشات کا اظہار واضح ہوتا ہے۔ یوں اس کتاب کی ابتداء ہی میں منظوم انداز میں جس اسلوب کو اختیار کیا گیا وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شاعر کے دل و دماغ میں دونوں ممالک کی عوام میں موجود دوستی، بھائی چارے اور خیر سگالی کے جذبات کا مکمل ادراک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان اور پاکستان سے جڑے ہر رشتے کو اپنی شاعری میں برت رہے ہیں۔ اسی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے فاضل شاعر اپنی دوسری نظم میں بانیِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ قائدِ اعظم کو استقلال اور ایمان داری کا ایک درخشاں ستارہ قرار دیا گیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے اسلامی ریاست کے قیام کا عظیم مشن آپ ہی کی قیادت میں پورا ہوا۔ یوان وے شوئے نے قائد اعظم کے اس کارنامے کو تاریخ کا اہم واقعہ قرار دیا ہے۔ مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال کے بارے میں بھی فاضل شاعر اپنی چینی اور اردو نظم میں زبردست الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان کا قیام جس نظریئے کی بنیاد پر ہوا، اس کی ترویج میں علامہ اقبال کا بنیادی کردار ہے۔ سیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کی فکری رہنمائی کا کام بھی اقبال کے پیشِ نظر تھا۔ جدید چین کی تعمیر میں جس رہنما کا مرکزی کردار رہا ہے، وہ بھی شعر و ادب میں ایک منفرد مقام کے حامل تھے۔ اسی بنیاد پر افتخار عارف یوں رقم طراز ہیں:-

"تصورِ پاکستان کے صورت گر حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال نے اس خطے کے نقشے پر پاکستان کے ساتھ ایک اور حقیقت کو ابھرتے دیکھا تھا۔ یہ حقیقت بدلتی ہوئی دنیا میں چین کا مستقبل تھا۔۔۔ پاکستان اور چین دونوں دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں کے وارث ہیں۔ پاکستان کا خواب ایک شاعر نے دیکھا تھا۔ جدید چین کا بانی بھی ایک شاعر تھا۔ اس لیے ہم اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہیں کہ جدید چین کی تعمیر میں کیسے کیسے تہذیبی اور تخلیقی رویے کام کرتے رہے ہیں۔" (۴۵)

دنیا کی کسی بھی قوم کی پہچان اُس کے چند مخصوص مظاہر اور علامات سے ہوتی ہے۔ یہ مظاہر در حقیقت اس قوم کے ہر ہر فرد کے لیے مقدّس اور محترم ہوتے ہیں۔ ان کی عزّت ہر فرد پر لازم ہوتی ہے۔ ان علامات میں قومی پرچم، قومی ترانہ، قومی پھول، قومی علامت، قومی لباس، قومی زبان اور قومی دن خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پاک چین دوستی کے سفیر یوان وئے شوئے نے پاکستان اور اہلِ پاکستان کے ساتھ جڑی ہوئی ان تمام علامات اور مظاہر کو بہت خوب صورتی سے اپنی مختصر مگر دل کش نظموں میں شامل کیا ہے۔ پاکستان کے قومی پرچم میں موجود سبز اور سفید رنگوں کی مخصوص اہمیت ہے۔ اسی طرح پرچم پر نقش چاند اور ستارہ قوم کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہیں۔ قومی ترانے میں اہلِ وطن کے اپنی سرزمین کے لیے نیک جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ قومی زبان اُردو پاکستان کے ہر فرد کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ پاکستان کا قومی لباس شلوار قمیض ہے جو اپنی پُر وقار وضع قطع کے باعث ملک کے طُول و عرض میں مقبول ہے۔ در حقیقت یہ قوم کا ایسا مشترکہ اثاثہ ہے جس کی بنیاد پر اتحاد و یگانگت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ پاکستان کی ان قومی علامتوں پر فاضل شاعر کی یہ نظمیں تہذیبی مکالمے کی نمایاں مثالیں ہیں۔ حکومتِ پاکستان کے قومی نشان کے بارے میں فاضل شاعر اپنی مختصر نظم "قومی علامت" میں لکھتے ہیں:۔

"ستارہ و ہلال کا مطلب
اسلام سے تعلق
کپاس، گندم، چائے اور پٹ سن
معیشت کا بھروسہ ہے
پھولوں کے ہار کے معنی

قومی ثقافتی روایات کو ورثے میں پانا ہے

سب سے اہم بات قائدِ اعظم کا قول "اتحاد، ایمان، تنظیم "یاد رکھنا ہے "(۴۶)

درج بالا نظم شاعر کے پاکستان اور اہلِ پاکستان کے ساتھ دیرینہ اور پُر خلوص تعلق کی بھرپور غمازی کرتی ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ ایک جانب اس سے پاکستانی قوم کو اپنی زبان میں ایک چینی ادیب کے اپنے ہی ملک کے بارے میں خیالات جاننے کا موقع میسر آتا ہے وہیں، اس کتاب میں درج نظموں کی بدولت چینی عوام کو اپنی زبان میں منظوم کلام پڑھنے اور خطاطی کے شان دار نمونے دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ چین کا قومی ترانہ بھی اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس کا منظوم ترجمہ ڈاکٹر صفدر علی شاہ نے اپنی کتاب "۱۰۱ چینی نظمیں" میں کیا ہے۔ اسے رضاکاروں کی مارچ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ترجمے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔:۔

"اُٹھو اُٹھو!

گر تمہیں محکومیِ اغیار سے انکار ہے
خوں پسینے سے بنانی گر نئی دیوار ہے
آج چینی قوم پر سب سے کڑا ہے امتحاں
جان لو یہ ہر کسی کی آخری للکار ہے
اُٹھو اُٹھو! اُٹھو اُٹھو! اُٹھو اُٹھو!
چین دل ہے اور ہم ہیں اس کے اربوں ریزہ ہا
جھیل کر سب دشمنوں کے وار اب آگے بڑھو
جھیل کر سب دشمنوں کے وار اب آگے بڑھو
آگے بڑھو! آگے بڑھو! آگے بڑھو!"(۴۷)

پاکستان اور چین کے بارے میں درج بالا دو اقتباسات سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ ترجمہ دو تہذیبوں کے درمیان ایک پُل کا کردار ادا کرتا ہے۔ ہر قوم کی اپنے وطن کے ساتھ مخصوص نوعیت کی وابستگی اور جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اس رشتے اور تعلق کا اظہار قومی علامتوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ بظاہر ان نظموں میں سادہ اور عام فہم انداز میں مختلف جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ تاہم یہی سادگی اور سلاست چینی شعری روایت کا سب بڑا وصف ہے۔ "شاعری کا وطن" نامی نظم میں پاکستان کے عظیم اہلِ علم کے سرمائے

کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔شاعر کا کہنا ہے کہ پاکستان شاعری کا وطن ہے۔ یہاں شعرا کرام کا ایک جمِ غفیر ہے، جو شعر و سخن کو اپنے خونِ جگر سے ترو تازہ رکھتا ہے۔ شعرا اپنے اور دیگر شعرا کے کلام سے محظوظ ہونے کے لیے مشاعروں کا بہت ہی ذوق وشوق سے اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ان مشاعروں میں شعرا کو داد دی جاتی ہے۔ اردو زبان میں مشاعروں کی ایک بھرپور روایت موجود ہے جو دن بدن ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی میں جہاں دیگر اداروں کی خدمات ہیں وہیں مشاعروں کا بھی کلیدی کردار ہے۔ "اردو" کے عنوان سے شامل نظم میں فاضل شاعر نے اردو زبان کی تاریخ کے بارے میں بڑے نپے تلے انداز میں اپنے اشعار پیش کیے ہیں۔ فاضل شاعر کا کہنا ہے یہ زبان چینی سے یکسر مختلف ہے۔ اسے دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے ۔بقول شاعر یہ زبان شہد سے زیادہ میٹھی ہے اور دن بدن ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔

پاکستانی تہذیب و ثقافت کے بارے میں آگاہی دیتے ہوئے اپنی خوب صورت نظم "ہاتھ سے کھانا کھانا" میں شاعر اپنے اہلِ وطن کا پاکستانی قوم کے کھانا کھانے کے آداب سے روشناس کروا رہا ہے۔ چین میں کھانا کھانے کے لیے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی سلاخیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ہاتھ سے کھانا کھانے کا رواج چینی تہذیب میں موجود نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر نظم میں بتلایا گیا ہے کہ پاکستانی لوگ ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی دائیں ہاتھ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ غیر ضروری طور پر بائیں ہاتھ سے کھانا کھانے کو سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔ چین میں سوپ یعنی یخنی جیسے شوربے کو کھانے کا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایسا کوئی التزام نہیں کیا جاتا۔ تاہم شدید سردی میں سوپ یا یخنی وغیرہ کا استعمال ایک گرم مشروب کے طور پر کیا جاتا ہے۔ "نان" نامی نظم میں پاکستان میں کھائے جانے والے اس اہم پکوان کا ذکر ہے جس کو تیار کرنے کے لیے سفید آٹے میں تھوڑا سا خمیر شامل کیا جاتا ہے۔ جس کی بدولت نان کے اندر نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ پاکستانی تہذیب میں کھانے کے لیے پکائے جانے والے پکوانوں میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے۔ عمومی طور پر خواتین گھروں میں کھانا پکانے کا کام کرتی ہیں۔ تاہم بازاروں میں کاروباری مقاصد کے لیے درکار کھانا مرد حضرات بھی تیار کرتے ہیں۔ پاکستانی خواتین کے بارے میں اپنی نظم "دستکاری" اور "سر پر سامان اٹھاتی عورت" میں خاص طور پر پاکستانی خواتین کی ہنر مندی کی تعریف کی گئی ہے۔ اس میں زرعی شعبہ سے وابستہ ایک پاکستانی خاتون کو محنت اور جدوجہد کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس سے جہاں یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ زراعت پاکستان کی معیشت میں

ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتی ہے وہیں اس حقیقت کا سراغ بھی ملتا ہے کہ پاکستان کی ترقی و استحکام کے سفر میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کے اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

کسی بھی تہذیب میں کھیلوں کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر تہذیب میں فنونِ لطیفہ کا بھی ایک مخصوص شعبہ ہوتا ہے۔ پاکستانی دیہی تہذیب میں جن کھیلوں کو خاصی مقبولیت حاصل ہے، ان میں کبڈی کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس میں نوجوان ٹولیاں بنا کر شریک ہوتے ہیں اور اپنی اپنی ٹیم کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی پس منظر میں یو ان وے شوئے کی نظم "کبڈی" ہر دو تہذیبوں کے مابین رابطے کی اہم نوعیت پیدا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ کوئی بھی کھیل محض طاقت کے بل بوتے پر ہی نہیں جیتا جا سکتا۔ بل کہ اس میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے لیے ذہانت کا استعمال بھی از بس ضروری ہے۔

"سر ہلانے کا مطلب" کے عنوان سے شامل نظم زیرِ نظر کتاب کی ایک اور خاصیت کو ظاہر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ہر قوم کا اپنا اپنا رسم و رواج ہے
نہ سمجھو کہ سر ہلانے کا مطلب ہے" نہیں"
پاکستانی کے سر ہلانے کے معنی تجسس ہے
"ہاں" بھی ہو سکتا ہے۔"(۴۸)

دنیا کی ہر تہذیب میں فنونِ لطیفہ کا ایک مخصوص رنگ ہوتا ہے۔ یہی فنون اور مہارتیں کسی بھی تہذیب کو دیگر تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ پاکستانی فنونِ لطیفہ میں موسیقی، رقص، لباس، تہوار، فنِ تعمیر، شہری اور دیہاتی زندگی کا تنوع بہت دل کش اور منفرد ہے۔ دوسری تہذیبی روایت کا حامل شخص جب پاکستان میں تہذیبی اقدار کو دیکھتا ہے تو اسے یہ سب کچھ بہت دلچسپ اور انوکھا لگتا ہے۔ تاہم یہی ثقافتی تنوع ہی درحقیقت پُرامن بقائے باہمی کی بنیاد ہے۔ پاکستان کے تہذیبی ورثے کو اجاگر کرتے ہوئے یو ان وے شوئے نے پاکستان کے اہم شہروں، تاریخی مقامات، ثقافتی اداروں اور اہم سیاحتی مقامات کے بارے میں مختصر مگر انتہائی جامع نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان نظموں کے عنوان ہی سے اس بات کی بخوبی اہمیت اجاگر ہوتی ہے کہ

فاضل شاعر کے ہاں پاکستان کی پوری ثقافت ایک کھلی کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ان نظموں میں جن تفریحی مقامات کا منظوم تعارف پیش کیا گیا ہے، ان میں "شکر پریاں"، "کوہ مری"، "واہ گارڈن"، "لاہور عجائب خانہ"، شالیمار باغ"، "مینارِ پاکستان"،" لال قلعہ"، "مقامِ نظارہ"،" سنڈیمان ٹانگی"،" وادیِ سوات"،"وادیِ گلگت"،" جھیل ست پارہ"،"ہنزہ" اور "کے ٹو" شامل ہیں۔ ان تمام عنوانات پر مختصر مگر جامع نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ان کا لبِ لباب یہ ہے کہ پاکستان ایک خوب صورت ملک ہے، جس میں قدرت نے بے پناہ وسائل اور مواقع پیدا کیئے ہیں۔ان میں جو تاریخی نوعیت کی حامل عمارتیں ہیں، اُن کے تحفظ اور آنے والی نسلوں تک محفوظ منتقلی کے لیے مزید اقدامات اٹھائے جانے چاہیں۔

پاکستان میں چند اہم مقامات ایسے بھی ہیں جو پاک چین دوستی کے زندہ ثبوت کے طور پر آج بھی پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔فاضل شاعر نے اسلام آباد کے تفریحی مقام "شکر پڑیاں" پر عوامی جمہوریہ چین کے ہر دل عزیز رہنما جناب چو این لائی کے ہاتھوں لگائے درخت کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح بدھ مت کی مقدس عبادت گاہوں کے مرکز ٹیکسلا کے بارے میں بھی پاک چین تہذیبی روابط کا ذکر کرتے ہوئے چینی سیاح سوان چھیانگ کا ذکر کیا ہے۔یہ سیاح چھٹی قبل مسیح میں قدیم چین سے برصغیر پاک وہند کے سفر پر اس نیت سے روانہ ہوا، تاکہ بدھ مت کا اصل لٹریچر پڑھ کر اپنی قوم کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے سکے۔اسی شہر میں پاک چین دوستی کا ایک اور عظیم مظہر "ہیوی مکینکل کمپلیکس، ٹیکسلا" کی صورت میں موجود تھا۔پاکستان کی معاشی و دفاعی ضروریات کو پورا کرنے میں اس ادارے کا کلیدی کردار ہے۔یہ منصوبہ چینی قوم کے دل و دماغ میں پاکستان کے بارے میں خیر سگالی کے جذبات کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔

بین المذاہب ہم آہنگی کے جذبات کو مہمیز دینے میں یوان وئے شوئے کا کردار قابلِ تعریف بھی اور قابلِ تحسین بھی۔اُن کے زیرِ نظر نظموں کے مجموعے میں جہاں بدھ مت کی مقدس شخصیات، مقامات و آثار کا ذکر ہے، وہیں سکھ مذہب کے بارے میں بھی قابلِ غور نظمیں موجود ہیں۔"پنجہ صاحب" کے عنوان سے ایک نظم میں حسن ابدال کے مقام پر موجود سکھ مذہب کے اہم گوردوارے کے بارے میں موجود تاریخی روایت کو منظوم کیا گیا ہے۔اسی طرح پاکستان کے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں موجود ملک کی سب سے بڑی مسجد، "فیصل مسجد" کے بارے میں بھی نظم کو شامل کیا گیا ہے۔لاہور کی بادشاہی مسجد کے بارے بتلایا گیا

ہے کہ اس کی تعمیر بہت ہی نفاست اور خوب صورتی سے کی گئی ہے۔ اس میں ایک لاکھ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کے احاطے میں موجود میوزیم میں اللہ تعالیٰ کی آخری الہامی کتاب قرآنِ کریم کے ایسے نسخے موجود ہیں، جنہیں سونے کے تاروں سے تیار کیا گیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ یہ عمل یقینی طور پر انسان کے اپنے خالق کے ساتھ مضبوط اور عقیدت سے بھرپور تعلق کی غمازی کرتا ہے۔ "منصورہ کی قدیم مسجد" نامی نظم میں برصغیر کی پہلی مسجد کے بارے میں مفید اور اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یوں یہ کتاب پاکستان میں پائے جانے والے مذہبی تنوع کو بہت عمدگی سے پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ گویا کہ مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں ان نظموں کا کلیدی کردار ہے۔

پاکستان کے ثقافتی تنوع کو پیش کرنے والی ایک نظم "راولپنڈی" اپنے موضوع اور معنوی پھیلاؤ کے حوالے سے بہت دل کش اور اہم ہے۔ بنیادی طور پر اس نظم میں پاکستان کے دو شہروں اسلام آباد اور راولپنڈی کا تقابل پیش کرتے ہوئے پاکستان میں روائتی اور جدید اقدار کے درمیان موجود کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ اسلام آباد نسبتاً" جدید اور غیر روایتی طرزِ زندگی کا حامل شہر ہے، جس میں معمولاتِ زندگی عالمی تقاضوں کے مطابق سرانجام پاتے ہیں۔ پر آسائش طرزِ زندگی اور پُر تکلف اندازِ زیست کے باعث یہاں ایک ایسی فضا پائی جاتی ہے جس میں روایتی طرزِ زندگی کو دخل نہیں ہے۔ یوں اسلام آباد پاکستان کا جدید اور ترقی یافتہ شہر ہونے کے باعث نئی اقدار کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے۔ جب کے اس کے برعکس راولپنڈی اپنے قدیم ماضی اور مختلف تہذیبوں کے اثرات کو سموئے ہوئے ہے۔ یہاں کی آبادی، طرزِ تعمیر، ثقافت، تہوار اور تاریخ اسے اسلام آباد سے مختلف پہچان فراہم کرتی ہیں۔ اسی بنیاد پر فاضل شاعر نے پاکستان میں موجود اس ثقافتی رنگارنگی کو اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ چار مصرعوں پر مشتمل یہ نظم ملاحظہ ہو:-

"راولپنڈی اور اسلام آباد دو جڑواں شہر
ایک پرانا ایک نیا
پنڈی کی سڑکوں پر دکانیں ہی دکانیں
لیکن اس پر بھی نیا روپ کسی وقت آ جائے گا"(۴۹)

درج بالا نظم اکیسویں صدی عیسوی کے بالکل اوائل میں لکھی گئی تھی۔ ۲۰۰۱ء میں یہ مجموعہ منظرِ عام پر بھی آ گیا تھا۔ سرِ دست راولپنڈی شہر میں جدید طرزِ زندگی اور صنعتی و تجارتی امور میں غیر روائتی ذرائع کو بھی تیزی سے بروئے کار لایا جارہا ہے۔ نظم میں اس بات کی جانب اشارہ دیا گیا ہے کہ راولپنڈی میں جدت کا سلسلہ بہت جلد اپنی پوری آب و تاب سے شروع ہو جائے گا۔ پاکستان کے دیگر شہروں مثلاً" لاہور، کوئٹہ، پشاور، زیارت، اسلام آباد، ٹیکسلا، درہِ خیبر، سوات اور گلگت کے بارے میں مختصر مگر جامع نظمیں شامل ہیں۔ پاک چین دوستی کی شان دار مثال قراقرم ہائے وے پر بھی یوان وئے شوائے کی ایک اہم نظم کتاب میں شامل ہے۔ اس میں بتلایا گیا ہے کہ ایک ہزار میٹر شاہراہ کی تعمیر پر کئی انسانی جانوں کی قربانی پیش کرنا پڑی۔ یہ شاہراہ دونوں ممالک نے مل کر تعمیر کی تھی اس لیے اسے دوستی شاہراہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے دنیا کی بلند ترین بین الاقوامی شاہراہ کے طور پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی شاہراہ پر ڈاکٹر خالد عباس الاسدی کی "ریشم" کے عنوان سے مختصر نظم ملاحظہ ہو:-

ریشم کے راستوں پہ چلے ہیں جو کارواں
سب بولتے ہیں مہر و محبت کی زباں
منزل ہو اِن کی چین یا دامانِ پاک ہو
بانہوں کو وا کیے کھڑے ہیں ان کے میزباں (۵۰)

درہِ خنجراب پر ایک نظم میں بتلایا گیا ہے کہ یہ سطح سمندر سے چار ہزار سات سو میٹر بلندی پر واقع ہے۔ غیر معمولی بلندی کے باعث یہاں پر آکسیجن کی شدید قلت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پرندوں اور دیگر جانداروں کو اپنی بقاء کے لیے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی سب سے آخری نظم پاکستان کی سب سے بلند اور دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے-ٹو کی خصوصیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ پہاڑی چوٹی اپنی بلندی کے باعث دنیا بھر کے کوہ پیماؤں کے لیے خصوصی دل چسپی کا باعث بنی رہتی ہے۔ تاہم فاضل شاعر نے پاک چینی دوستی کے بارے میں بے حد خوب صورت مثال کرتے ہوئے اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ پاکستان اور چین کے درمیان موجود دوستی کے ٹو پہاڑ سے بھی بلند تر ہے۔ یہ مثال بجا طور پر ہم سایہ ممالک کی دوستی پر صادق آتی ہے۔ سفارتی حلقوں میں پاک چین

دوستی کو شہد سے میٹھا، سمندروں سے زیادہ گہرا، پانی سے زیادہ شفاف اور ہمالیہ سے بلند تر قرار دیا جاتا ہے۔ چینی شاعر یوان وئے شوئے کی کتاب "نظمیں، خطاطی اور محبت-پاکستان کے لیے" دراصل پاک چین دوستی کی ایسی دل چسپ منظوم تاریخ ہے جو اپنی نوعیت اور ہیت کے اعتبار سے منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ رجحان ساز بھی ہے۔ چینی شاعری اور مصوری کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرنے والی کتاب "چین کا بدلتا سماج" کا اسی ضمن میں ایک اہم اقتباس ملاحظہ ہو:-

> "جس طرح چینی مصوری کو اس کی خوش ترتیبی اور سکون بخشی دوسروں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے اسی طرح نظمیں بھی اپنے رنگ روپ کے لحاظ سے سکون و طمانیت کا مظہر ہیں۔ان میں کوئی ہیجان خیزی نہیں ہے، وجد و غائت انبساط کا فقدان ہے اور ان میں خطیبانہ انداز تو بالکل نہیں ہے یا بہت کم ہے۔ پس نظمیں عام طور پر اپنی ترتیب اور آب و تاب کے لحاظ سے کوئی دقیع نہیں ہوتیں لیکن نفاست و بے تکلفی اور سنجید گی کی جو دل کشی ان میں موجود ہے وہ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ چینی شاعری طویل اور استادانہ منصوبہ بندی کا جامہ بہت کم پہنتی ہے لیکن خاموش نزاکت و لطافت اور دقیقہ سنجی سے بھرپور ہے۔"(۵۱)

چینی اور اردو زبان میں بیک وقت شائع ہونے والی یہ کتاب، جس میں شاعری اور مصوری یک جا ہے، بنیادی طور پر چینی تہذیبی تاریخ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ خطاطی اور مصوری کو چین میں جڑواں فن کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں بھی اِس ملک کے صاحبانِ علم و فضل مصوری کے ساتھ خصوصی دل چسپی رکھتے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چینی مصوری کا خطاطی کے ساتھ بڑا قریبی تعلق تھا۔ یقینی طور پر اسی بنیاد پر ایک چینی دانا کا قول معروف ہے کہ جب لوگ مصوری میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکے تو انہوں نے حروف ایجاد کیے اور جب وہ تحریر میں شکلیں ظاہر نہ کر سکے تو انہوں نے مصوری کی۔ اسی طرح وہ ایک دوسرے کو مدد پہنچاتے ہیں۔یوان وئے شوئے کی اس کتاب کے مطالعے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے، وہ تہذیبوں کے مابین مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے انسان دوست نظریئے کو زبردست بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

ح۔ ۱۰۱ چینی نظمیں از ڈاکٹر صفدر علی شاہ

ڈاکٹر صفدر علی شاہ ایک معروف قلم کار اور مترجم کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ انگریزی اور اردو زبان میں اب تک ان کی بیس سے زائد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ "۱۰۱ چینی نظمیں" اُن کی ۲۰۲۴ء میں شائع ہونے والی منفرد کتاب ہے۔ اِس کتاب میں قدیم چینی نظموں کا دل کش انداز میں اردو اور انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد کے تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب میں بنیادی طور پر تین اقسام کی نظموں کو ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان نظموں کا اولین حصہ غنائیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ غنائیہ نظموں میں انسانی جذبات کی عمدگی اور مہارت سے ترجمانی کی گئی ہے۔ غنائیہ گیت اپنے اندر تغزل اور آفاقیت کی خصوصیات کو سموئے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غنائیہ شاعری کا تاثر قاری کے ذہن و قلب پر تادیر اپنا تاثر برقرار رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی نظمیں کی تعداد تیس ہے۔ چینی تہذیب میں جنگوں کی ایک دلچسپ تاریخ رقم ہے۔ عظیم دیوارِ چین درحقیقت ایک دفاعی حکمتِ عملی کے تحت تعمیر کی گئی تھی۔ اسی طرح جنگوں سے متعلقہ لوک ادب کی ترویج و ترقی میں ایسی ہی صورتِ حال کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ چنانچہ "۱۰۱ چینی نظمیں" نامی کتاب میں سرحدی نظموں کے عنوان سے پینسٹھ نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات، گھر بار سے دوری، دشمن کی مکاری، موسم کی سختی، محاذِ جنگ کی سنگینی، جنگی سازوسامان، فوجی نقل و حمل اور عسکری مہمات میں درپیش مسائل کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں پانچ متفرق نظمیں بھی شامل ہیں، جن میں چین کا قومی ترانہ "رضاکاروں کا گیت" بھی شامل ہے۔ یوں اس کتاب میں چینی شاعری کے تین مختلف پہلوؤں کو روشناس کروانے اور اس کی گیرائی سے متعارف کروانے کی منفرد کوشش کی گئی ہے۔

زیرِ نظر کتاب چینی شاعری کے اردو تراجم میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی سب سے دلچسپ بات اس کا اسلوب ہے۔ چینی نظم کے اصل متن کے ساتھ ہی انگریزی ترجمہ پیش کر کے اردو زبان میں بہت ہی رواں اور سلیس ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید اس کتاب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:-

> "ڈاکٹر صفدر علی شاہ صاحب ایک ہشت پہلو علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ہمارے ادبی اور ثقافتی ورثے پر عمدہ کام کیا ہے جسے بھرپور پذیرائی ملی اور اب انہوں

نے چینی نظموں کے منظوم تراجم کر کے ایک اور بڑا دھاکہ کیا ہے جس کی گونج تادیر اور دور تک سنائی دیتی رہے گی۔" (۵۲)

چینی شاعری کے بارے میں عمومی تاثر یہی ہے کہ اس کے مطالعے سے ہند آریائی زبانوں کے قارئین کے شعری ذوق کی آبیاری اور تسکین نہیں ہوتی۔ کچھ ایسی ہی رائے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی بھی تھی۔ تاہم اس کتاب کے مقدمے میں انہوں نے اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ ڈاکٹر صفدر علی شاہ نے چینی شاعری کی غواصی کر کے نہ صرف اُن کی رائے تبدیل کی، بل کہ یہ بھی باور کروایا کہ کسی بڑے شاعر کا مترجم بھی اتنا ہی بڑا ہو تو تب ہی دوسری زبان بولنے سمجھنے میں اس شاعر کا مقام بنتا ہے، ورنہ اگر مترجم کم زور ہو تو بڑا شاعر بھی پِٹ جاتا ہے۔ بعد ازاں قاری یہی رائے قائم کرتا ہے کہ فلاں زبان میں شاعری کا پہلو کم زور ہے۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد بھی "۱۰۱ چینی نظمیں" نامی کتاب کے مداحوں میں شامل ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس کتاب کے مترجم نے اپنی محنت اور شوق سے اس سرمایہ ِ خوش رنگ کے چہرے سے زمانوں کی گرد جھاڑ کر اِسے اردو اور انگریزی کے تازہ شعری قالبوں میں پیش کر کے نئے زمانے کو چین کے ماضی سے روشناس کروانے کا جتن کیا ہے۔ وہ اس ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "یہ نظمیں قدیم چینی معاشرت، رہن سہن، آداب و اطوار، جذب و احساس، عقائد و توہمات اور خیالات و نظریات کا مرقع ہیں اور اِن کے آئینے میں قدیم زمانے کا چین پورے رنگوں کے ساتھ عکس فگن ہے۔ ان نظموں میں محض جنگ و جدل کے قصے اور قبیلوں کی باہمی معرکہ آرائی کی تصویریں ہی نہیں ملتیں بلکہ دل اور اہلِ دل کے جذب و شوق کی داستانیں بھی موجود ہیں۔ فصلِ بہار کے خوش رنگ پھول، موسمِ بہار کے دل کش مناظر اور ہجر و وصل کی لذت سے چھلکتے دل ان نظموں کے باطن میں رقص کناں ہیں۔" (۵۳)

ڈاکٹر صفدر علی شاہ نے جن چینی نظموں کو اردو اور چینی زبانوں میں منظوم شکل میں ترجمہ کیا ہے، ان کی اصل متن یعنی چینی زبان میں انتخاب کرنے کی ذمہ داری سرانجام دینے والی چینی شخصیات میں ڈاکٹر (سکارلٹ) شیانگ یانگ بھی شامل ہیں۔ کتاب کی ابتداء میں درج اُن کا پیش لفظ خاصے کی چیز ہے۔ چینی ثقافت

اور ادب سے براہ راست واقفیت رکھنے کے باعث چینی ادب کے بارے میں ان کی رائے سے اختلاف کی نوعیت دشوار ہے۔ انہوں نے بھرپور محنت و مشقت کے بعد قدیم چینی ادب میں سے بہترین نظموں کا انتخاب کیا اور ڈاکٹر صفدر علی شاہ سے مشاورت کرتے ہوئے ، ان کے انگریزی ترجمے میں اپنی آراء شامل کرتیں۔ بعد ازاں اس انگریزی ترجمے کو اردو زبان میں منتقل کر کے اس عمل کو مکمل کرتے۔ ڈاکٹر شیانگ یانگ "۱۰۱ چینی نظمیں" پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتی ہیں:-

> "ہم نے بڑی شاندار نظموں کا انتخاب کیا ہے، جس میں اُس دور کو، وسطی ایشیا کے وسیع میدانوں میں، پامیر کی کہانی کو دکھایا گیا ہے اور ریشم کی نوزائیدہ سڑک کو پھلنے پھولنے دیا، ہم نے کچھ گھریلو نظموں کا انتخاب بھی کیا تا کہ قارئین کو ایک ہزار سال کے گھر اور ملک کے تازہ احساسات کو محسوس کیا جاسکے۔ ہم نے کچھ خوب صورت نظموں کا انتخاب کیا تا کہ قارئین کو تھانگ خاندان کے عروج کے زمانے میں مختلف ثقافتی علاقوں کی زندگی کے مناظر کو محسوس کیا جاسکے۔ (۵۴)

نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، نسٹ میں قائم کیے گئے چائنا سٹڈی سنٹر میں اپنے پیشہ وارانہ فرائض سرانجام دینے والی ڈاکٹر (سکارلٹ) شیانگ یانگ کا خیال ہے کہ اس کتاب کا مقصد زبان کی اُن رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو دو مختلف تہذیبوں کی حامل دوست اقوام کو سمجھنے میں دقت کا باعث بن رہی ہیں۔ سال ہا سال سے چینی سماج میں جس ادبی ذخیرے کو محفوظ کر کے نئی نسلوں تک منتقل کیا جارہا ہے، اس سے اردو زبان بولنے والے افراد کو روشناس کروانا بلاشبہ ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ چینی نظموں کے اس انتخاب میں تھانگ عہد کی شاعری کو نمایاں طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یوں تو چینی تاریخ کا مکمل مطالعہ ہی اُس کے سیاسی، سماجی اور معاشی امور سے واقفیت فراہم کرتا ہے، تاہم تھانگ عہد چینی تاریخ کا زریں دور تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں علم و فضل کی ترقی روزافزوں تھی۔ چینی ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:-

> "تھانگ عہد" (۶۱۸ء سے ۹۰۶ء) چینی شعر و ادب اور فلسفہ کا زریں دور تھا اور خصوصی طور پر چینی شاعری کے لیے یہ دوسرے (چھویوآن کے زمانے کے بعد) نشاۃ الثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تین سو برسوں سے بھی قلیل مدت کے اس دور کے متعلق

امر مشہور ہے کہ ہر دسواں شخص ایک شاعر ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے تقریباً "۷۰ فیصد نے اپنی کلیات شائع کیں اور ہر چہار سو ایک ہزار کی آبادی میں کوئی ۱۰ مکاتبِ شعری ہوا کرتے تھے۔ ابھی اسی عہد کی اسی فیصد تحریریں موجود ہیں۔ چینی شاعری کے اس زریں دور کی نمائندوں کی صورت میں بیک وقت لی پو، وانگ وے ای، طوفو، پوچو ای اور لی شانگیان کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان پانچ شعرانے چوہہ چر گوئی کو اعلیٰ اور منفرد مقام عطا کیا۔ بحر وزن اور قافیہ آرائی سے متعلق تجربات بھی ہوئے اور تصوف و عشقِ حقیقی سے عشقِ مجازی تک کے مختلف خیالات پر مضامین باندھے گئے۔"(۵۵)

"۱۰۱ چینی نظمیں" دراصل تین قسم کی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کی نظمیں غنائیہ اور گیتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں تھانگ عہد کی تہذیبی روایات بدرجہ اولیٰ دکھائی دیتی ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان " پُرسکون رات میں رات کے دھارے" ہے۔ پاورقی نوٹ میں موجود تصریح کے مطابق یہ نظم تھانگ سلطنت کے نامی گرامی شہنشاہ شو آن زانگ کے دورِ حکومت کے ۱۴ویں سال یعنی ۱۵ ستمبر ۷۲۶ء کو لکھی گئی تھی۔ اس نظم کے شاعر کا نام لی پائی بیان کیا جاتا ہے۔ اس شاہکار نظم کی تخلیق کے وقت شاعر کی عمر ۲۶ سال تھی تاہم وہ ایک موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث یانگ چو نامی علاقے کی ایک سرائے میں مقیم تھا۔ نظم اپنے اختصار اور سلاست کے باعث تخلیقی ہنرمندی کا مرقع ہے۔ نظم میں شاعر نے اپنی علالت کے دوران درپیش صورت حال کا ذکر کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:-

"سامنے کھڑکی سے آتی چاندنی ہے ضو فشاں
کہر کی اک تہہ دکھے ہے فرش پر منظر کشاں
سر اٹھا کر دیکھتا ہوں چاند کا حسن و جمال
سر جھکا کر یاد کرتا ہوں حدیثِ دوستاں"(۵۶)

لی پائی ہی کی ایک اور نظم " فجر کے وقت شہر ابیض سے روانگی" ۷۵۹ء میں لکھی گئی ۔ اس میں سیچو آن کے دارلحکومت سے گزرتے ہوئے شاعر کو معافی کا حکم نامہ ملنے کے بعد اپنے آبائی وطن کی جانب سفر اختیار کرنے کی اجازت ملی۔ چینی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرنے والے اس ترجمے میں چینی اقدار کا اظہار دل کش انداز میں کیا گیا ہے۔ چینی سماج میں صدیوں سے یہ روایت موجود ہے کہ وہ اپنے گھروں میں

جھینگر پالنے کو خوش قسمتی کی علامت تصور کرتے ہیں۔ چین میں جھینگر کی مدھر اور مدھم آواز کو گھر بار کے لیے نیک فال تصور کرتے ہوئے بڑے ناز و نعم سے پالا جاتا ہے۔ ادبی تحریروں میں اس روایت کا جابجا تذکرہ ملتا ہے۔ " جھینگر" کے عنوان سے یہ نظم تھانگ سلطنت کے دوسرے شہنشاہ لی شیمن کے دور میں چینی شاعر یُو شی نان نے لکھی۔ اس شاعر کو حکومت میں ادبی ترویج و ترقی کی غرض سے اہم عہدے پر تعینات کیا گیا۔ یہ نظم اسی سلسلے میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی، جس میں اعلیٰ انسانی اوصاف کو سماجی برتری کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ جو مقام و مرتبہ انسان کو مسلسل محنت اور کوشش سے ملتا ہے، وہی اس کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ فاضل شاعر کی ایک اور اہم نظم "کوہ لُو پر آبشار کا منظر" بھی منظر نگاری کا خوب صورت مرقع معلوم ہوتی ہے۔

تہوار کسی بھی تہذیب کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ چین میں ایک تہوار قدیم دور سے منایا جاتا رہا ہے۔ اس تہوار کو دوہر انواں یا اونچائی پر چڑھنے والا تہوار کہا جاتا ہے۔ اس خاص دن چینی لوگ ایک مخصوص پودا، جسے ڈاگ وڈ یا تیز بُو والا پودا کہلاتا ہے، اُس کی شاخیں ہاتھوں میں لے کر پہاڑوں کا سفر کرتے تھے۔ اس سرگرمی کا بنیادی مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس طرح کرنے سے انہیں بدروحوں سے نجات مل جائے گی اور انہیں اگلے سال تک بدقسمتی سے پالا نہیں پڑے گا۔

اسی پس منظر میں وانگ وے کی نظم "۹ ستمبر کے تہوار پر اپنے بھائیوں کی یاد میں گم" نامی نظم میں اُس شخص کے جذبات کو زبان دی گئی ہے جو تلاشِ روزگار میں سلطنت کے پایہ تخت میں مقیم ہے۔ اس تہوار کے موقع پر وہ اپنے بہن بھائیوں اور دیگر عزیزوں سے دور غم و حسرت کی تصویر بنا بیٹھا ہے۔ اُس کے جذبات دراصل ہر اُس انسان کے دل کی آواز ہیں جو خوشیوں کو انمول موقع پر اپنے گھر بار سے دور پردیس میں حالات کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ اس نوعیت کی شاعری ہند آریائی تہذیب کی زبانوں سمیت دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ شاعر وانگ وے ہی کی ایک اور نظم "محبت کے بیج" اعلیٰ انسانی جذبات سے بھرپور ہے۔ اس میں زرعی جاگیر دار سماج کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے، جس میں اساطیری کردار اپنے پورے جوبن کے ساتھ دکھائی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرخ لوبیے کے بیج کو محبت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اس بارے میں اہلِ چین کے ہاں سینہ بہ سینہ روایت موجود رہی ہے کہ کسی عورت کا شوہر ایک جنگ میں وفات پا گیا۔ اپنے شوہر کے غم میں نڈھال یہ عورت دن رات آنسو بہاتی رہی، یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی گئی۔ حیران کن طور پر یہ عورت لوبیے کے سرخ دانوں میں بدل گئی، یوں یہ بیج اہلِ چین میں محبت کی علامت کے طور پر مقبول ہو گئے۔ اسی طرح فاضل شاعر کی ایک اور نظم "بانس کے جنگل میں کٹیا" کی مانند زرعی پس منظر رکھنے والے طبقات کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:-

"سرخ پیکر لوبیا، دکھن میں ہے جس کا جہاں
موسمِ گل سے جڑی ہے اس کی ساری داستاں
جس قدر ممکن ہے بھر لو اپنی مٹھی میں انہیں
ہے محبت کی نشانی دوستوں کے درمیاں"(۵۷)

زیرِ نظر چینی نظموں کے تراجم میں سب سے خوب صورت نظم "محنت کش دہقان" کے عنوان سے ہے۔ لی شین کی یہ نظم ان حقائق سے آگاہ کرتی ہے کہ کسی بھی سماج میں ترقی کا سفر کن وجوہات کی بنا پر مشکلات سے دوچار رہتا ہے۔ جاگیرداری نظام میں محنت کش طبقات کی محنت و ریاضت کا صلہ اس نادیدہ طاقت کو مل جاتا ہے جو اپنی اجارہ داری کی بدولت معاشی عدم مساوات کا نظام بنائے ہوئے ہے۔ لی شین انہیں سرمایہ پرست طاقتوں کو ببانگِ دہل للکارتے ہوئے اس جانب متوجہ کر رہا ہے کہ دنیا میں بھوک و افلاس کا ماحول انسانوں ہی کا پیدا کردہ ہے۔ غریب محنت کش کسانوں اور مزدوروں کی محنت کا پورا صلہ دینے کے بجائے ایسا ماحول تشکیل دے دیا گیا ہے جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس نظم کو تھانگ خاندان کے شہنشاہ ڈیزونگ کے دورِ حکومت کے پندرہ برس مکمل ہو جانے کے بعد لکھا گیا۔ اس دور کو "ان شی بغاوت" کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ سیاسی خلفشار اور مالی ابتری کے باعث مزدور اور کسان بے بسی اور کسمپرسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔۔ یہ نظم بلاشبہ اپنی معنی و فکر کے اعتبار سے چینی ادب کی چند بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:-

"فصلِ گل میں بیج بوئے ہاتھ سے اخلاص سے
بھر گئے کھلیان پیداوار سے اجناس سے

کھیت سارے بار ور ہیں ہر کہیں اس بار بھی
پھر بھی دہقاں مر رہے ہیں بھوک سے افلاس سے" (۵۸)

غریب محنت کش طبقے کے حق میں آواز اٹھانا، ایک آزاد اور جمہوریت پسند معاشرے کی بنیادی خوبی ہے۔ لی شین کی اس نظم میں جہاں نظامِ ظلم کے خلاف بے باک انداز میں آواز بلند کی گئی ہے وہیں اس جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ محنت کش طبقے کی ساری زندگی کی کاوش کے باوجود بھی انہیں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ استحصالی معاشروں میں ایسی روش بہت ہی شرم ناک انداز میں رائج ہے۔ محنت کا جائز صلہ ملنا تو در کنار، جسم و روح کے رشتے کو بر قرار رکھنا بھی اِن کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے میں محنت سے جی چرانا، اُس سماج کا وطیرہ بن جاتا ہے۔ اسی تصور کی مزید وضاحت "محنت کش دہقان-۲" نامی نظم میں کی گئی ہے۔ شاعر لی شین کی یہ نظم ملاحظہ ہو:-

"چلچلاتی دھوپ میں گھرپا چلایا دَم بہ دَم
کھیت میں اپنا پسینہ بھی بھایا ہر قدم
بے خبر کم جانتے ہیں طشتری پر نعمتیں
ہر نوالہ دین ہے دہقان کی بہرِ کرم" (۵۹)

"شُو کے وزیر اعظم کا مقبرہ" چینی شاعر تُو فُو کی آٹھ مصرعوں پر مشتمل ایک نظم ہے جس میں چین کے ایک معروف سیاسی رہنما کے بارے میں عوامی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو حکمران اپنی عوام کی خدمت میں پیش پیش رہتے ہیں، عوام ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی انہیں دل و جان سے یاد رکھتے ہیں۔ مینگ چیاؤ کی نظم "مسافر کا گیت" ایک ماں کے بارے میں بیٹے کے جذبات کا بیان پیش کرتی ہے۔ دنیا کی ہر ماں اپنی اولاد کے لیے اپنا آرام قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسے ہی جذبات کا بیان اس نظم میں ملتا ہے۔ تو مُو کی نظم "پہاڑی سفر" منظر نگاری کی ایک خوب صورت مثال ہے جو ہمیں فطرت کی خوب صورت اور دل کشی کے بارے میں وضاحت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ چینی ادب کے ایک گم نام شاعر کی ایک اہم نظم "قیمتی کم خواب" کے نام سے شاملِ کتاب ہے۔ نظم میں ایک نصیحت کی گئی ہے کہ محض لباس کا ہونا ہی سب کچھ نہیں ہے بل کہ لباس کے ساتھ ساتھ کردار کا ہونا اشد ضروری ہے۔ لی پِن کی نظم "دریائے ہان کو عبور کرتے

ہوئے" میں ایک سیاسی شخص کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ شخص اپنی زندگی میں اتار چڑھاؤ کے باعث پریشانیوں سے دوچار ہوتا رہا۔ تُو مُو کی نظم "چھن خوائی دریا پر کشتی کا پڑاؤ" میں دریائے چھن خوائی کا ذکر ہے جو چھن خاندان کے پہلے شہنشاہ نے مرکزی دریا سے زمین کھود کر تعمیر کروایا تھا۔ اس نظم میں جہاں چین کے تاریخی مقام کو مذکور کیا گیا ہے وہیں اس امر پر بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ تغیر ایسا آفاقی اصول ہے جس کی بنیاد پر کائنات میں ارتقا کا سفر آگے سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

چین میں عہدِ قدیم میں اعلی سرکاری ملازمت کا حصول ایک مقابلے کے امتحان میں کامیابی سے مشروط تھا۔ اس مقابلے میں شریک امیدواروں کو کنفیوشس کے افکار کو ازبر کرنا پڑتا تھا۔ اس مقابلے میں کامیابی کے بعد سرکاری افسران کا تقرر عمل میں لایا جاتا تھا۔ مینگ چیاؤ کی نظم "شاہی امتحان میں کامیابی پر" میں بنیادی طور پر اس جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ ایک انسان جب دن رات محنت و ریاضت کر کے کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے، تو ان لمحات میں اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ درحقیقت انسان کی پوری زندگی ہی ایک امتحان ہے۔ آزمائش اور جانچ کی یہ نوعیت ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔ نظم کے آخر پر موجود حاشیے کے مطابق ۷۹۶ء میں ۴۶ سال کی عمر میں مینگ چیاؤ کو اس کی والدہ نے تیسری بار سرکاری اہلکاروں کے انتخاب کے لیے دار لحکومت جانے کا کہا۔ آخری بار وہ اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ موسمِ خزاں میں لیے جانے والے اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں کو اگلے سال بہار کے موسم میں نتائج سے باخبر کیا جاتا تھا۔ شاہی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے ایک اور شخص کی کہانی لی پِن کی نظم "دریائے ہان کو عبور کرتے ہوئے" بھی اہم نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ ناقدین کا ایک گروہ اس بات پر مُصر ہے کہ یہ نظم سونگ چی وِن کی ہے۔ اس نے بھی سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے امتحان میں شرکت کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔

تھانگ شاہی عہد چینی ادبی تاریخ میں بہت اہم مقام کا حامل ہے۔ یہ دور تقریباً "نوے برس تک محیط ہے۔ اس عرصے میں شاہی سرپرستی میں شعر و ادب کے منظر نامے پر گراں قدر نقوش ثبت ہوئے، جن کے اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ تھانگ عہد کی ہی ایک رومانوی نظم "وینا کے سُر" لی تو آن کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک نوخیز خوبرو دوشیزہ کی کہانی ہے جو آلاتِ موسیقی میں سے "وینا" بجایا کرتی

تھی۔ چاؤ نامی ایک نوجوان اس لڑکی کے بکھیرے ہوئے سُروں میں مست ہو جاتا ہے اور عشق کی وادی کا مسافر بن جاتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسے سپہ سالار کا منصب بھی ملا۔ سید اشتیاق الحسن، جنہوں نے تھانگ عہد کی دس کہانیوں کو اردو زبان میں ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو چین کے معروف ادارے "غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر، بیجنگ" سے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا گیا۔ اس ترجمے میں تھانگ عہد کی ادبی اہمیت کے پیشِ نظر یوں رقم طراز ہیں:-

> "تھانگ شاہی عہد (۶۱۸ء تا ۹۰۸ء) چینی ادب میں نثر اور شاعری دونوں کے اعتبار سے سنہری دور مانا جاتا ہے۔۔۔ اس دور کی پچاس ہزار سے زائد نظمیں اور چار سو سے زائد کہانیاں آج بھی موجود ہیں، جو قدیم چین کی عظیم تہذیب کی بھرپور غمازی کرتی ہیں اور بلاشبہ عالمی ادب کے لئے ایک بڑی اہم دین ہیں۔"[۶۰]

چینی نظموں کے اس انتخاب میں ماحولیاتی تنوع کے بارے میں بھی ایک نظم شامل ہے۔ شاعر خان یو کی نظم "دارالحکومت میں بہار کی آمد: چانگ چی کے نام-۱" ماحول کو درپیش سموگ جیسے سنگین ماحولیاتی مسئلے کے بارے میں شعور بیدار کرنے والی کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظم کے حاشئیے میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ماحول میں کثافت یا آلودگی، جسے سموک ولو (Smoke willow) کہا جاتا ہے، اس کا تدارک بارش جیسی قدرتی نعمت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ماحول کے مختلف عناصر کے بارے میں چینی شعراء نے بہت گہرا تفکر کیا ہے اور اُس کے بارے میں اپنے افکار کو منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔

چینی شاعری کے مزاج اور موضوعات پر گہری نظر رکھنے والے یحییٰ امجد کا خیال ہے کہ ہزاروں برس پر محیط چینی شاعری کی روایت میں ایک عنصر مشترکہ ہے۔ یہ عنصر مادرِ وطن سے محبت کا بے نظیر جذبہ ہے۔ وطن کے مظاہر اور اُس کے مناظر کی محبت آمیز تصویر کشی میں ہر دبستان کا شاعر دکھائی دیتا ہے۔ وطن کی محبت کا جذبہ اہلِ چین کے ہاں ایک فطری اصول کے طور پر پایا جاتا ہے۔ دنیا کی اکثر اقوام کے ہاں نو آبادیاتی نظام کے تحت دورِ غلامی کی بدترین مثالیں موجود ہیں۔ چین اس عفریت سے محفوظ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبی اعتبار سے بھی چینی ارتقاء میں کسی نوع کا تعطل نہیں رہا۔ وطن پرستی کے اسی جذبے کے شعری اظہار کے بارے میں یحییٰ امجد لکھتے ہیں کہ

"بڑی چیز جو ہزاروں سال سے چینی شاعری میں مشترک نظر آتی ہے وہ ہے مادرِ وطن کے مظاہر اور اُس کے مناظر کی محبت آمیز تصویر کشی، اس میں ہر مزاج اور ہر انداز کے شاعر یکساں نظر آتے ہیں۔ لی پو بادلوں کے تکیے پر سر رکھے محو سرور ہے تو جدید انقلابی شاعر اپنے ملک کو ترقی کرتے دیکھ کر خوش ہے اور کان کن کوئلوں کی آبشار کے نغمے میں مست ہے۔ ہر عہد میں اُس وقت کے شعور اور روح عصر کے مطابق اور پھر ہر شعر اپنی افتادِ طبع کے مطابق بری منظروں کا انتخاب کر کے اُن کی تصویر کشی کرتا ہے مگر وطن کے ان منظروں سے بے اندازہ محبت سب کے ہاں مشترک ہے۔"[۶۱]

چینی شاعری کے اس پہلو پر یحیٰی امجد کے اس خیال سے اتفاق ضروری ہے کہ چینی شاعروں کے اس رویئے کو نہ تو مغرب کے فطرت پرستانہ شعری ادب کے متوازی تصور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اردو ادب کے قصائد یا مثنویوں کے برابر۔ دراصل یہ وطن کی محبت کے وہ جذبات ہیں جو لینڈ اسکیپ کی صورت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس روایت میں قدیمی چینی شاعر چھویو آن سے لے کر معاصر شعراء کے کلام کو بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں وانگ وے کی کتاب "بانس کے جنگل میں کٹیا" وے ینگ اُو کی نظم "چھُوچُو کے مغرب میں پہاڑی ندی"، وانگ اُن شی کی نظم "ہوا میں معلق چوٹی پر چڑھتے ہوئے"، وانگ وے کی نظم "پھولوں کے گرنے کے احساس کا وقت" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لی پائی کی نظم "بادِ بہاری" اس انتخاب کے پہلے حصے یعنی غنائیہ گیتوں پر مشتمل نظموں میں سے خاص فن پارہ ہے۔ اس میں ایک عورت اپنے شوہر کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے کفِ افسوس مل رہی ہے۔ اس کا شوہر ایک جنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں جان کی بازی ہار گیا۔ یوں یہ عورت اپنے سہاگ کے اجڑنے پر ماتم کناں ہو کر بادی النظر میں یہ پیغام دے رہی ہے کہ انسانی تاریخ میں جنگوں کے نتیجے میں عورت ذات کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ کئی گھروں میں معصوم بلکتے ہوئے بچے اپنے والد کی امید پر بیٹھے حسرت ویاس کی تصویر بن گئے ہیں۔ ان گھروں کے چولہے ٹھنڈے پڑ گئے۔ ایسی مہم جوئی جو انسانوں کو ہلاکت سے دوچار کر دے، کسی بھی طور برداشت نہیں کی جاسکتی۔ یوں غنایئے نظموں کے اس حصے میں چینی شاعری کی ایک اور خصوصیت آشکار ہوتی ہے۔ اس بارے میں یحیٰی امجد لکھتے ہیں۔

"چینی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکز و محور عشقِ محض نہیں ہے بل کہ اس میں جملہ انسانی رشتوں سے وابستہ محبتوں کا نہایت خوب صورت اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر فقط غمِ جاں اور غمِ جاناں ہی میں الجھا ہوا نہیں بلکہ وہ بھائی بہن، بیٹے بیٹی، پوتوں پوتیوں، بھتیجوں، دوستوں اور ہمسایوں، محلے داروں بلکہ اہلِ قریہ سے اپنی محبت کا اظہار بھی اُسی وارفتگی سے کرتا ہے جس قدر دوسری زبانوں کے عشقیہ شاعر اپنے محبوب سے کرتے ہیں۔ ۔۔انسانی رشتوں اور محبتوں کی ہری بھری لہلہاتی فصل چینی شاعری میں ٹھاٹیں مارتے سمندر کی طرح ہے اس سلسلے میں پوچو کی شاعری اپنی مثال آپ ہے۔"(۶۳)

ڈاکٹر صفدر علی شاہ کے نظمیہ ترجمے کا دوسرا حصہ سرحدی نظموں کے نام سے ہے۔ اس میں ۶۷ نظمیں شامل ہیں۔ بنیادی طور پر یہ نظمیں عسکری تاریخ کی منظوم شکل ہیں۔ چین شمال مشرقی سرحدات سے طویل عرصے سے یورشوں کی زد میں رہا ہے۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے عظیم دیوارِ چین کی تعمیر کا فیصلہ ہوا، جو آج تک اقوامِ عالم کے لیے ایک عجوبہ ہے۔ اس نوعیت کی دفاعی و عسکری سرگرمیوں پر انسانی وسائل کو بڑے پیمانے پر بروئے کار لایا گیا۔ ایسے میں کئی ایک انسانی المیوں کا جنم بھی ہوا۔ چینی تاریخ میں اس پہلو سے لکھی گئی شاعری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسے سرحدی شاعری کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں منظر کشی، گھر سے دوری پر افسردگی، لطیف جذبات کا اظہار اور ہیرو پرستی کا رجحان نمایاں ہے۔

"گوشو کا گیت" سرحدی نظموں میں اولین ہے۔ اس میں ایک نام ور چینی سپہ سالار کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے، جو اپنی جنگی حکمت عملی کے باعث کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس جرنیل کی ہیبت سے دشمن کی صفوں پر خوف طاری رہتا تھا۔ عظیم دیوارِ چین کی تعمیر کا آغاز جس علاقے سے ہوا، اُسی علاقے کو دشمن کے حملوں سے بچانے کے لیے انہیں کمان دی گئی۔ انہوں نے اپنی ماتحت افواج کو بڑی مہارت سے منظم کیا اور دیوارِ چین کے سنگِ بنیاد کو یقینی بنایا۔ زیرِ نظر کتاب کے مترجم ڈاکٹر صفدر علی شاہ درحقیقت افواجِ پاکستان میں ایک طویل عرصے تک اپنی پیشہ وارانہ فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ فوجی نظم و نسق اور ماحول سے بخوبی

آگاہی ہونے کے باعث ان کی نظموں میں سے زیادہ تر کا تعلق سرحدی امور سے ہے۔ اپنی پیشہ وارانہ مہارت کے بل بوتے پر انہوں نے اس اہم انسانی پہلو پر بھی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ان کی اس ضمن میں پہلی نظم "گوشو کا گیت" شان دار شعری ترجمے کی نمایاں مثال ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ہے درخشاں آسماں پر دُبِ اکبر شان سے
مستعد گوشُو کھڑا ہے تیغ تانے آن سے
دیکھ کے گھوڑا مگر ہے کس میں دَم آگے بڑھے
ہو مخل لِن تھاؤ میں جو ہاتھ دھوئے جان سے (۶۳)

چینی شاعر تُومُو کی نظم "چھپی کی جنگ" میں تیسری صدی عیسوی میں لڑی جانے والی جنگ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے جنگی سازوسامان، حکمتِ عملی، فوجی نظم و نسق اور ہتھیاروں کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ جنگی پس منظر میں لکھی گئی نظم "بابِ چی مِن سے نظارہ" ژُویونگ کی خوب صورت نظم ہے جس میں فوج کے سپہ سالار کے خیمے کے اردگرد کے ماحول کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مترجم کے نزدیک اس نظم کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فاضل مترجم بذاتِ خود ایسی ہی صورت حال سے گزرتے رہے ہیں۔ افواج میں پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران انہیں بارہا ایسی نوعیتوں کا سامنا ہوتا رہا ہے۔ شاعر اور مترجم کو جو ماحول ملا، اس میں یکسانیت کے باعث ایک بھرپور تخلیقی شاہکار اردو زبان میں سامنے آیا۔

جنگیں انسانی تہذیب میں ایک اہم عنصر کے طور پر موجود رہی ہیں۔ تہذیبوں کی شکست وریخت میں جنگوں کو مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تہذیبی ترقی کو متاثر کرنے اور انسانی حرمت کو پائمال کرنے میں جنگوں کا کردار تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں بھی تخلیق کاروں کے ہاں طاقت کے بہیمانہ استعمال کے خلاف ایک جذبہ اور احساس موجود رہا ہے۔ اس کی نمایاں مثال ساؤسُنگ کی نظم "جنگ کا ایک سال: چی خائی" میں ملتی ہے۔ دقیانوسی جاگیردارانہ نظام کے تحفظ کے لیے لڑی جانے والی جنگوں میں انسانیت کا قتلِ عام چینی شاعروں کے لیے ناقابلِ قبول طرزِ عمل ہے۔ ساؤسُنگ کی اگلی نظم میں انسانی خون کی ارزانی پر جس انداز سے تنقید کی گئی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے:-

"دیکھ دریا پر لڑائی دیوتا ہیں بد گماں
ہیں پریشاں جان کر گھمسان کا رَن ہے جہاں
کون کہتا ہے کہ دریا میں تو ہے ابدی سکوں
موجزن ہے خونِ ناحق پانیوں کے درمیاں"(۶۴)

ساؤسُنگ کی یہ فکر انگیز نظم در حقیقت اُس انسانی المیے کی وضاحت کرتی دکھائی دیتی ہے جس میں انسانی خون کی بے قدری کو موضوع بنایا گیاہے۔ جنگوں کی بھینٹ چڑھنے والے انسانوں کی نسلیں بھی اس کشت وخون سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ فوجی اہلکار بھی بے مقصد جنگوں سے حوصلہ ہار جاتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کو اظہار کرنے سے قاصر رہتے ہیں، مگر ان جذبات کو کسی بھی صورت ختم نہیں کیا جاسکا۔ وانگ خان کی نظم "لیانگ چُوگیت" در حقیقت محاذ پر عرصے سے ڈٹے ان سپاہیوں کے دلی جذبات ہیں جو بے مقصد جنگوں میں اپنا خون بہا رہے ہیں۔ لیو چونگ یونگ نے "سپاہی کا شکوہ" کے عنوان سے شاہکار نظم لکھ کر سماجی امن وسکون تاراج کرنیوالی طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا واضح اعلان کر دیا ہے۔ اس نظم ہر مصرعہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ مسلسل جنگی ماحول نہ صرف قوموں کو مفلوج کر دیتی ہے بل کہ فوج کو بھی بزدلی کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ لیو چونگ یونگ کی نظم ملاحظہ ہو:-

"درہ یومن اور خے خی پر گزری عمر یاں
اک مسلسل جنگ ہے مشقوں کے باہم درمیاں
تازہ قبریں فصلِ گل میں برف باری کا سماں
کوہ سیہ پر، یانگسی پر مارا ماری ہے رواں"(۶۵)

جنگیں بجا طور پر انسانی المیوں کو جنم دیتی ہیں۔ اس میں ایک جانب تو انسانی خون بے بہا ضائع ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ خاندانی نظام بھی اس کیفیت میں حسرت و غم کی گھٹاٹوپ وادیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ وانگ چھانگ لنگ کی "عسکری زندگی پر نظمیں" اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جس میں ایک بیوی اپنے شوہر کی جدائی میں آنسو بہا رہی ہے۔ فاضل مترجم نے اس کیفیت کو کامل عمدگی اور مہارت سے ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ محاذ جنگ پر ضروریاتِ زندگی کی دستیابی ہوتی ہے، آرام کرنے کے مواقع بھی بسا

اوقات میسر آجاتے ہیں۔ اس دوران فوجی اہلکار موسیقی سے بھی محظوظ ہوتے ہیں مگر موسیقی کی ان دھنوں میں ان کے دل میں پوشیدہ غموں کی واضح جھلک سنائی دیتی ہے۔ تیسری نظم میں اُن سرفروشوں کی لازوال قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے والی جرنیل کا اعلان سنائی دیتا ہے، جس میں وہ قربانی دینے والے سرفروشوں کے جسم کی باقیات کو بکھرا ہوا دیکھ کر انہیں عزت واحترام سے مناسب مقام پر منتقل کرنے کا حکم صادر کرتا ہے۔ اردو ترجمے میں بطورِ خاص ایسے الفاظ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو ایک جرنیل کے طرزِ تخاطب کے شایانِ شان ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو:-

"ہو رہے ہیں زرد ایلم سرحدی اس گاؤں میں
چھپ گیا جنگ کا میداں گہری چھاؤں میں
شہ کو بتلاؤ کہ وہ دفنائیں بکھری ہڈیاں
پاسبانوں کو نہ چھوڑیں اس طرح صحراؤں میں"(۶۶)

تاہم اس کیفیت کے برعکس محاذِ جنگ کے آس پاس قدرتی حسن بھی شاعرانہ طبیعت کو اپنی گرفت میں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں "چار گیتوں پر مشتمل قصہ" جیسی نظم بہترین شاعری کا مرقع ہے جس میں موسمِ خزاں کے رنگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تُوفُو کی نظم موسمِ بہار میں جنگی کیفیت سے دوچار فوجیوں اور عوام کے جذبہِ جمال کی بہترین عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ توفو کی یہ نظم دراصل مسلسل جنگ کے خلاف ایک فطری ردِ عمل ہے۔ انسان کا جذبہِ حبِ جمال ایسی صلاحیت ہے جس کے بل بوتے پر انسان نے پوری دنیا میں ایجادات و دریافت کے عمل کو آگے سے آگے بڑھایا ہے۔ جمالیاتی ذوق کی تسکین در حقیقت وہ لازمی ضرورت ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز مقام پر فائز کرتی ہے۔ چینی شاعری کی یہ خصوصیت از حد منفرد ہے جس میں فطری حسن کو سادگی اور سلاست سے بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس روایت کو قدیم شعرا کرام کے علاوہ معاصر شعرا نے بھی اختیار کیا ہے۔ اس امر کی وضاحت ماقبل بھی کی گئی تھی کہ چینی تہذیب کا مرکز ارضی ہے نہ کہ سماوی۔ اسی پس منظر میں اگر تُوفُو کی اس نظم کا جائزہ لیں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ آتی ہے کہ فطرت کا بیان چینی شاعری کا وہ نمایاں وصف ہے جو اسے دیگر زبانوں کی شاعری سے منفرد مقام فراہم کرتی ہیں۔ تُوفُو کی نظم "موسمِ بہار" کا پہلا بند عسکری شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔

جنگ کی بربادیوں میں آبشاریں ہیں رواں
شہرِ گل میں ہر جگہ ہے گھاس وافر خَس جواں
غم سمیٹے پھولوں کو دیکھو تو دل ہو خوں چکاں
گیت سُن کہ پنچھیوں کے جانے کی خواہش کہاں (۶۷)

چینی تاریخ کے اہم دور تھانگ عہد سے تعلق رکھنے والے شاعر توفو کی اپنی زندگی ان کے کلام میں جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کی پیدائش ۷۱۲ء میں ایک علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔ گھر کے علمی ماحول کی وجہ سے انہیں ادب سے رغبت ہوئی۔ اس زمانے میں سیاسی عدم استحکام کے باعث ریاست انتشار کا شکار تھی۔ تاہم طوفو نے ان حالات کو اپنے کلام کے ذریعے سے محفوظ کر کے آنے والی نسلوں تک منتقل کر دیا۔ یحییٰ امجد اپنی کتاب "چینی شاعری" میں طوفو کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

> "طوفو نے اپنی سماج کی بلند ترین اور پست ترین زندگی کا صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ خود اُس میں سے ہو کر گزرا۔ بالخصوص اس نے غریبوں، فاقہ مستوں اور بیماری اور مظلومیت کے ہاتھوں نڈھال محنت کشوں کی زندگی کا اُن کے درمیان رہ کر مشاہدہ کیا اور ہر سانس میں اُن کا شریکِ حال رہا۔ لہٰذا اُن کی نظموں میں خود بخود اُس عہد کی معاشرت کی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چینی نقاد اس کی شاعری کو "منظوم تاریخ" کہتے ہیں۔"(۶۸)

ہار یا جیت جنگوں کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں جب دو فریق ایک دوسرے سے باہم جھگڑتے ہیں تو وہ اپنی کامیابی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ لڑائی کے دوران داؤ پیچ لڑانے میں وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں جان لڑا دیتے ہیں۔ تاہم فطرت کے اصولوں کے تحت جو فریق زیادہ ہوشیاری اور کامیاب حکمتِ عملی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ آخر کار کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ فتح کا جشن منانا جنگی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ کئی فوجیں فتح کے نشے میں اپنی اخلاقی اقدار کو بھی بھلا بیٹھتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر معصوم و بے گناہ غیر مسلح شہریوں کا قتلِ عام، خواتین کی بے حرمتی، مذہبی علامات کی مسماری، بازاروں اور گلی کوچوں میں لوٹ مار، فصلوں اور کھیتوں میں آتش زدگی جیسی بداعمالیاں انسانی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ تاہم اخلاقی عہد و پیمان کو برتر خیال کرنے والی اقوام کے ہاں اس موقع پر بھی اعلیٰ ظرفی کا

شاندار مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر صفدر علی شاہ کے ان ترجمے میں جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد پیش آنے والی صورتِ حال کو بھی منظوم کیا گیا ہے، جس کی بدولت چینی قوم کے اس پہلو سے بھی آگاہی ملتی ہے کہ فتح کے نشے میں مست ہونے کے بجائے، وہ کس انداز سے اپنی خوشیوں کا یادگار بناتے ہیں۔چانگ یوا ے کی نظم "یُوچُو میں رات کو مے کشی" چینی عسکری تاریخ کے اس پہلو کی نقاب کشی کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو:-

"رقص تلواروں کا دیتا ہے خوشی
گونجتی ہے ہر سُو نَے کی نغمگی
گر نہ کرتے ہم حفاظت دیس کی
جانتے کب شاہ کی دریا دلی"(۶۹)

عسکری سرگرمیوں کے گرد گھومنے والی اِن نظموں میں جابجا ایسے انسانوں کے جذبات کا اظہار ملتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے اہم واقعات کو ذہن میں تروتازہ رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کی افواج میں یہ دستور ہے کہ ایک مخصوص مدت تک ہی کسی انسان کو عسکری سرگرمیوں میں شرکت کے قابل تصور کیا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں ایک عام فوجی جوان کو تقریباً" اٹھارہ برس تک یہ خدمت سرانجام دینا ہوتی ہے۔ ایسے افراد فوجی خدمت سرانجام دینے کے بعد دیگر شعبہ جات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ تاہم ان کے دل و دماغ میں فوجی نظم و نسق کے اثرات تادیر قائم رہتے ہیں۔ اسی پس منظر میں چانگ چھیاؤ کی نظم "خُوانگ کے سابق فوجی" ہمیں ایسے فوجیوں کے جذبات سے آگاہ کرتی ہے جو اس پورے معاملے میں سردست شامل تو نہیں ہے مگر اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لی چھی کی نظم "عہدِ رفتہ" جو اس انتخاب کی سب سے طویل نظم ہے، میں اسی نوعیت کے خیالات کو منظوم کیا گیا ہے۔ "دوست کے نام مرثیہ جو جنگ میں مارا گیا" چانگ چِی کی مختصر نظم میں ایسے فوجی کے لیے اس کے ساتھیوں کے جذبات کا خوب صورت اظہار ہے۔ جنگ کی ہولناکیاں بیان کرتے ہوئے ساتھی کے بچھڑنے کے غم کو بیان کیا گیا ہے۔ جنگ میں زندہ بچ جانے کی امید لیے ہوئے وہ کسی حد تک پریشان بھی دکھائی دیتے ہیں کہ کہیں ان کا ساتھی ان سے ہمیشہ کے لیے ہی نہ بچھڑ جائے۔ بند ملاحظہ ہو:-

اپنے دستے پاس تھا کوئی بچانے کو
شام کو لوٹا جو گھوڑا اس کا جھنڈا تھا وہیں
مقبرہ ہم کیوں بنائیں کیا پتہ زندہ ہو تم
آسماں کو دیکھ کر آنسو بہانا کم نہیں(۷۰)

چینی شعری روایت کے ایک اہم شاعر گاؤ شینے نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت فوجی خدمت میں گزارا۔ ان کا مزاج شاعری کی طرف راغب رہتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں انہوں نے ایک سرحدی علاقے میں فوجی دستے کی قیادت کی۔ ۷۵۰ء میں انہوں نے اس علاقے سے روانگی کے وقت تین مختصر نظمیں تحریر کیں۔ان نظموں میں انہوں نے موسمی کیفیات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ تینوں نظمیں ان کے اعلیٰ شعری ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں کو "سرحدی فوج کی چُویانگ گھاٹی میں قیادت" کے نام سے ترتیب دیا گیا ہے۔ گاؤ شی کو اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے ایک چینی صوبے کی گورنری کی فریضہ بھی سرانجام دیا۔

جنگی ماحول میں باہمت مردوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اوصاف کی حامل خواتین کا تذکرہ بھی چینی عسکری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ اہلِ چین میں وانگ چاؤ چُن نامی ایک خاتون کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس خاتون نے جنگ و جدل سے بچنے اور امن و ترقی سے بھرپور دور کے قیام کی راہ ہموار کرنے میں اپنی ذات پر اپنی قوم کو ترجیح دی، جس کا فائدہ اُن کی قوم کے ساتھ ساتھ مخالف قوم کو بھی ہوا۔ ہان اور شیانگ نو نامی دو چینی قبائل ایک طویل عرصے سے باہم لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس بنیاد پر دونوں جانب سے بے پناہ نقصان ہو رہا تھا۔ ایسے میں دونوں قبائل کے چند سلیم الفطرت آدمیوں نے مل بیٹھ کر مسئلہ حل کرنے کی ٹھانی۔ اس کاوش کو اس وقت زبردست نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا جب شیانگ نو قبیلے کے سردار کے لیے ہان قبیلے کی کسی معزز خاتون کا رشتہ مانگا گیا۔ ادھر ہان قبیلے کی کوئی دوشیزہ اپنے عزیزوں کے قاتل قبیلے کے سردار سے شادی کے لیے کسی بھی صورت تیار نہ تھیں۔ ایسے میں وانگ چاؤ چُن نامی دوراندیش خاتون نے خود کو شادی کے لیے آمادہ کیا اور شیانگ نو قبیلے کے سردار سے نکاح کے لیے تیار ہو گئی۔ دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں، جس سے ہان قبیلے کی تہذیب و ثقافت کو پنپنے کا سنہری موقع میسر آ گیا۔

اس شادی کے نتیجے میں نہ صرف دونوں قبائل کی دشمنی دوستی میں بدل گئی بلکہ مکالمے اور رواداری کی بدولت ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جو نصف صدی سے زیادہ تک جاری رہا۔ اس عظیم خاتون کی بدولت مستقل جنگی صورت حال کا شکار رہنے والے قبائل حلیف بن گئے۔ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جانے والی اس خاتون کو قوم نے مِنگ چُن کا لقب دیا۔ اس خاتون کی وفات کے بعد آنے والی نسلوں نے ان کی یاد میں ایک یاد گار بھی تعمیر کی۔ شاعر چھانگ چیان نے اسی خاتون کی یاد گار کو اپنی نظم میں مذکور کیا ہے اور "سرحد کے گیت" نامی نظم میں اس عظیم قومی ہیروئن کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ فاضل مترجم نے نہایت عمدگی سے سرحدی نظموں میں سے آخری نظم کو اس خاتون کے ذکر سے جوڑ کر اس جانب توجہ دلائی ہے کہ دنیا کی ہر جنگ کا حل آپس میں بات چیت سے نکالا جا سکتا ہے۔ تہذیبوں کے درمیان مجادلے کے بجائے مکالمے کی بدولت ہی انسانی فضیلت کا اعلیٰ معیار قائم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر علی شاہ کی مترجمہ کتاب "۱۰۱ چینی نظمیں" بنیادی طور پر تین حصوں پر محیط ہے۔ اس کتاب کا آخری حصہ متفرق نظموں پر مشتمل ہے۔ اس حصے کی پہلی نظم "برفانی پانی میں مچھلی کا شکار" کے عنوان سے ہے۔ یہ نظم چینی تاریخ کے ایک نمایاں شاعر لیوزونگ یو آن کی تخلیق ہے۔ فاضل شاعر نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت فوجی ذمہ داری کے تحت جنگی گھوڑوں کے اصطبل میں گزارا۔ یہاں وہ نا صرف گھوڑوں کی نگہداشت کا ذمہ دار تھا بلکہ جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے گھوڑوں کو بھی تربیت فراہم کرنے پر معمور تھا۔ تاہم کسی بات پر بادشاہ کا اعتماد کھو بیٹھا۔ حاسدین کی چالوں کے باعث، اسے جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا۔ انھی حالات میں اس نے اپنے دلی جذبات کو منظوم کیا اور بہترین شاعری کی تخلیق کو ممکن بنایا۔ وطن سے دور اور حکومت کی جانب سے غیر قانونی ہتھکنڈوں کے استعمال کے باعث ان کے لئے زندگی گزارنا مشکل سے مشکل تر ہو گیا۔ یوں اس شاعر کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تُو مُو کی شاعری بھی چینی ادبی روایت میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی نظم "خالص روشنی" ہمیں چینی تہذیب کے ایک اہم مظہر یعنی ایک خاص تہوار کے بارے میں آگاہی فراہم کرتی ہے۔ چینی میں اپنے فوت شدہ آباواجداد کو بہت اہتمام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یوں تو یہ سلسلہ پورا سال ہی جاری رہتا ہے، مگر شمسی تقویم کے اعتبار سے ۵ اپریل کے آس پاس ایک

خصوصی تہوار منایا جاتا ہے جس میں فوت شدگان کی قبور کو صاف کر کے وہاں وقت گزارتے ہیں۔ بنیادی طور پر اسے آباءواجداد کی پوجا کا تہوار تصور کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر نظم سے چینی ثقافت کے اس پہلو سے آگاہی میسر آتی ہے۔ وانگ چی خو آن کی نظم "سارس مینار سے" ایک تاریخی مقام کی اہمیت بیان کرتی ہے۔ چین کے صوبہ شانسی کے ایک قدیم شہر یوزو کی مغربی سمت دریائے زرد کے مشرقی کنارے پر آباد اس شہر میں ایک یادگار تعمیر کی گئی۔ اس کا نام اس وقت سارس سے موسوم کر دیا گیا جب وہاں ایک سارس نے آکر قیام کیا۔ تاہم اسے گوانچی مینار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔اسی طرح صوبہ شانسی ہی کے ایک خوب صورت اور پُر فضا مقام کے بارے میں وانگ وے کی نظم "ہرنوں کا باڑا" ایک مختصر مگر پُراثر نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے آخری حصے کی سب سے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چین کے قومی ترانے کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترانہ بنیادی طور پر نظم کی ہیئت میں ہے، جسے "رضاکاروں کی مارچ" کا عنوان دیا گیا ہے۔ عوامی جمہوریہ چین کا ترانہ تھیان خان نے لکھا تھا۔ فاضل مترجم نے چینی قومی ترانے کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے انتہائی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہر ہر مصرعے میں شعری اسلوب کو کمال انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ پانچ مصرعوں پر مشتمل ہر بند اپنے اندر مکمل معنوی بصیرت کو سموئے ہوئے ہے۔ چونکہ اس کتاب میں ہر نظم کا چینی زبان میں متن، بیک وقت انگریزی اور اردو ترجمے کی شکل میں موجود ہے۔ اسی لیے اس ترانے کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے، جس کا مطالعہ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ فاضل مترجم نے اردو زبان میں شاندار ترجمہ کیا ہے۔ اس ترانے کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

"اُٹھو اُٹھو!

گر تمھیں محکومیِ اغیار سے انکار ہے
خوں پسینے سے بنانی گر نئی دیوار ہے
آج چینی قوم پر سب سے کڑا ہے امتحان
جان لو یہ ہر کسی کی آخری للکار ہے
اُٹھو! اُٹھو! اُٹھو! اُٹھو! اُٹھو! اُٹھو!

چین دل ہے اور ہم ہیں اس کے اربوں ریزہ ہا
جھیل کے سب دشمنوں کے وار اب آگے بڑھو
جھیل کر سب دشمنوں کے وار اب آگے بڑھو
آگے بڑھو! آگے بڑھو ! آگے بڑھو!" (۷۱)

بنیادی طور پر چینی ترانہ تھیان کی ایک نظم کے دو بندوں پر مشتمل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نظم ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ لکھی گئی تھی۔ عوامی جمہوریہ چین کے قیام سے لے کر ۱۹۷۸ء تک چینی قومی ترانہ ایسا نہ تھا۔ بل کہ ۱۹۷۸ء میں ایک سرکاری فیصلے کے بعد رائج ترانے کو متروک کر کے اسے باقاعدہ سرکاری طور پر چین کا قومی ترانہ قرار دیا گیا۔ سرکاری تقریبات کے دوران "رضاکاروں کی مارچ" کو ہی ترانے کے طور پر بجایا جاتا ہے۔ اس ترانے میں سرزمینِ چین کی آزادی اور سالمیت کے دفاع کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔ عزم و حوصلے سے بھرپور چینی قوم کے اپنی ترقی کے سفر کا مزید تیزی سے طے کرنے کی تحریک دینے والے ان بولوں میں حرکت و تسلسل کی بھرپور تلقین کی گئی ہے۔

"۱۰۱ چینی نظمیں" بنیادی طور پر چینی شاعری کے ایسے دل کش مرقعوں پر مشتمل ہے جس کی بدولت چینی شاعری کے مزاج سے بخوبی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کتاب میں قدیم شاعری سے ساتھ ساتھ جدید شعراء کے کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے، جس کی بدولت جہاں چینی شاعری میں آنے والے تغیر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے وہیں موضوعاتی تنوع کی بھی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ بلاشبہ چینی شاعری کا یہ ترجمہ دونوں اقوام کے مابین بین الثقافتی رواداری اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کی فضا کو بہتر بنانے میں ایک اہم کوشش ہے۔

ذیل میں چینی شاعری کے جن نمائندہ اردو تراجم کو پیش کیا گیا ہے، اُن سے بڑی حد تک چینی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقاء کا ایک واضح تصور سامنے آتا ہے۔ گو کہ اس جائزے سے چینی شاعری کی روایت کے ہر گوشے اور پہلو سے واقفیت حاصل نہیں ہوتی، مگر ایک بنیادی تعارف ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ چینی شعری روایت کا محیط ارضی ہے نہ کہ مابعد الطبعیاتی مباحث کے گرد گھومتا ہے۔ یوں چینی سماج کے بارے میں بھی اس حقیقت کی نقاب کشائی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ چینی سماجی تشکیل میں بھی انہی رویئوں اور رجحانات کو

بنیادی اہمیت دی جاتی ہے جو انسانی زندگی کی ظاہری شکل اور زمین سے جڑے ہوئے امور کا مشاہدہ کرتی ہے۔ یقینی طور پر چینی ادبی ناقدین چوچائی اور ون برگ چائی کے اس خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے جس میں وہ اس بات کا واشگاف الفاظ میں اظہار کرتے ہیں کہ " چینی شاعری کے تراجم کو بہ طور مثال پیش کر کے اس زبان کی شاعری کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہو سکتا۔"[۷۲] درحقیقت چینی زبان کے لفظ اس قدر جامع اور معنی خیز ہوتے ہیں کہ انھیں ترجمہ کرنے کے لیے حد درجہ زیادہ الفاظ کی احتیاج درپیش ہوتی ہے۔ مزید برآں چینی شاعری میں موجود موسیقی کا پہلو بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس زبان کی شاعری کے لہجے اور زیر و بم میں مخصوص نغمگی اور ردھم ہوتا ہے۔ چینی شاعری معنویت اور احساس کا جوہر ہے۔ ممتاز شاعروں کے اشعار میں فطرت اور تنہائی کی محبت کا انتہائی پرجوش اظہار ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱-عابد سیال، دہقان کا گیت، (مترجم) مشمولہ، چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷

۲-آفتاب اقبال شمیم، کچھ چینی شاعری کے بارے میں، (دیباچہ)، مشمولہ چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۹

۳-ارشد مسعود ہاشمی، کلاسیکی چینی فکشن پر بدھ مت اور ہندوستانی دیومالاؤں کے اثرات (مضمون)، سہ ماہی مژگاں، کلکتہ، جلد ۶، شمارہ ۲۱-۲۲ ص ۵۶

۴-ارشد مسعود ہاشمی، چینی شاعری اور رباعی (مضمون)، مشمولہ ماہ نامہ آج کل، نئی دہلی، جلد ۴۹، شمارہ ۱۰، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۹

۵-عابد حسین سیال، ڈاکٹر، چینی ادب کے اردو تراجم: تہذیبی مکالمے کی ایک صورت (ریسرچ آرٹیکل)، مشمولہ امتزاج ۱۸، ص ۵۴

۶-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۱۳

۷-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، ص ۱۵

۸-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، ص ۱۸

۹-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، ص ۳۲

۱۰-چو چائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، مترجمین محمد سلیم خاں، گوپال متل، محمد سلیمان صابر، نیشنل اکاڈمی ، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۰

۱۱-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، ص ۳۴

۱۲-ابنِ انشاء، چینی نظمیں ص ۵۳

۱۳-ابنِ انشاء، چینی نظمیں ص ۶۴

۱۴-عابد حسین، ڈاکٹر، چینی ادب کے اردو تراجم: تہذیبی مکالمے کی ایک صورت، (ریسرچ آرٹیکل)، امتزاج، ۱۸،

۱۵-چو چائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، ص ۱۹۲

۱۶-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، ص ۱۱۹

۱۷-ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۱

۱۸-ابنِ انشاء، چینی نظمیں، ص ۱۴۷

۱۹-ابن انشاء، چینی نظمیں، ص ۱۵۲

۲۰-آفتاب اقبال شمیم (پیش لفظ)، گلبانگِ وفا، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰

۲۱-انتخاب عالم (دیباچہ)، گلبانگِ وفا، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵

۲۲-انتخاب عالم، گلبانگِ وفا، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ءِ، ص ۱۱۷

۲۳-انتخاب عالم، گلبانگِ وفا، ص ۱۲۶

۲۴-ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی، اسلام آباد، ص ۲۰۱۶ء، ص ۸۹

۲۵-عبدالمنان / محمد حسیب، چینی ثقافت (مضمون)، مشمولہ چینی شناسی، عبدالواحد تونسوی / چانگ وے، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۲۲ء، ص ۴۳۷

۲۶-ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی، اسلام آباد، ص ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۸

۲۷-چوچائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، مترجمین محمد سلیم خاں، گوپال متل، محمد سلیمان صابر، نیشنل اکاڈمی، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۵

۲۸-عبدالمنان / محمد حسیب، چینی ثقافت (مضمون)، مشمولہ چینی شناسی، عبدالواحد تونسوی / چانگ وے، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۲۲ء، ص ۴۷

۲۹-عابد حسین سیال، ڈاکٹر، (دیباچہ)، مشمولہ غم کے محاذ پر، از عابد حسین، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۲۵

۳۰-چانگ شی شوان، پروفیسر، (ابتدائیہ) مشمولہ غم کے محاذ پر، از عابد حسین، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۱۹

۳۱-عابد حسین سیال، ڈاکٹر، (دیباچہ)، مشمولہ غم کے محاذ پر، از عابد حسین، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۳۵

۳۲-ارشد مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، چینی شاعری اور رباعی (مضمون)، مشمولہ ماہنامہ مجلہ آج کل، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

۳۳-چھویو آن، غم کے محاذ پر، مترجمہ عابد سیال، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۴۹

۳۴- چھویو آن، غم کے محاذ پر، مترجمہ عابد سیال، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۵۱
۳۵- چھویو آن، غم کے محاذ پر،، ص ۵۵
۳۶- عابد حسین سیال، ڈاکٹر، (دیباچہ)، مشمولہ غم کے محاذ پر، از عابد حسین، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
، ۲۰۲۱ء، ص ۴۰
۳۷- چھویو آن، غم کے محاذ پر،، ص ۶۶
۳۸- محمد امین، ڈاکٹر، کنفیوشس اور چین کی ثقافت، بکس اینڈ ریڈرز، ملتان، ۲۰۲۱ء، ص ۷۵
۳۹- چھویو آن، غم کے محاذ پر،، ص ۸۱
۴۰-، عابد سیال، لی ساؤ، غم کے محاذ پر، (مترجم) مشمولہ، چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب)، اکادمی
ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۴۶
۴۱- لین یو تانگ، جینے کی اہمیت، مترجمہ مختار احمد صدیقی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۲
۴۲- چھویو آن، غم کے محاذ پر،، ص ۹۰
۴۳- ایضاً "ص ۱۰۴
۴۴- یوان وئے شوئے، نظمیں خطاطی اور محبت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳
۴۵- افتخار عارف، (حرفِ آغاز)، چین کا ادب (عہد بہ عہد شاعری سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام
آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۷
۴۶- یوان وئے شوئے، نظمیں خطاطی اور محبت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹
۴۷- صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، ۱۰۱ چینی نظمیں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۴ءِ ص ۲۱۱
۴۸- یوان وئے شوئے، نظمیں خطاطی اور محبت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱
۴۹- یوان وئے شوئے، نظمیں خطاطی اور محبت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۴۰
۵۰- خالد عباس الاسدی، ڈاکٹر، پاک چین دوستی (قطعات)، کاغذی پیراہن، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۶
۵۱- چو چائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، مترجمین محمد سلیم خاں، گوپال متل، محمد سلیمان صابر، نیشنل اکاڈمی
، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۶

۵۲-انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، (دیباچہ) ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ص۱۹

۵۳-ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، (فلیپ) ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد،

۵۴-(سکارلٹ) شیانگ لیانگ، ڈاکٹر، (پیش لفظ)، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص۱۸

۵۵-ارشد مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، چینی شاعری اور رباعی، (مضمون)، مطبوعہ ماہنامہ آج کل نئی دہلی، شمارہ ۱۰ جلد ۴۹، مئی ۱۹۹۱ء ص ۱۱

۵۶-لِی پائی، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۳

۵۷-وانگ وے، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۱۳

۵۸-لی شین، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص۱۹

۵۹-ایضاً"، ص۲۱

۶۰-سید اشتیاق الحسن، (دیباچہ)، مترجم، ناگ راج کی بیٹی، تھانگ عہد کی دس کہانیاں، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر، بیجنگ، چین، ۱۹۸۶ء، ص۱

۶۱-یحیٰ امجد، (مترجم)، چینی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۹

۶۲-ایضاً"

۶۳-گو شُو، جی شُو، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۶۵

۶۴-ساؤ سُنگ، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۷۵

۶۵-لیو چونگ یونگ، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص۸۹

۶۶-وانگ چھانگ لنگ، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۹۵

۶۷-تُو فُو، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۱۰۱

۶۸-یحیٰ امجد، (مترجم) چینی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۸۷

۶۹-چانگ یوا ے، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص۱۵۷

۷۰-چانگ چی، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص۱۸۷

۷۱-تھیان خان، ۱۰۱ چینی نظمیں، مترجمہ صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۲۱۱
۷۲-چوچائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، مترجمین محمد سلیم خاں، گوپال متل، محمد سلیمان صابر، نیشنل اکاڈمی
، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۴

باب پنجم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

انسانیت کی عہد بہ عہد ترقی میں تہذیب کا کردار بنیادی اور اساسی نوعیت کا ہے۔ مدنی الطبع ہونے کے باعث انسان کی بقاء، اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں ہی پوشیدہ ہے۔ دنیا کی ہر تہذیب میں انسان کی حرمت اور تحفظ کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ تہذیب کی تشکیل میں مادی عناصر مثلاً" جغرافیہ، طرزِ معاشرت اور لباس وغیرہ کے ساتھ ساتھ غیر مادی مظاہر مثلاً" خوشی غمی، بہادری، محبت، غصہ، مہمان نوازی، دوستی وغیرہ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ انسانی سماج اپنی ترقی کا سفر اسی صورت میں تیزی سے طے کر سکتا ہے جب وہ اپنے اردگرد کے معاشروں سے ہم آہنگ ہو کر آگے بڑھے۔ اسی بنیاد پر تہذیبوں کے مابین مکالمے کا نظریہ باشعور انسانیت کو اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ یہ نظریہ در حقیقت اُس وقت اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بنا جب بیسویں صدی عیسوی میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد تہذیبوں کے مابین تصادم کا نظریہ پیش کیا گیا۔ تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم کا نتیجہ انسانیت کے لیے تباہی و بربادی کی صورت میں نکلنے کے خطرات سے دوچار ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں ایک ادیب اپنے سماج کو صحت مند اور اعلیٰ انسانی اقدار سے روشناس کروانے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ ترجمہ کاری ایک ایسا تیر بہدف نسخہ ہے جس کی بدولت کسی بھی قوم کے ادبی سرمائے کو دیگر اقوام اور تہذیبوں کے لیے قابل فہم بنا کر دو تہذیبوں کے مابین پُل بنایا جاسکتا ہے۔ یوں ادب انسانیت کو آپس میں مل جل کر ترقی کی منازل طے کرنے کی جانب متوجہ کرتا ہے۔

چینی تہذیب کا شمار انسانی تاریخ کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تہذیب کی عمر پانچ ہزار برس سے زائد ہے۔ ہر تہذیب کے عناصرِ ترکیبی کی مانند چینی تہذیب کی روایات، آلات، موسیقی اور فنِ تعمیر سمیت جملہ فنونِ لطیفہ کی ایک طویل تاریخ ہے۔ چینی زبان بھی بنیادی طور پر چینی تہذیب کا ایک اہم مظہر ہے۔ اس زبان میں تخلیق کیا جانے والا ادب دنیا کے قدیم ترین ادبی سرمائے کا لازمی ااور ضروری حصہ ہے۔ ادبیاتِ چین کے جو نمونے آج میسر ہیں، اُن سے اس امر کی تصدیق

ہوتی ہے کہ چینی تہذیب نے آج سے سینکڑوں سال قبل تحریر کے فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ چینی تہذیب کے صدیوں سے جاری رہنے والے بتدریج ارتقاء نے بھی اسے دنیا کی دیگر تہذیبوں سے منفرد اور نمایاں مقام عطا کیا ہے۔

دنیا کی قدیم تاریخ میں چین کا تذکرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ سے ہی چینی باشندے اپنی بے مثال ہنر مندی کا لوہا منوا چکے تھے۔ کاغذ کی دریافت، بارود کا استعمال، قطب نما کی ایجاد سمیت کئی ایک بنیادی استعمال کی اشیاء کی ایجاد سرزمینِ چین کی مرہونِ منت ہیں۔ مذہبی حوالے سے قدیم چین اور برعظیم پاک وہند کے مابین دیرینہ تعلقات استوار رہے ہیں۔ بدھ مت کی تعلیمات کا چین میں پھیلاؤ ہندوستان سے ہی ہوا۔ بدھ مت کے مقدس مقامات آج بھی پاکستان کے مختلف شہروں بالخصوص ٹیکسلا اور اس کے نواح میں موجود ہیں جہاں چین کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے بھکشوؤں کی بڑی تعداد حاضر ہوتی رہتی ہے۔ چین سے تعلق رکھنے والے مذہبی سیاحوں فاہیان اور ہیون سانگ کے سفر نامے ہمیں اس زمانے کے چینی سماج اور طرزِ معاشرت سے آگاہی دینے کے ساتھ ہندوستان کے بارے میں بھی مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں قدیم شاہراہ ریشم، جو بین الاقوامی تجارت کے ساتھ ساتھ مختلف تہذیبوں کے مابین مکالمے اور ثقافتی ہم آہنگی کے قیام کے باعث خصوصی اہمیت کی حامل رہی ہے۔

عالمی سطح پر دورِ حاضر میں عوامی جمہوریہ چین کے قائم ہونے والے اثرورسوخ اور غیر معمولی معاشی ترقی نے اقوامِ عالم کو چین کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اقوامِ عالم میں تیزی سے ابھرتی ہوئی چینی طاقت کی پشت پر موجود تہذیبی روایت کا شعور حاصل کرنے کے لیے چینی ادب ایک اہم اور بنیادی وسیلہ ہے۔ یوں ادبیاتِ عالیہ کے طالب علموں کے لیے چینی ادبی سرمائے سے باخبر ہونا ایک ضروری امر ہے۔ چینی زبان سے براہ راست استفادہ نہ کر سکنے کے باعث تراجم نے اس کمی کو پورا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس پس منظر میں اردو ادب کے قارئین کے لیے چینی ادبی تراجم خصوصی دل چسپی کے حامل ہیں۔ چینی ادب کے اردو تراجم کی بدولت، اہلِ اردو کو چینی دانش کے مرقعوں سے واقفیت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ چینی سماجی و تہذیبی روایات سے بھی آگاہی میسر آ رہی ہے۔ انسانیت کو پتھر کے دور سے نکال کر مصنوعی ذہانت کے زمانے میں

لانے کا سلسلہ درحقیقت تہذیبوں کے مابین روابط ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے کا آغاز اسی صورت ممکن ہے جب مختلف تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔

تہذیبوں کے مابین مکالمہ یوں تو ایک تاریخی عمل ہے، مگر اس تصور کو ایک نظریہ کے طور پر متعارف کروانے کی داغ بیل بیسویں صدی عیسوی میں ڈالی گئی۔ اس تصور کو باقاعدہ طور پر پیش کرنے والی شخصیت کا نام ہینس کوچر وہے، جنہوں نے ۱۹۷۲ء میں اس اصطلاح کو پہلی بار باقاعدہ طور پر استعمال کیا۔ ان کا تعلق آسٹریا سے تھا، جو شعبہ صحافت سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو کو ایک خط لکھ کر مختلف تہذیبوں کے مابین مذاکرے کی ضرورت پر زور دیا۔ جسے جمہوریہ سینیگال کے صدرِ مملکت لیو پولڈ سیڈر (Leopold Sedar Segnhor) نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کروا کر ممکن بنایا۔ یوں دنیا کے مختلف سفارتی اور سیاسی حلقوں میں اس تصور پر مکالمے کا آغاز ہو گیا۔ سرد جنگ کے کشیدہ ماحول سے نالاں دانشوروں نے باہمی مسائل کے حل کے لیے مجادلے کے بجائے مناظرے کی اہمیت پر زور دیا۔ اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم سے وابستہ ممالک کی بڑی تعداد نے اس تصور کی اہمیت کے پیشِ نظر باہمی تنازعات کے حل کے لیے اسے ایک بہترین حکمتِ عملی کے طور پر پسند کیا۔

۴ نومبر ۱۹۹۸ء کو اقوامِ متحدہ نے سال ۲۰۰۱ء کو عالمی سطح پر تہذیبوں کے مابین مکالمے کے سال کے طور پر منانے کا باضابطہ اعلان کیا۔ بدقسمتی سے اُسی سال ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دہشت گردی کی افسوس ناک کاروائیوں کے بعد دنیا نئے دور میں داخل ہو گئی۔ مکالمے کے بجائے طاقت کے بل بوتے پر دہشت گردی سے جڑے مسائل کے غیر یقینی حل کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے نام پر ایک طویل محاذ آرائی کا آغاز کیا گیا۔ قبل ازیں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے عالمی سطح پر امریکی بالادستی کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایسے میں مغربی مفکر سیموئیل ہنٹنگٹن کی جانب سے یہ تصور سامنے آیا کہ دنیا میں آئندہ تہذیبوں کے مابین تصادم کا خطرہ ہے۔ تاہم اقوامِ عالم میں امن پسند طبقات نے اس بات پر زور دیا کہ ایسے وقت میں تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور ہم آہنگی کی فضاء کا قیام انسانیت کے وسیع تر مفاد کے لیے از بس ضروری ہے۔

ترجمہ نگاری اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ادبی فن پارہ اپنی تہذیب، روایت اور معاشرت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب جس سوچ کو متن کی صورت میں پیش کرتا ہے، در حقیقت وہ اُس سماج ہی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اگر تراجم کو سلسلہ نہ ہوتا تو کوئی بھی ادب اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ دنیا بھر میں نمایاں ہونے سے محروم رہتا۔ ادبیات میں تراجم نے تہذیبوں کے درمیان فاصلوں کو نہ صرف ختم کیا ہے بل کہ اِن فاصلوں کو باہمی رابطوں میں بھی بدل دیا ہے۔ اردو زبان کے ادب پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خود اردو زبان کی ترقی میں دیگر زبانوں کا کلیدی کردار رہا ہے۔ دیگر زبانوں کے ادبی فن پاروں کے تراجم سے اردو زبان کو نہ صرف نئی فکری جہات میسر آئیں بل کہ فنی و اسلوبیاتی تناظر میں بھی بے پناہ استفادے کو موقع ملا۔ اردو ادب کے منظر نامے پر آج جو اصنافِ ادب مقبول ہیں، اُن کے پیچھے تراجم کا نمایاں اور کلیدی کردار ہے۔

چینی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ ایک توانا روایت کا حامل ہے۔ ابتدائی طور پر یہ تراجم بہت ہی محدود تھے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب عوامی جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آیا تو دونوں نوزائیدہ ممالک نے باہمی تعلقات کی ایسی بنیاد ڈالی جس پر آج دوستی اور احترام کی مضبوط عمارت قائم ہے۔ بین الاقوامی سفارتی حلقوں میں یہ بات مشہور ہے کہ پاک چین دوستی شہد سے میٹھی، پہاڑوں سے بلند اور سمندروں سے گہری ہے۔ پاک چین دوستانہ سفارتی تعلقات کی بدولت دونوں ممالک کی حکومتوں کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی گرم جوشی پائی جاتی ہے۔ اردو اور چینی زبانوں کی دونوں ممالک میں باقاعدہ تدریس کا سلسلہ بھی اب بھرپور انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس ضمن میں پاکستانی جامعات میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، جہاں دونوں زبانوں کی نا صرف معیاری تدریس کا سلسلہ قائم ہے بل کہ تحقیقی سرگرمیاں بھی تواتر سے جاری ہیں۔ اب تک جو چینی ادب کے جو فن پارے اردو زبان میں منتقل کیے گئے، اُن میں ادب کی کم و بیش تمام اصناف شامل ہیں۔ نثری ادبی تراجم میں افسانہ، ناول، لوک ادب، آپ بیتی اور سفر نامے جیسی مقبول اصنافِ ادب کے ساتھ ساتھ سائنس فکشن کے بھی نمونے موجود ہیں۔

چینی ادب کے تراجم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز ۱۸۴۸ء میں اس وقت ہوا، جب برعظیم پاک و ہند میں انگریزی راج کو دور دورہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے بہت بڑے حصے پر قابض تھی۔ مملکت کے ایک اہم پڑوسی ملک کے حالات و معاملات سے آگاہی حاصل کرنے کے ارادے سے انگریز مستشرق جیمز فرانسس کار کرن نے اردو زبان میں چین کے بارے میں پہلی کتاب تصنیف کی۔اس کتاب کا نام "تاریخ ممالکِ چین" تھا۔ اس کتاب کو بجا طور پر اردو دان طبقے کے لیے چین شناسی کی روایت کا نقشِ اول قرار دیا جاسکتا ہے۔اس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم پیش رفت ۱۸۶۷ء میں سامنے آئی۔ "تاریخ چین و جاپان" کے نام سے لارڈ الیگن کی تصنیف کو اردو ترجمے کی صورت میں پیش کرنے میں اودھ اخبار کے مترجم مسٹر فریدرک نندی کا نمایاں کردار ہے۔

"چین اور چینی" از محمد شفیع الدین خان کی ۱۸۹۷ء میں چھپنے والی یہ کتاب بنیادی طور پر ان کے ذاتی مطالعے اور اب تک چین کے بارے لکھی گئی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے۔ چین شناسی کی روایت کے ضمن میں ایک اور اہم کاوش کچھ مدت کے بعد ۱۹۳۴ء میں "چین کی کہانی" کے نام سے سامنے آئی۔ چودھری فتح الدین اس کتاب کے مصنف تھے۔ ۱۹۳۵ء میں "چینی مسلمان" کے نام سے ایک پُرمغز اور تحقیق پر مبنی کتاب سامنے آئی۔ اسے ایک چینی مسلمان بدر الدین نے اردو زبان میں تحریر کیا تھا۔ دراصل اس کتاب کو لکھنے کا خیال بدر الدین چینی کو اس وقت آیا جب وہ ہندوستان میں دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مقیم تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ زیرِ نظر کتاب کے دیباچے سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ یہ کتاب کسی چینی شخص کی جانب سے لکھی جانے والی اولین اردو کتاب ہے۔ بدر الدین چینی بنیادی طور پر ایک علمی و تحقیقی شخصیت تھے۔ انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان، کراچی سے ۱۹۴۹ء میں ان کی ایک اور مایہ ناز تصنیف بعنوان "چین و عرب کے تعلقات" شائع ہوئی۔ گو کہ اس کا بنیادی موضوع چینی مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے حالات کے بارے میں ہے، مگر اردو دان طبقہ کے لیے اس میں چین شناسی کے حوالے سے بھی مفید معلومات درج ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں معروف چینی مفکر کنفیوشس کی کتاب شو کنگ کا اردو ترجمہ "صحیفہ چین معہ مختصر تاریخ چین و حالاتِ کنفیوشس" کے نام سے سید اسد علی انوری نے پیش کیا۔ ۱۹۴۱ء میں "زندہ چین: جدید چینی کہانیاں" کے عنوان سے تمنائی صاحب نے منتخب چینی کہانیوں کو اردو قالب

میں منتقل کیا۔ ۱۹۴۳ء اور اس کے ایک سال بعد چین شناسی کے حوالے سے دو اہم ترین کتب سامنے آئیں۔ یہ دونوں کتب میر عابد علی خان نے لکھیں تھیں۔ پہلی کتاب کا نام "جمہوریہ چین" جب کہ دوسری کتاب "مشاہیر چین" کے عنوان سے تالیف ہوئی۔ ان کتب کو چین شناسی کی روایت میں حوالے کی کتب کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اصناف کے اعتبار سے نگاہ ڈالی جائے تو اس میں ناول، ڈرامہ، افسانہ، آپ بیتی، ادبِ اطفال، سائنس فکشن، سفر نامہ، لوک ادب سمیت تمام معروف اصنافِ ادب کے تراجم میسر ہیں۔ اس اعتبار سے چینی ادبی تراجم کی روایت کو مضبوط اور توانا قرار دیا جاسکتا ہے۔

چینی ادب کے شعری تراجم کا ایک حوصلہ افزاء ذخیرہ اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ چینی شعری تراجم میں جدید و قدیم نمائندہ شعرا کا کلام اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ دستیاب شواہد کے مطابق ابن انشاء کا "چینی نظمیں" کے عنوان سے کیا گیا ترجمہ اس سلسلے کی اولین کاوش ہے۔ اس میں قدیم چینی شعرا کے کلام کو بے حد مہارت اور شعری محاسن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کے ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نمایاں اور جدید شعرا کے کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ شعری تراجم کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چند ایسے چینی النسل شعراء نے خود اپنے ہی چینی کلام کو اردو زبان میں خود منتقل کر کے تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے سفر کو تیز تر کر دیا ہے۔ ان افراد میں "لیو ینگ ون" (شیدا چینی)، "چانگ شی شوان" (انتخاب عالم) اور "یوان وئے شوئے" کے نام نمایاں ہیں جنھوں نے اردو زبان میں اپنے شعری کلام کے ساتھ ساتھ نثری خدمات میں بھی اپنی صلاحیتوں کا خوب لوہا منوایا ہے۔

چینی ادبی تراجم میں چینی معاشرت، رسوم و رواج اور فلسفیانہ تصورات کو پیش کیا گیا ہے، جو اردو ادب کے قارئین کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرواتے ہیں۔ تراجم کے ذریعے دونوں اقوام کے مابین ایک تہذیبی پُل قائم ہوا ہے جو نہ صرف دو تہذیبوں کے باہمی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے وہیں عوامی سطح پر بھی تعلقات کے فروغ میں مد و معاون ثابت ہو تا ہے۔ ادبی متون کے تراجم کے ذریعے مختلف تہذیبوں کے درمیان موجود اختلافات کو کم کرنے اور مشترکہ اقدار کو فروغ دینے میں مدد ملتی ہے۔ چینی ادب کے اردو تراجم نے اس عمل کو بہتر بنایا ہے اور دونوں اقوام کے درمیان تہذیبی اور ادبی مکالمے کو فروغ دیا ہے اور ثقافتی ہم آہنگی کی مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔

چینی ادب کے مترجمین اور قارئین کے لیے بعض بنیادی باتوں سے واقف ہونا ازبس ضروری ہے۔ ان میں اولین نقطہ یہ ہے کہ چینی ادب اور چینی تاریخ کا آپس میں انتہائی گہرا تعلق ہے۔ چینی فلسفے کو چینی ادب میں بڑی ہی فن کارانہ مہارت سے سمو دیا گیا ہے۔ چینی فلسفے کے بنیادی عنوانات سے آگاہی حاصل کیے بغیر چینی سماج کے مزاج کو سمجھنا حد درجہ دشوار عمل ہے۔ اس لیے چینی ادب کا مطالعہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ چینی فلسفے سے بھی راہ ورسم بڑھائی جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیشتر چینی فلسفہ کے علماء ہی چینی ادب کے سرخیل تصور کیے جاتے ہیں۔ چینی تاریخ کا یہ نمایاں وصف ہے کہ اس میں بیرونی جارحیت کے نتیجے میں کسی نو آبادیاتی تسلط کی کوئی صورت موجود نہیں رہی۔ چینی قبائل کے مابین انتقالِ اقتدار کے لیے کئی لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ جس کے بعد زمامِ اقتدار ایک خاندان سے دوسرے خاندان کو منتقل ہو جاتی تھی۔ طاقت کی اس تبدیلی کے عمل میں چینی سرزمین ہی سے نئے حاکم مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر چینی تاریخ کو نئے دور میں داخل کر دیتے تھے۔ یوں چین کی سیاسی تاریخ ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ سیاسی استحکام کے اس پہلو کے باعث تہذٰیب پر بھی نمایاں اثرات مرتب ہوئے اور تہذیبی تسلسل کے باعث اسے دنیا کی دیگر تہذیبوں سے منفرد مقام حاصل ہے۔

پاکستان اور چین کی باہمی دوستی کا پس منظر دو عظیم تہذیبوں کے درمیان ہزاروں سال پر محیط ہے۔ دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کو تاریخی، ثقافتی، مذہبی، تجارتی، دفاعی اور سفارتی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ پاک چین دوستی کی درخشاں تاریخ میں شاہراہ ریشم کو بنیادی حیثیت ہے، جو چین کو برعظیم پاک و ہند کی سرزمین کے ذریعے ایشیا و یورپ کے اہم ممالک سے ملاتی ہے۔ یہ شاہراہ تجارتی روابط کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور تہذیبی تبادلوں کا بھی ذریعہ بنی۔ شاہراہ ریشم کے ذریعے کپڑا، ریشم، مصالحہ جات سمیت دیگر اشیائے ضرورت کا تبادلہ ہوا جو معیشت کی بہتری اور غربت کے خاتمے میں معاون رہا۔ گندھارا اور چینی تہذیب کے مابین روابط کا استوار ہونا، اسی شاہراہ کی بدولت ممکن ہوا۔ چینی راہب فاہیان اور ہیون سانگ جیسے معروف اہل علم سیاحوں نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا اور یہاں کے بدھ فلسفے سے سرزمینِ چین کو روشناس کروایا۔ یوں گندھارا کی بدھ مت تہذیب اہلِ چین کے لیے روحانی رہنمائی کا ذریعہ بنی۔ گویا قدیم ہند اور قدیم چین کے مابین دوستی کے رشتے کو استوار کرنے میں مذاہب نے اہم کردار ادا کیا۔ بدھ مت کی تعلیمات کے پھیلاؤ نے

دونوں اقوام کے درمیان روحانی اشتراکات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں خطوں کے فنون، ادب، فلسفے اور سماج پر ان مٹ نقوش مرتب کیے۔ کنفیوشس ازم اور اسلام کے درمیان اخلاقیات اور انسانی حقوق کے حوالے سے کئی ایک مشترک اقدار ہیں، جو دونوں اقوام کو قریب کرنے میں معاون ہیں۔ چینی ادب کے تراجم سے ایسے اشتراکات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو پاکستانی اور چینی سماج میں مشترک ہیں۔ مثلا" چینی سماج میں بزرگوں کا احترام ایک مذہبی فریضے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ کنفیوشس کی تعلیمات میں والدین اور اولاد کے درمیان تعلقات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہر سال چینی لوگ اپنے فوت شدگان کی قبور پر حاضر ہو کر اس بات کی امید کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اُن کے بزرگوں کی روحیں اِن سے خوش ہوں گی۔ شادی بیاہ کی تقاریب میں بھی پاکستانی تہذیبی امور کی مانند شادی کی بیشتر رسمیں ادا کی جاتی ہیں، جو دونوں معاشروں میں یکساں ہیں۔

عہدِ جدید میں پاکستان اور چین کے مابین دوستی کا آغاز ابتداء ہی میں ہو گیا تھا۔ عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے ساتھ ہی پاکستان نے چین کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم کر لیا۔ دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کی ابتداء ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ جلد ہی یہ تعلقات لازوال دوستی اور ہمہ گیر شراکت داری میں تبدیل ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سرد جنگ کے زمانے میں دونوں ممالک نے علاقائی اور بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے یکساں موقف اختیار کیا۔ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کا چین نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں چین نے دوستی کا حق خوب نبھایا اور فوجی محاذ کے ساتھ ساتھ سفارتی محاذ پر بھی پاکستان کے اصولی موقف کی کھل کر تائید کی۔ پاکستان کو مختلف اوقات میں قدرتی آفات مثلا" سیلاب، زلزلہ اور کرونا وباء کا سامنا کرنا پڑا۔ مشکل کی ان گھڑیوں میں پاکستانی قوم اور حکومت کی ہمہ وقت مدد کے لیے چینی عوام اور حکومت نے دل کھول کر تعاون کیا۔ مسئلہ کشمیر کے منصفانہ، پائیدار اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے عین مطابق حل کو ممکن بنانے کی کوششوں میں چین ہمیشہ پاکستان کے ساتھ کھڑا رہا ہے۔ دہشت گردی کی عفریت سے نمٹنے اور اس مسئلے کے دیرپا حل کے لیے سفارتی سطح پر کیا جانے والا چینی تعاون اپنی مثال آپ ہے۔ پاکستان نے بھی چینی قوم کی مشکل وقت میں ساتھ دینے کی سنہری تاریخ رقم کی ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں چین کو سفارتی تنہائی سے بچانے اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی

کونسل میں چین کو اُس کا جائز حق دلانے میں پاکستان ہمیشہ متحرک رہا ہے۔ چین کی سلامتی کونسل میں مستقل نشست اور اس کی بنیاد پر ویٹو پاور کے حصول میں پاکستان کی موثر سفارتی کاری کا بھی دخل ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان دوستانہ تعلقات کی داغ بیل ڈالنے میں پاکستان کا کردار دنیا کی سفارتی تاریخ کا اہم باب ہے۔ ون چائنا پالیسی کی حمایت پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بنیادی اہمیت کا حامل دیرینہ اصول ہے۔

پاک چین تعلقات کو شہد سے میٹھا، ہمالیہ سے بلند اور سمندروں سے گہرا اقرار دیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں دونوں ممالک نے سیاسی، عسکری اور اقتصادی شعبوں میں قریبی تعاون جاری رکھا ہوا ہے۔ چین نے پاکستان کے ساتھ ایٹمی توانائی کے شعبے میں بھی تعاون کیا ہے اور خلائی تحقیق کے شعبے میں بھی مدد فراہم کی ہے۔ پاک چین دوستی کی بنیاد ایک دوسرے کے مذاہب، ثقافتوں اور سماجی اقدار کے احترام پر قائم ہے۔ اسلام، بدھ مت اور کنفیوشس ازم کے اشتراکات نے ان تعلقات میں ہم آہنگی کو فروغ دیا ہے۔

پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ، جسے سی پیک کا نام دیا جاتا ہے، دونوں ہمسایہ ممالک کی دوستی کا عظیم مظہر ہے۔ یہ منصوبہ بنیادی طور قدیم شاہراہ ریشم کا احیاء ہے، جو صدیوں سے چینی مصنوعات کو دنیا کے دیگر حصوں تک پہنچانے کے استعمال کیا جاتی تھی۔ اس شاہراہ سے چین میں تیار شدہ ریشم کا نفیس کپڑا یورپ پہنچایا جاتا، جسے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس زمینی راستے کو "شاہراہِ ریشم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں اور بحری جہازوں سے عالمی تجارت کے آغاز کے باعث اس شاہراہ کی اہمیت کم ہو گئی۔ تاہم چینی حکومت کے ون روڈ ون بیلٹ منصوبے کے تحت عالمی تجارت کے لیے نئے زمینی راستوں کی تعمیر کی جارہی ہے، جس کے تحت اہم بندرگاہوں کو بھی آپس میں منسلک کیا جارہا ہے۔ پاک چین اقتصادی راہ داری ایک کثیر الجہت منصوبہ ہے، جس میں توانائی، انفراسٹرکچر اور صنعت و حرفت سمیت درجنوں پراجیکٹ شامل ہیں۔ اس منصوبے کی بدولت جہاں پاکستان میں روزگار کے مواقع پیدا ہوئے وہیں چین کو عالمی تجارت کے لیے بحری راستوں کا ایک آسان روٹ میسر آیا ہے۔ سی پیک کے باعث نہ صرف دونوں ممالک کے درمیان بل کہ عالمی تجارتی سرگرمیاں بھی تیزی سے آگے بڑھنے کی توقع ہے۔

سی پیک کے پس منظر میں عوامی سطح پر ثقافتی وفود کا تبادلے اور تعلیمی اشتراکات نے دونوں ممالک کے عوام کو قریب کر دیا ہے۔ چین میں اردو زبان کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جب کہ پاکستان میں بھی چینی زبان کی جانب رجحان میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ چین کی کئی ایک جامعات میں اردو زبان کی تدریس کا انتہائی معقول اور معیاری انتظام موجود ہے۔ پاکستان میں بھی چینی زبان کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے تین اہم شہروں کی جامعات میں کنفیوشس انسٹی ٹیوٹس کا قیام چینی زبان کی تدریس کے معیارات کا یقینی بنانے کے ساتھ چینی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

ادبی تراجم کی اہمیت، اثرات اور ان کے ذریعے ثقافتی ہم آہنگی کا فروغ تہذیبوں کے درمیان مکالمے ہی کی بدولت ممکن ہے۔ ادب کی مختلف اصناف جیسے ناول، لوک ادب، افسانہ، سفر نامہ، آپ بیتی، ادبِ اطفال، ڈرامہ اور سائنس فکشن کے تراجم کو خاص طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے۔ تراجم مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں اور ان کے درمیان پائے جانے والے فرق کو کم کرتے ہیں، جو نہ صرف ادب بل کہ ثقافتی اقدار اور معاشرتی ڈھانچے پر بھی مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ادبی متون اپنے سماجی اور ثقافتی پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کا ترجمہ کرنے سے دوسرے معاشروں کے لوگ ان متون کی اصل روح سے واقف ہوتے ہیں۔

چینی ادب کو دنیا کے قدیم ترین ادبی ذخائر میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں ان کا ترجمہ گزشتہ چند سالوں میں ایک قابلِ ذکر رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے۔ چینی لوک ادب کے بھی چند بہترین مجموعے اردو زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ چینی سماج مختلف قومیتوں پر مشتمل ہے۔ ہر قومیت کا اپنا جداگانہ لوک ادب ہے، جو ان کی ثقافتی اور تہذیبی روایات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ہان قومیت کی طرح چین میں موجود ہر قومیت اپنے ادب کی حفاظت اور اس کی ترویج کے لیے کوشاں ہے۔ لوک ادب کے یہ تراجم اردو دان طبقے کے لیے چینی تاریخ کو سمجھنے میں انتہائی مفید ہیں۔ چینی ادب میں ناول ایک اہم صنف ہے۔ اس میں "تین سلطنتوں کی داستان" جیسا کلاسیکی ناول شامل ہے، جسے ایک تحقیق کے مطابق دنیا کا قدیم ناول ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ ناول چینی تہذیب، سیاست اور معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ "تین سلطنتوں کی داستان" چینی کلاسیکی ادب کا ایک شاہکار ہے جو چینی ثقافت اور جنگی حکمت عملی کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ چینی

ثقافت کو اردو قارئین کے قریب تر لانے کا ذریعہ ہے۔ اس ناول میں بظاہر تین طاقتوں کے درمیان حصولِ اقتدار کے لیے طاقت کا استعمال دکھائی دیتا ہے، مگر اس جنگی پس منظر میں چینی فوجی تاریخ کا سکہ بند حوالہ میسر آتا ہے۔ چینی نثری ادب میں دیومالائی کہانیوں اور حقیقت نگاری کا امتزاج پایا جاتا ہے، جو اسے زیادہ پرکشش بناتا ہے۔

چینی افسانے اور سائنس فکشن کے نمونے بھی اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں، جنہوں نے پاکستانی قارئین کو ایک منفرد ادبی اسلوب فراہم کیا۔ چینی افسانے عموماً "مافوق الفطرت کرداروں اور دیومالائی عناصر پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن ان میں حقیقت نگاری بھی نمایاں ہے۔ چینی سائنس فکشن کے تراجم نے اردو قارئین کو جدید تصورات اور خیالات سے روشناس کرایا۔ ادبی تراجم کے ذریعے مختلف زبانیں بولنے والے افراد کے درمیان مکالمے کو فروغ ملا۔ ان تراجم نے نہ صرف ادبی تعلقات کو مضبوط کیا بلکہ عوامی سطح پر بھی ہم آہنگی کا ماحول پیدا کیا۔

چینی شعری ادب کے تراجم گو کہ مقدار کے اعتبار سے تاحال محدود ہیں، مگر تہذیبی مکالمہ اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے قیام میں اہمیت کے حامل ہیں۔ چینی شاعری کی جمالیاتی خصوصیات اور تہذیبی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اسے اردو تناظر میں پیش کر کے دو تہذیبوں کے حاملین کو ایک مقام پر جمع کیا گیا ہے۔ چینی شاعری دنیا کی قدیم ترین ادبی آثار میں شمار ہوتی ہے، جو تقریباً ۳۰۰۰ سال پر محیط ہے۔ قدیم چینی شاعری میں سماجی اور ذاتی دونوں قسم کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جنگ، امن، محبت، قدرت، اور انسانی تعلقات اس شاعری کے مرکزی موضوعات ہیں۔ چینی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فطرت کے مظاہر کو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ پہاڑ، دریا، آسمان، بارش، اور موسموں کی تبدیلی کو چینی شعرا نے نہایت عمیق انداز میں بیان کیا۔ ان شاعری کے نمونوں میں کنفیوشس کے مرتب کردہ "شیہ جنگ" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جو چینی لوک شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔

کنفیوشس (۴۷۹-۵۵۱ ق م) نے چینی ادب اور شاعری میں تہذیبی اور اخلاقی اصولوں کو شامل کیا۔ ان کی تعلیمات نے چینی ادب کو ایک اخلاقی اور سماجی رہنما کے طور پر تشکیل دیا۔ کنفیوشس کی "شیہ جنگ" نہ صرف شاعری کی ایک کتاب ہے بلکہ یہ چینی معاشرت کے سماجی، سیاسی، اور اخلاقی اصولوں کی بھی

عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب میں ۳۰۵ نظمیں شامل ہیں، جن میں محبت، معاشرتی تعلقات، اور سماجی انصاف جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو میں چینی شاعری کے تراجم کی ابتدا ابن انشا کے ذریعے ہوئی، جنہوں نے ۱۹۶۱ میں "چینی نظمیں" کے عنوان سے چینی شاعری کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ابن انشا کے تراجم میں چینی ادب کی خوبصورتی اور اختصار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے بعد آزاد کوثری، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر صفدر علی شاہ، زاہد امروز، اور علی یاسر نے بھی چینی ادب کے تراجم کیے۔ ان مترجمین نے چینی شاعری کی منفرد خصوصیات، جیسے مختصر اظہار، فطری مناظر، اور انسانی جذبات کی گہرائی کو اردو قارئین کے سامنے پیش کیا۔

چینی شاعری کے نمایاں موضوعات میں فطرت کی عکاسی، محبت، جنگ، امن، وطن سے محبت، دیہی زندگی، اور انسانی رشتے شامل ہیں۔ یہ شاعری اپنے اختصار اور جامعیت کے لیے مشہور ہے۔ چینی شعرا کی نظمیں مختصر اشعار پر مشتمل ہوتی ہیں، جن میں فطرت اور انسانی جذبات کی گہرائی کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ چینی شاعری کی ایک اہم خصوصیت اس کا فلسفیانہ اور جمالیاتی پہلو ہے۔ یہ شاعری فطری مناظر کو ایک ایسے انداز میں پیش کرتی ہے جو قارئین کو گہرے غور و فکر پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس میں زمین، آسمان، دریا، اور پہاڑوں کی خوبصورتی کو انسانی جذبات کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔

چینی اور اردو شاعری میں کئی مماثلتیں اور چند افتراقات بھی ہیں۔ چینی شاعری میں فطرت کی عکاسی اور مختصر اظہار کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جبکہ اردو شاعری میں جذبات کی شدت اور فلسفیانہ گہرائی زیادہ نمایاں ہے۔ چینی شاعری میں فطرت کی جمالیات کو اجاگر کیا جاتا ہے، جبکہ اردو شاعری میں انسانی جذبات اور تصوف یا مابعد الطبعیاتی موضوعات پر زور دیا جاتا ہے۔ چینی شاعری کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی حرمت کا بڑی شد و مد سے بیان کیا گیا ہے۔ انسانی معاشرے کی ترقی اور ارتقاء کے لیے امن کا قیام بنیادی شرط ہے۔ چینی شاعروں نے بے مقصد جنگوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ نااہل بادشاہوں کی بداعمالیوں کو اجاگر کر کے انسانوں کو حقائق سے روشناس کروانے کی زبردست کوشش کی گئی ہے۔ نام ور چینی شاعر چھویوآن کو آج بھی چینی قوم دل و جان سے یاد کرتی ہے اور چینی تقویم کے پانچویں مہینے کی پانچ تاریخ کو اس کی یاد میں ایک قومی تہوار منایا جاتا ہے۔ ڈریگن بوٹ فیسٹول کا تہوار چھویوآن کی جانب سے اپنی قوم کے لیے

دی گئی قربانی کی یاد گار ہے۔ اردو میں چینی شاعری کے تراجم نے دونوں زبانوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا ہے۔ ان تراجم نے چینی ادب کی سادگی اور اختصار کو اجاگر کیا۔ انسانی جذبات اور سماجی مسائل کو خوب صورتی سے بیان کرتے ہوئے چینی تہذیب کی جمالیات اور فطری مناظر کو اردو قارئین تک پہنچایا ہے۔

چینی شاعری نہ صرف چینی ثقافت کا عکاس ہے بلکہ یہ انسانیت کے مشترکہ جذبات اور تجربات کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اردو تراجم نے ان جذبات اور تجربات کو ایک نئی جہت دی ہے، جس سے دونوں تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی اور قربت پیدا ہوئی ہے۔ چینی شاعری کی بدولت سادگی، اختصار، اور فطری مناظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان تراجم نے ادب کے ذریعے تہذیبی مکالمے کو فروغ دیا ہے، جو دونوں قوموں کے درمیان ثقافتی پل کا کردار ادا کرتا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج

زیرِ نظر تحقیق سے درج ذیل تحقیقی نتائج بر آمد ہوئے:-

۱- چینی ادب کے اردو تراجم پاک چین دوستی کو مہمیز دینے، تہذیبوں کے مابین مکالمے کو ممکن بنانے اور بین الثقافتی ہم آہنگی کے قیام میں کلیدی کردار کے حامل ہیں۔

۲- چینی تاریخ اور چینی ادب میں حیران کن امتزاج کے شواہد ملے ہیں، جن کے باعث چینی سماج کی درست تفہیم کے لیے چینی ادبی تراجم کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

۳- چینی نثری ادب کے تراجم متنوع خصوصیات کا حامل ہے، جس میں دیومالا، اساطیر، مشرقی اقدار کی عکاسی، زرعی طرزِ معاشرت کی گہری چھاپ، جاگیر داری نظام اور خاص طور پر نو آبادیاتی توسیع پسندی سے اجتناب نمایاں ہیں۔ چینی لوک ادب سرزمینِ چین کی مختلف قومیتوں کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا آئینہ دار ہے۔ چینی ناول "تین سلطنتوں کی داستان" سرزمینِ چین کی آزادی اور خود مختاری کے جذبے کا عکاس ہے۔ چینی افسانہ رجعت پسندی کا سخت ناقد اور حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ جب کہ چینی سائنس فکشن غیر حقیقی ہونے کے باوجود انسان کی سماجی زندگی کے پیش آمدہ مسائل سے روشناس کراتا ہے۔

۴- چینی شعری ادب کے تراجم اختصار، جامعیت، احساساتی اظہار اور سماجی صورت حال کے ترجمان ہیں۔ اس کے نمایاں موضوعات میں امن سے بے پناہ محبت، جنگ سے نفرت، فطرت سے والہانہ وابستگی، انسانی رشتوں

کا احترام اور وسیع سماجی مطالعے کی بے باک ترجمانی شامل ہیں۔ ابنِ انشاء کی مترجمہ چینی نظمیں مختصر اور احساساتی اظہار کی حامل ہیں۔ یوان وے شوئے کے ہاں بین الثقافتی ہم آہنگی کے اثرات ملتے ہیں۔ انتخاب عالم (پروفیسر چانگ شی شوان) کی نظمیں عصری سوچ کی عکاس ہیں۔ ڈاکٹر صفدر علی شاہ کی مترجمہ نظمیں چینی عسکری تاریخ کی ترجمان ہیں، جن میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چھویو آن کی نظم "لی ساؤ" سماجی صورت حال کی نمائندہ ہے جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہے۔

۵۔ چینی اور اردو شاعری کے موازنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ چینی شاعری میں فطرت کی عکاسی اور مختصر اظہار کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جبکہ اردو شاعری میں جذبات کی شدت اور فلسفیانہ گہرائی زیادہ نمایاں ہے۔ چینی شاعری میں فطرت کی جمالیات کو اجاگر کیا جاتا ہے، جبکہ اردو شاعری میں انسانی جذبات اور تصوف یا مابعد الطبعیاتی موضوعات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ چینی شاعری باطن کے بجائے خارج کی شاعری ہے۔ جو کائنات کے حسن اور جمالیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر چینی ادب روایت اور جدت کا امتزاج نظر آتا ہے۔

۶-مادرِ علمی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، نمل کے مختلف شعبہ جات سے وابستہ اساتذہ، سکالرز اور فضلا کا حوصلہ افزاء کردار چینی ادبی تراجم اور متفرق موضوعات پر تحقیقی کتب و مقالاجات کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ یہ امر اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس جامعہ کے اربابِ علم و دانش علمی محاذ پر تحقیق اور مکالمے کی روایت کو آگے بڑھانے میں قومی اور بین الاقوامی تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ متحرک بھی ہیں۔

ج-سفارشات

۱۔ چینی ادبی تراجم پر تحقیق کی روایت کو مزید مستحکم اور توانا کرتے ہوئے مکالمے کی روایت کا آگے بڑھایا جائے۔

۲۔ جامعات میں ادبِ عالیہ کی تدریس میں چین ادبی تراجم کو شاملِ نصاب کیا جائے تاکہ چینی ادب سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

۳۔ پاک چین دوستی میں مزید گرم جوشی پیدا کرنے کے لیے اردو اور چینی زبانوں کے مابین اشتراک کی مزید نوعیتوں کو دریافت کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔

۴۔ چینی اور اردو زبان کے ادبی مشاہیر کی تخلیقات پر صنف وار تحقیقی و تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ گندھارا اور ہند اسلامی تہذیب کے مابین تاریخی روابط کے تناظر میں ادبی متون کے اثرات کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے۔

۶۔ پاک چین دوستی کے لازوال رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے اردو اور چینی زبان کے اشتراکات پر تحقیق کی سرپرستی کی جانی چاہیے۔

۷۔ چینی ادب کے مزید تراجم کو ممکن بنایا جائے۔ ناپید اور کمیاب تراجم کے نئے ایڈیشن شائع کیے جائیں۔ مزید برآں براہِ راست چینی زبان سے اردو میں تراجم کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۸۔ چینی سماج اور چینی تاریخی مشاہیر کے بارے میں اردو زبان میں معیاری کتب کی اشاعت کی سفارش کی جاتی ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

- ابن انشاء، چینی نظمیں، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۰ء،
- احفاظ الرحمن، سورج نکل رہا ہے، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء
- انتخاب عالم، گلبانگِ وفا، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
- چین کا ادب، (قدیم وجدید فکشن سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
- حامد ہاشمی، شہنشاہ سے شہری تک، چین کے آخری شہنشاہ کی آپ بیتی، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر، پیچنگ، عوامی جمہوریہ چین، ۱۹۸۰ء
- شفیع عقیل، چینی لوک کہانیاں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۷ء
- صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، ۱۰۱ چینی نظمیں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۴ء
- عابد سیال، چین میں سائنس فکشن، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸ء
- عابد سیال، غم کے محاذ پر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء
- لو گوان چھونگ، تین سلطنتوں کی داستان، مترجم ظہور احمد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء
- منیر فیاض، معاصر چینی افسانے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء
- نصریٰ فاطمہ، آج چاند روشن ہے، لوشون کی کہانیاں، آئی شو پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء
- یاسر جواد، فاہیان کا سفر نامہِ ہند، تخلیقات لاہور ۲۰۲۲ء
- یاسر جواد، ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند، تخلیقات لاہور، ۲۰۲۲ء
- یوان وے شوے، نظمیں، خطاطی اور محبت۔ پاکستان کے لئے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

ثانوی ماخذ

- احفاظ الرحمن، ایک کتاب میں تین کہانیاں، فرید پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء
- احفاظ الرحمن، ایک وارڈن کی ڈائری، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء

- اسرائیل اپسٹین، جنگِ افیون سے آزادی تک، مترجم: رشید بٹ، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر، پیچنگ، ۱۹۸۴ء
- اعجاز احمد فاروقی، شب تاب موتی (چینی لوک کہانیاں)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء
- انعام ندیم، دریائے ہولن کی کہانیاں، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۴ء
- ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، مترجم محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
- ایس ایم حالی، چین کی کامیابیوں کی کہانی، رومی اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۵ء
- ایس ایم حالی، چینی ثقافت کے تابندہ نقوش، رومی اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
- ایس ایم حالی، چینی کمیونسٹ پارٹی کے سو سال، رومی اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۲۱ء
- آدم پال، CPEC ترقی یا سراب؟، لال سلام پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
- آزاد کوثری، جنگلی گھاس، نگارشات پبلشرز لاہور، ۱۹۸۷ء
- تابش ہاشمی، چین کے مسلمان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء
- جاوید شاہین، تعلیماتِ ماؤزے تنگ، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۹ء
- چو چائی، ون برگ چائی، چین کا بدلتا سماج، مترجمین محمد سلیم خاں، گوپال متل، محمد سلیمان صابر، نیشنل اکاڈمی، دہلی، ۱۹۶۶ء
- حافظ لیاقت علی ضیاء، مذاہبِ عالم اور امن، ریڈرز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
- خالد عباس الاسدی، پاک چین دوستی (قطعات)، کاغذی پیراہن، لاہور، ۲۰۱۱ء
- خہ مئے لین، چین پاکستان ثقافتی تبادلوں کی تاریخ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء
- راجہ انور، ہمالہ کے اُس پار، کلاسیک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
- رشید بٹ، مینڈک گھڑ سوار (بہترین چینی لوک کہانیاں)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
- رشید بٹ، چین کی بہترین قدیم حکایتیں، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۹ء
- رشید بٹ، سازِ زندگی، چین کا جدید ادب، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر پیچنگ، ۱۹۸۲ء
- رشید بٹ، سورج کی تلاش (منتخب چینی لوک کہانیاں)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
- رشید بٹ، مغربی جھیل کی لوک کہانیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
- ژانگ زیان لیانگ، ادھورے مرد، مترجم انور غالب، مشعل لاہور، ۱۹۸۶ء

- سلمٰی اعوان، حیرت بھری آنکھ میں چین، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۳ء
- سید اشتیاق الحسن، ناگ راج کی بیٹی، تھانگ عہد کی دس کہانیاں، غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر بیجنگ، عوامی جمہوریہ چین، ۱۹۸۶ء
- سید جاوید اختر، دوستی کی شاہراہ پر، کلاسیک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
- سید صباح الدین عبد الرحمن، اسلام میں مذہبی رواداری دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۰ء
- سید فراست شاہ، مشرق کو ذرا دیکھ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء
- سید محمد خاتمی، دنیائے شہر تا شہر دنیا، مرکز تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء
- شاہد حسین رزاقی، ڈاکٹر، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
- شیاؤ ہونگ، دریائے ہولنگ کی کہانیاں، (ناول) مترجم: انعام ندیم، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۴ء
- شفیق عجمی، ڈاکٹر، تہذیبوں کے درمیان مکالمہ (ترجمے کا کردار)، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۸ء
- شمیم اکرام الحق، داور قبیلے کے قصے، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
- شی چن پنگ، چین کا طرزِ حکمرانی، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
- صفدر علی شاہ، ڈاکٹر، فنِ حرب وضرب، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء
- عابد علی خان، مشاہیر چین، فیکٹ پبلی کیشنز، لاہور، ن د
- عابد میر، جنگی حکمتِ عملی اور اُس کا تحقیقی جائزہ، گوشۂ ادب، کوئٹہ، ۲۰۱۱ء
- عائشہ عالم، ہمالیہ کے سائے تلے، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء،
- عبدالواحد تونسوی / طاہر نعیم ملک، ڈاکٹر، چین از چیئر مین ماؤ تا غربت مکاؤ، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۲۳ء
- عبدالواحد تونسوی، ڈاکٹر، چانگ وے، پروفیسر، چین شناسی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۰۲۲ء
- علی عباس جلال پوری، روایاتِ تمدن قدیم، تخلیقات، لاہور، ۲۰۲۴ء
- لوشون، پاگل آدمی کی ڈائری، مترجم خالد فتح محمد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء
- لوشیون، ایہہ کیو کی سچی کہانی، مترجم رشید بٹ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

- مائی جیا، افشائے راز، مترجم محمد عاصم بٹ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۲ء
- محمد احسن بٹ، تہذیبوں کا تصادم، نگارشات پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۲۲ء
- محمد اسلم جنجوعہ، چین پُرامن تعمیر و ترقی کی نئی شاہراہیں، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۱ء
- محمد امین، ڈاکٹر، کنفیوشس اور چین کی ثقافت، ایک تعارف، بکس اینڈ ریڈرز، ملتان، ۲۰۲۱ء
- مختار صدیقی / لین یو تانگ، جینے کی اہمیت، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء
- مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، فنِ ترجمہ نگاری، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء
- ملک اشفاق، قدیم دور کی عظیم فلسفی خواتین، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
- یوان ینگ / چومنگ، سفر دوستی کا، پاکستان - چینی ادیبوں کی نظر میں، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء
- یونس خان، سنگی کتابیں، کاغذی پیراہن، ہاؤس لاہور، ۲۰۲۰ء

رسائل و جرائد

- ادبیات، بین الاقوامی ادب نمبر ۴، شمارہ ۴۱-۴۲، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
- امتزاج، یونیورسٹی آف کراچی، پاکستان، شمارہ ۱۸، دسمبر ۲۰۲۲ء
- اخبارِ اردو، (ماہنامہ) شمارہ ۵، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، مئی ۲۰۲۲ء
- آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی، شمارہ ۱۰ جلد ۴۹، مئی ۱۹۹۱ء
- بازیافت، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ ۲۹، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء،
- پیامی، یونیسکو، کراچی، جنوری ۱۹۸۹ء
- پیغام آشنا، ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد شمارہ ۹-۱۰، ستمبر ۲۰۰۲ء
- دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، شمارہ ۱۵، ۲۰۲۳ء،
- سنگِ میل، (ماہنامہ)، انٹرنیشنل فوک لور جرنل، شمارہ ۱، پشاور، ستمبر ۱۹۷۳ء
- مژگاں، (سہ ماہی) کلکتہ، جلد ۶، شمارہ ۲۱-۲۲

ویب گاہیں

- https://adbimiras.com/hindustan-yunani-aur-chini-safarnamo-ki-raushni-mein-prof-khalid-mahmood/

  07 June, 2023 08:23 AM

- Mohamad Zain, Dialogue among Civilazations, International Journal of Publication and Social Studies, Vol 2 No 1, 2017 page 34ص
- https://en.wikipedia.org/16 Nov, 2023 10:00 PM